ہر روز جان ہتھیلی پر رکھ کر سفر کرنے والے جنوبی مسافر

دلچسپ و عجیب

اُردو ڈائجسٹ

نیا انداز

ستمبر
2012

/urdudigest.pk

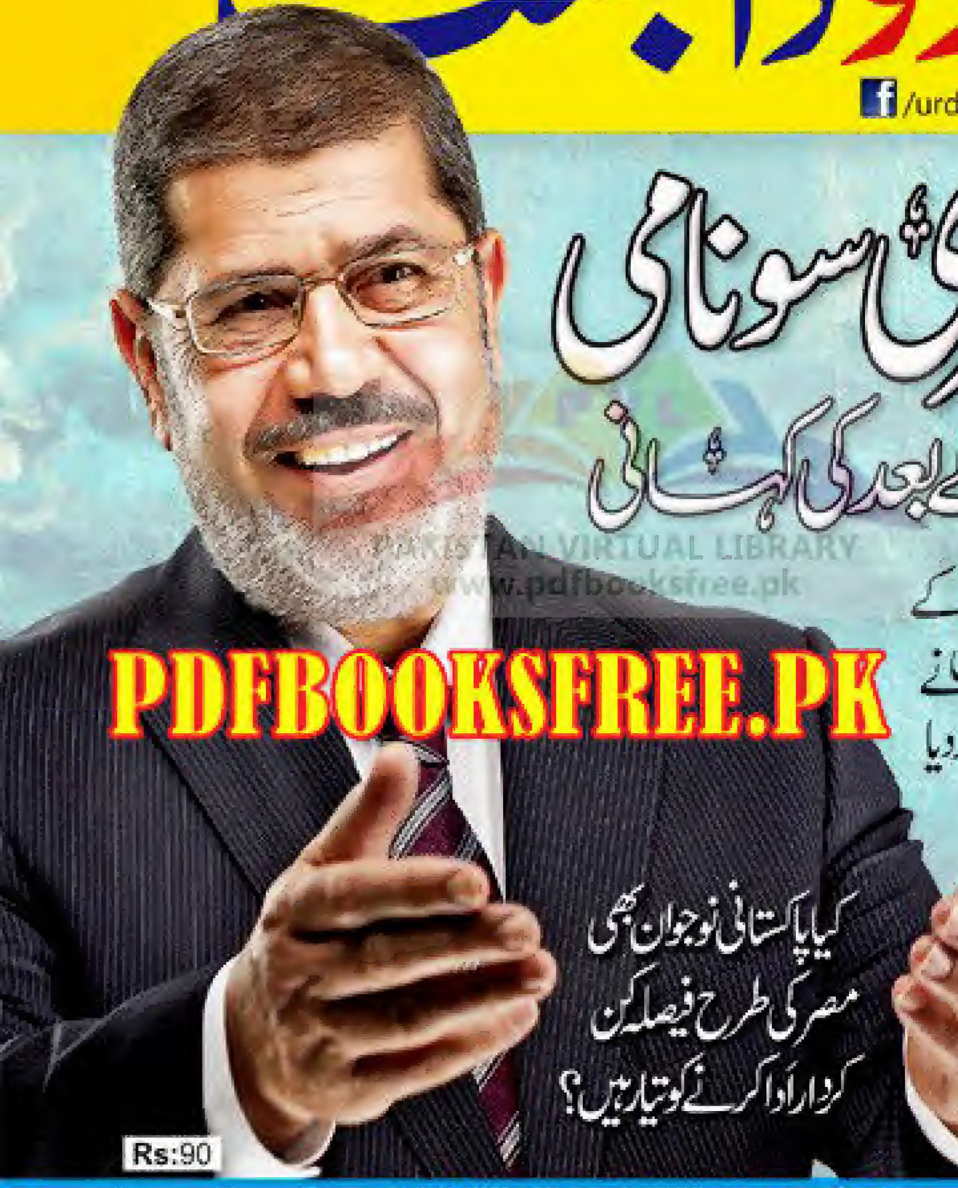

مِصری سونامی کے بعد کی کہانی

پُرعزم محمد مرسی کے طوفانی فیصلوں نے دُنیا کو حیران کر دیا

کیا پاکستانی نوجوان بھی مصر کی طرح فیصلہ کن کردار ادا کرنے کو تیار ہیں؟

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
PDFBOOKSFREE.PK

Rs:90

زندگی میں کامیابی کیسے ممکن ہے؟

مستقبل دکھانے والی 10 سائنسی فلمیں

صحت مند رہنے کے 20 طریقے

ہمدرد
رمضان کریم
سب سے میٹھا صبر ہے
رب کی بارگاہ میں
اس کا اتنا شکر ہو تو
اور کیا چاہیئے
روح افزا
Brands of the year Award 2011
Pakistan Standards
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

LAHORE
LEADS UNIVERSITY

ADMISSIONS OPEN FALL 2012
Morning, Evening & Weekend

Undergraduate Programs
- BBA
- BBA Banking and Finance
- BS in Mass Communication
- BSCS
- BSIT
- B.Com
- BS Accounting & Finance
- BS Mathematics
- BS Economics
- BS Islamic Studies
- BS English
- BS Education

Engineering Faculty

Engineering programs are approved by PEC through zero visit vide letter no. PEC/EAB/DEC/ UC-LEADS (Zero) CL- 61/2011 Dated 14-7-2011

- BSc Civil Engineering
- BSc Electrical Engineering
- BS Tech Civil Technology
- BS Tech Electrical Technology
- BS Tech Electronics Technology
- BS Tech Mechanical Technology

Special Scholarships for BS Tech Applicants

Master Programs
- MBA (Professional)
- MBA(Executive)
- MBA Banking & Finance
- MBA Banking and Finance
- M.Sc Accounting and Finance
- M.Sc in Mass Communication
- MCS
- MIT
- M.Com
- M.Sc in Mathematics
- M.Sc in Economics
- M.A in Islamic Studies
- MA English In Linguistics
- MA English In Literature
- Master In Education

MS/M.Phil Programs
- MS/M.Phil Management Sciences
- MS/M.Phil Finance
- MS/M.Phil Islamic Banking
- MS/M.Phil Mass Comm.
- MSCS/M.Phil Computer Sciences
- MS IT/M.Phil Information Technology
- MS/M.Phil Commerce
- MS/M.Phil Mathematics
- MS/M.Phil Economics
- MS/M.Phil Islamic Studies
- MS/M.Phil Linguistics
- MS/M.Phil English Literature
- MS/M.Phil Education

Salient Features
- Innovative Programs
- Industry Focused Research
- Exemplary Leadership
- Highly Qualified Faculty
- 120-Kanal Purpose built Campus
- Affordable Fee Structure
- Need Based Scholarships and Financial Assistance

Recognized by HEC

CHARTERED by Govt. of the Punjab

Approved by: Pakistan Engineering Council

Engineering College
240 West Wood Colony,
Thokar Niaz Baig, Lahore
Tel:042-37498201
0331-4913131, 0341-4483911

City Campus & Admission Office
5-Tipu Block, New Garden Town, Near Kalma Chowk, Lahore.
Ph: 042-35843205-7, 36162547 **Cell: 0321-6666954, 0333-6386454**
Web: www.leads.edu.pk Email: admission@leads.edu.pk

FOR ULTIMATE WHITENESS
DEEP CLEANING & EXTRA WHITENING FORMULA
Soda White
BAKING SODA TOOTHPASTE
TARTAR CONTROL
With Flouride
Fights Plaque
Fresh Mint Taste
Quality BRUSH Pack
اس میں شامل کھانے کا سوڈا جو میل کی سخت تہہ
کو پھلا کر نرمی سے ہٹائے، پیلا پن دُور کرے اور چمکدار سفیدی لائے
BAKING SODA
Top Seal
100% Germs Free

ISO 9001:2008
Invite Happiness
TOYO®
HOME APPLIANCES
Invite Happiness
Brands Award
UAN: +92-55-111-805-805, www.toyoplastic.com.pk

بنا سپتی
نعمت
وٹا من اے اور ڈی سے بھر پور
واقعی ایک نعمت ہے
Nemat@xpert.net.pk
www.salva.com.pk
ISO 9001-2000 CERTIFIED
Pakistan Standards

CHATKHAAR
Gourmet creations for your table
Shahi Chutney
330gm.
Mint Chutney
260gm.
Imli Chutney
330gm.
The world on your table
Chutneys - Pickles - Sauces
www.chatkhaar.com
www.facebook.com/chatkhaar

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

مال کی محبت

جو مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہےO اور خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گاO نہیں وہ اس روندنے والی میں پھینکا جائے گاO اور تم کیا سمجھے وہ روندنے والی کیا ہےO وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی (جہنم) کی آگ ہےO

(سورۃ الھمزۃ ۱۰۴: ۲-۶)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دوO جس دن اسے جہنم کی آگ میں دہکایا جائے گا پھر اس سے ان کے ماتھے اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس جمع کرنے کا مزا چکھوO

(سورۃ توبہ ۹: ۳۴-۳۵)

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رسول کا فرمان

اصل دولت مندی دل کی بے نیازی ہے

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا ’’امیری ساز و سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ حقیقی امیری اور دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔‘‘

(بخاری کتاب ۸۱۔ باب ۱۵: مسلم کتاب الذکاۃ۔ باب ۴۰)

قسم کھاتے وقت اِن شاء اللہ کہیں

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا ’’حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک معاملہ میں کسی بات کا دعویٰ کرتے ہوئے ان شاء اللہ نہیں کہا تھا۔ چنانچہ وہ بات پوری نہ ہوئی۔ اگر وہ ان شاء اللہ کہہ لیتے تو وہ بات پوری ہو جاتی۔‘‘ (امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث پاک سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ مسلمان جب کسی کام کے کرنے کی بات کرے تو ان شاء اللہ ضرور کہے، دوسرے اگر قسم کے ساتھ ان شاء اللہ کہہ لیا جائے تو ناکامی کی صورت میں بھی قسم نہ ٹوٹے گی۔

(بخاری کتاب ۶۰۔ باب ۴۰: مسلم کتاب الایمان۔ باب ۵)

اُردُو ڈائجسٹ

ستمبر ۲۰۱۲ء شوال المکرم ۱۴۳۳ھ جلد نمبر ۵۲ شمارہ ۹

www.urdudigest.pk

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

مدیر اختر عباس editor@urdu-digest.com
مجلس تحریر حافظ فروغ حسن ، سید عاصم محمود ، صغیرہ بانو شیریں
نوید اسلام صدیقی ، سلمیٰ اعوان ، اظہر بن مظہر
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی انچارج کمپوزنگ افنان کامران قریشی
ڈیزائنر عبدالوہاب پروف ریڈر کلیم اللہ فاروقی
سب ایڈیٹر ویب عاطف مرزا

www.facebook.com/urdudigest.pk

مارکیٹنگ/اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0322-7474010
لاہور ندیم حامد 0300-4242620
گجرات/گوجرانوالہ احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے

subscription@urdu-digest.com فون: 37589957-42-92+

پاکستان عام ڈاک 600 روپے ، رجسٹرڈ 750 روپے
بیرون ملک انگلینڈ، برِ اعظم ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا 50 $

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس (خط و کتابت کے لیے)

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: 35290738-42-92+ فیکس: 35290731-42-92+

قیمت: 90 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جمالت پریس 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر 21-19 ایکڑ سکیم سمن آباد لاہور سے شائع کیا

مینیجنگ ایڈیٹر نوٹ

سما ٹی وی پر سید وسی شاہ کے پروگرام میں قاسم اپنے شب و روز کے معمولات بتا رہا تھا۔ یکم جولائی ۲۰۱۰ء داتا دربار پر ہونے والے خودکش بم دھماکے میں اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ وہ ایک خوبرو جوان تھا اور سافٹ ویئر کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ جوان بیٹے کی بینائی جانے پر غم سے نڈھال تھے۔ قاسم آج بھی اپنی عقیدت کا اظہار کرنے داتا صاحب جاتا اور وہاں نعتیں پڑھتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اب اس کو کسی آنکھوں والے کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آج صبح جب میں امرتسر جانے کے لیے واہگہ بارڈر پہنچا تو کئی پاکستانی ہندو بھارت جانے کے لیے امیگریشن آفس کے باہر کئی گھنٹوں سے بیٹھے تھے اور امیگریشن کا سٹاف اوپر سے احکامات اور منظوری کا منتظر تھا۔ خبروں کے مطابق اندرونِ سندھ سے ہندو اقلیت حالات سے دل برداشتہ ہو کر بھارت نقل مکانی کر رہی ہے۔ جس پر ہمارے وزیر داخلہ صاحب نے نوٹس لے لیا اور سرحد پر موجود ہندوؤں کو ویزا ہونے کے باوجود بھارت جانے سے روک دیا۔ بظاہر یہ لوگ بھارت جانے کی وجہ سیر و تفریح اور اپنے مذہبی مقامات پر رسومات کو ادا کرنا بتا رہے تھے لیکن ان کے سامان میں موجود ٹوٹی پھوٹی سلائی مشینیں اور برتن وغیرہ اس کے برعکس گواہی دے رہے تھے۔ بھلا کوئی مسافر سیر و تفریح کے لیے ایسا سامان بھی ساتھ لے کر جاتا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر ان کو الوداع کرنے والے ایک شخص نے بتایا کہ ان لوگوں کے ساتھ سندھ میں بہت ظلم کیا جا رہا ہے اور یہ مجبور ہو کر اپنا وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

آج ایم کیو ایم کے فاروق ستار ایک سیمینار میں کہہ رہے تھے کہ ''ہر ماہ ۶۰ کے قریب ہندو بھائیوں کے خاندان بھتہ مافیا کی وجہ سے بھارت منتقل ہو رہے ہیں۔''

مجھے اور میرے ساتھی کو امیگریشن حکام نے فوری طور پر کلیئر کر دیا۔ اسی سہ پہر جب ہماری گاڑی امرتسر سے واپس اٹاری آنے کے لیے سڑک پر تیزی سے رواں دواں تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے بزرگ بھی اسی راستے سے ہجرت کر کے نجانے کتنی آرزوئیں اور امیدیں لے کر لاہور

آئے ہوں گے؟ انھوں نے کتنی قربانیاں دی ہوں گی؟ کیا ہم نے یہ وطن اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی اقلیتوں کو تحفظ بھی نہ دے سکیں گے؟ ایسی صورت حال میں ہم برما، فلسطین، بھارت اور دنیا کے دیگر ممالک میں آباد مسلمان اقلیت پر ہونے والے مظالم کے خلاف کیسے آواز بلند کر سکتے ہیں؟

لیکن پھر جب لاہور واپس گھر پہنچا تو ٹی وی پر قاسم کی روداد سن کر اپنی مجبوری اور پاکستان کے حالات پر رونا آیا۔ رمضان کے مبارک مہینا میں یہ ملک وجود میں آیا اور آج رمضان ہی میں ہم اس حال کو پہنچ چکے ہیں کہ نہ یہاں مسلمان محفوظ ہیں اور نہ ہی اقلیتیں، نہ کاروباری طبقہ اور نہ ہی مساجد اور صوفیاء کرام کے مزارات، نہ بجلی ہے اور نہ گیس۔ صنعتیں بند ہو رہی ہیں اور ٹی وی پر ہمارے سیاستدان ایک دوسرے پر گند اچھال رہے ہیں۔ انھیں کسی بھی طرح اس وطن کی عزت اور وقار کا خیال نہیں۔

ان حالات میں ہم ان ظلم کے مارے ہندوؤں کو کس منہ سے بھارت جانے سے روک سکتے ہیں؟ ہمیں ٹی وی پر اس حوالے سے شور مچانے اور ڈراما کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ رحمان ملک صاحب اگر کسی کو تحفظ نہیں دے سکتے تو پھر کم از کم خاموش ہی رہیں۔ ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت اپنے ہی صوبے میں اقلیتوں کا تحفظ کرنے میں کیوں ناکام ہو چکی ہے؟

★ ★

ضلع ٹیاری سندھ سے کرامت راو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ لاہور سے چلنے والا سونامی ان تک کب پہنچے گا اور ایسا ہوگا بھی یا نہیں......؟

تبدیلی کی اسی تڑپ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس ماہ مصر میں آنے والی سیاسی سونامی پر، جس میں مصری نوجوانوں نے بھرپور کردار ادا کیا ہے، ٹائٹل سٹوری شائع کر رہے ہیں جسے ہماری ٹیم نے بڑی محنت اور ریسرچ سے تیار کیا ہے۔ اس سٹوری کا آج کے پاکستانی نوجوان کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے کیونکہ وطن عزیز جلد ہی الیکشن کے مرحلے سے گزرنے والا ہے اور ہمارے نوجوانوں میں بھی مصر کی طرح حالات تبدیل کرنے کی شدید خواہش موجود ہے۔

★ ★

اردو ڈائجسٹ کا معیار بہتر بنانے کے لیے اس کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ امید ہے کہ آپ کا تعاون ہمیشہ کی طرح ہمیں حاصل رہے گا۔

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے اور لطف اٹھائیے

فہرست

مِصری سونامی کے بعد کی کہانی

پُرعزم مصری صدر

محمد مُرسی کے ۱۰۰ دن

جن کے طوفانی فیصلوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجزیہ نگاروں کو ہلا کر رکھ دیا

26

کور سٹوری

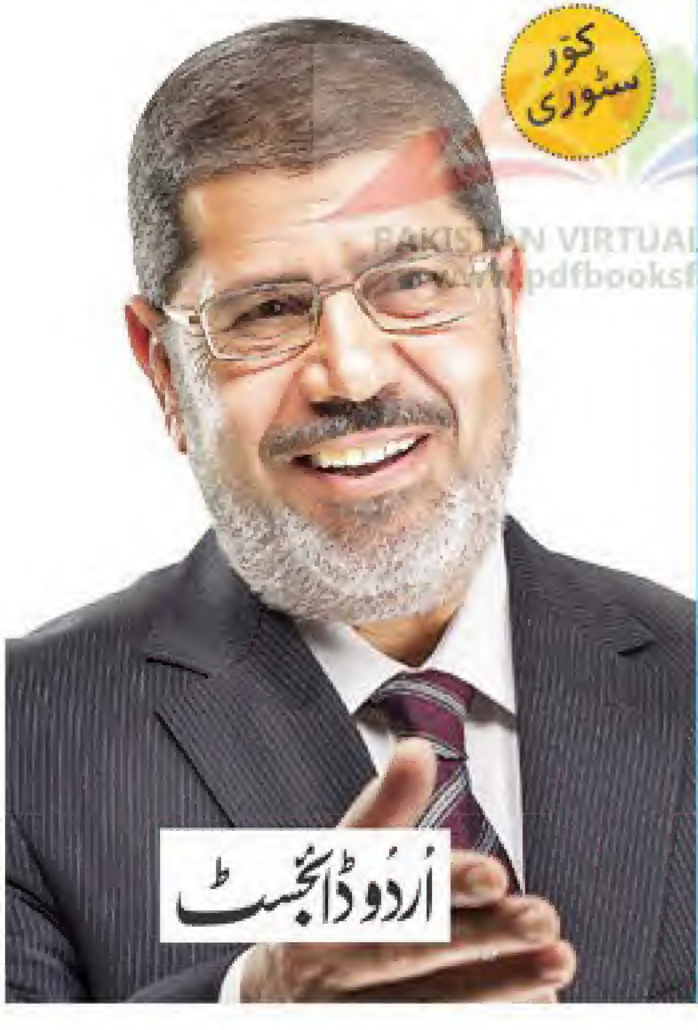

اردو ڈائجسٹ

فہرست

ستمبر 2012

سرِ ورق پر

139

صحت مند رہنے کے ۲۰ طریقے

زندگی کو توانا بنائیں

عاصم محمود

مستقبل دکھانے والی

10

سائنسی فلمیں

135

سائنسی تصورات جو حقیقت کا روپ دھار گئے

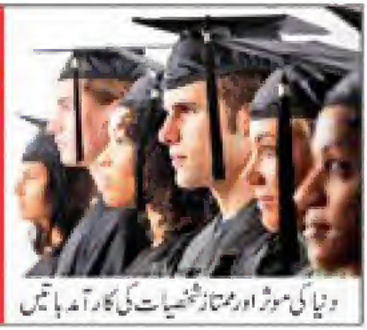

عملی زندگی میں

کامیاب بنیئے

65

دنیا کی موثر اور ممتاز شخصیات کی کارآمد باتیں

دُنیا کے جنونی مُسافر

ان مسافروں کا تذکرہ جو جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں

دلچسپ و عجیب

ذیشان سلیم

241

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اُردو ڈائجسٹ

15	کچھ اپنی زبان میں	الطاف حسن قریشی
16	ہم کہاں کھڑے ہیں	الطاف حسن قریشی
79	قائداعظمؒ سے آخری ملاقات	نواب مشتاق احمد
89	کامیاب اور مثالی زندگی	محمد شبیر عادل
101	باتیں دانش کی	رفیدہ کلیم فاروقی
113	۱۱ر ستمبر ۱۱ر پہلو (9/11) کے بعد	داؤد رفیصل
121	ہم کسی سے کم نہیں	تحریم رضا صدیقی
126	لندن اولمپکس سے خالی ہاتھ واپسی	کلیم اللہ فاروقی
155	سید مودودیؒ کا تعلیمی ادارہ ترجمان القرآن	نویدا اسلام صدیقی
247	میراتھن دوڑنے والا ۱۰۱ سالہ بابا	شمیم اختر
250	بانس...... مستقبل کا سپر میٹریل	عالیہ سعید
262	اوئے اتوجن آیا ایں	وصی شاہ
265	مشورہ حاضر ہے	صغیرہ بانو شیریں
268	مطالعے کی میز پر	نویدا اسلام صدیقی
273	وزن کم کریں صحت نہیں	نوشین ناز
278	قصہ کوتہ	ادارہ
280	چمن خیال	قارئین کے مشورے، شکایات
284	درِ دل پہ دستک	اختر عباس

اسلامی زندگی کی کہکشاں

حضرت حمزہؓ کا دلگداز تذکرہ 49

حضرت علیؓ کی قیمتی وصیت 58

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

فہرست

ستمبر 2012

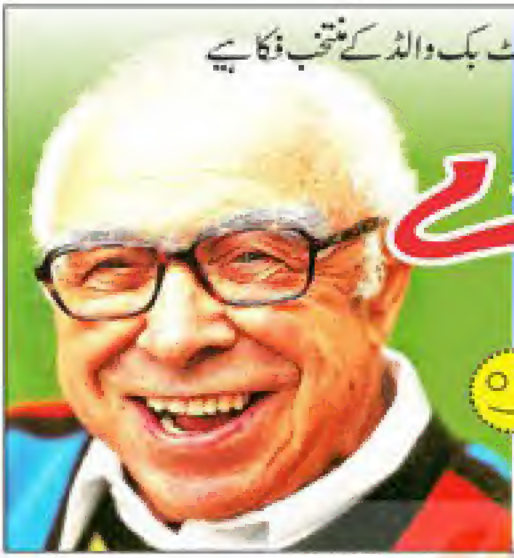

149 قلم پارے

مشہور سخن پرواز آرٹ بک والڈ کے منتخب فکاہیے

روزانہ دنیا کے ۰۰۰ اخبارات کے
قارئین ان کے تیر و نشتر کی زد پر رہتے تھے

103 کرنل محمد خاں

عظیم مزاح نگار کا تذکرۂ دلبہار

129 ریٹائرمنٹ کی بابونگری

باعزت طریقے سے زندگی گزارنے میں کئی مشکل مقام آتے ہیں

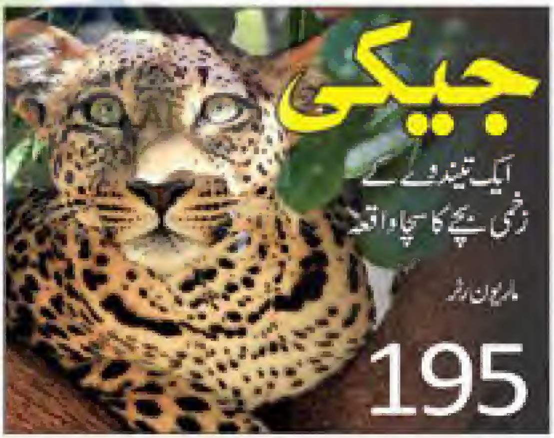

195 جیکی

ایک تیندوے کے زخمی بچے کا سچا واقعہ

ماریون رٹر

252 فیس بُک کا مُحافظ

رخسانہ فضل

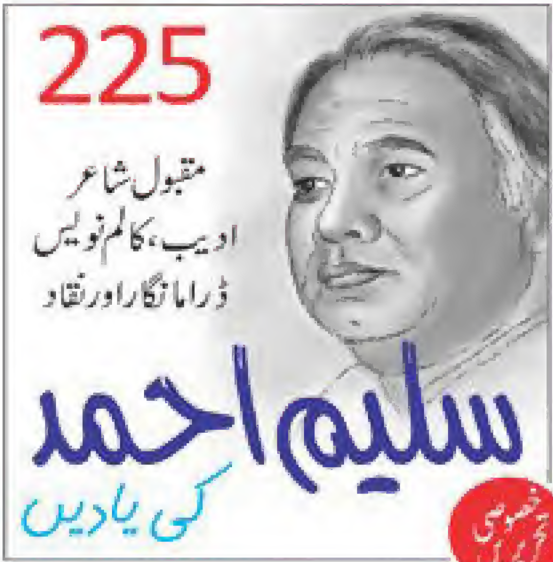

225 سلیم احمد کی یادیں

مقبول شاعر
ادیب، کالم نویس
ڈراما نگار اور نقاد

خصوصی تحریریں

161	ٹیسیں	رضوانہ سید علی
167	لیاری کی ماں	افشاں نوید
173	پوش کالونی	ظفر حبیب
179	فینسی ہیئر کٹنگ	غلام عباس
187	بددعا	محمد اکرم چغتائی
199	او! غزا کے بچو......	سلمیٰ اعوان
209	مخمل کے پیچھے	جارج لینگ لان
220	راج دُلارا	نذیر انبالوی

SINCE 1979
سنڈپ
قدرتاً بہتر
نورس
SUNDIP
MIXED
Pickle in Oil
SUNDIP
MANGO
squash
SUNDIP
ORANGE Marmalade
SUNDIP
Green
CHILLI
Sauce
ORIGINAL
HOT
SPICY
SUNDIP
TOMATO
Ketchup
NEW
THICK
TASTY
PREMIUM QUALITY
www.naurus-sundip.com
Pakistan Standards

28 Years
PRESTON
UNIVERSITY
The leader and pace-setter in higher education!
"Serving the nation for over 28 Years"
— Executive Programs —
EMBA/EMS
MBA (Evening)
— Regular Programs —
BBA/BS-IT
MBA/MS-IT
M.Sc
Psychology, Economics, International Relations, Education, Maths, Telecom, Electronics
B.Ed/M.Ed
MA/MS (Education)
M.Phil/PhD
Psychology, Mathematics, Management, Economics, Education, Computer Science
UAN:111-707-808
www.preston.edu.pk
ISLAMABAD (92-51) 4430597-8
KOHAT (92-922) 516511-3
PESHAWAR (92-91) 5845540-2
LAHORE (92-42) 35913234-5
KARACHI (92-21) 34534683-4

کچھ اپنی زبان میں

سپہ سالار کا ایک فکر انگیز خطاب

گہرائی

کے ساتھ غور و فکر کرنے والے فوج کے سربراہ جنرل کیانی نے شبِ آزادی کے موقع پر کاکول اکیڈیمی میں کیڈٹوں سے خطاب کرتے ہوئے ہمارے حال اور مستقبل پر اثر انداز ہونے والے چند بنیادی نکات اُٹھائے ہیں۔ اُن کی جچی تُلی تقریر میں شدید کرب اور بلا کی غم گساری اور قوتِ ارادی نمایاں تھی۔ اُنھوں نے قطعیت کے ساتھ کہا کہ ہر وہ شخص انتہا پسند ہے جو اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھتا ہے اور ہر وہ انسان دہشت گرد ہے جو اپنی ناقص رائے کو طاقت کے ذریعے دوسروں پر مسلط کرتا ہے۔ یہ انتہا پسند اور دہشت گرد ہم پر اندر سے حملہ آور ہو رہے ہیں اور اُن کی جنگ ہماری قومی سالمیت، ہماری معیشت، ہماری طرزِ زندگی، قرآن کی مسلمہ تعلیمات اور دستوری نظام کے خلاف ہے جس کا فوج اور عوام کو ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور تباہ کاریوں پر قابو پانا ہو گا۔

آرمی چیف نے اس امر پر بھی زور دیا کہ دہشت گردوں کو عبرتناک سزائیں دینے کے لیے ہماری پارلیمنٹ کو خصوصی قوانین بنانے چاہئیں، کیونکہ مروجہ قوانین اور نظامِ شہادت کے تحت ملک میں تباہی پھیلانے والے خطرناک مجرم عدالت سے بری ہو جاتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی استدلال تھا کہ جب تحریکِ طالبان اپنے اندر کوئی دوسرا گروپ برداشت نہیں کرتی، تو پاکستان کی ریاست اپنے اندر عسکریت پسندوں کی متبادل ریاستیں کیونکر برداشت کر سکتی ہے، چنانچہ اُن کا قلع قمع ہماری قومی ذمے داری میں شامل ہے۔

اُن کے خطاب کا وہ حصہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے جس میں اُنھوں نے پاکستان اور اسلام کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے مغرب کے اور اپنے نام نہاد لبرل عناصر کو یہ پیغام دیا ہے کہ اس ارضِ پاک سے اسلام کو خارج نہیں کیا جا سکے گا۔ دراصل فوج کے خمیر میں اسلام کی خوشبو رچی بسی ہے اور اس کی ایمانی طاقت ہی دہشت گردی کے خلاف ایک مضبوط حصار بنی ہوئی ہے، یوں ہماری قیادت پر لازم آتا ہے کہ وہ اس عظیم جذبے کو زندہ رکھنے کے لیے اسلام کی عالمگیر تعلیمات پر معاشرے کی تعمیر کی ذمے داری کامل دیانت داری سے ادا کرے۔

جنرل کیانی کی تقریر میں سیاسی خلفشار، اقتصادی زبوں حالی، عوام کی بنیادی سہولتوں سے محرومی اور حد سے بڑھی ہوئی بدعنوانی اور بدانتظامی کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو غالباً فوج کے داخلی اضطراب کا ایک بھرپور اظہار ہے۔ دانش ور سپہ سالار کے دُکھی دل کی یہ پکار سیاست دانوں، منصوبہ سازوں اور میڈیا کے ناخداؤں کو اپنا کردار یاد دلانے اور عوام کے اندر صحت بخش آب و ہوا کی تلاش میں نکلنے کے لیے بانگِ درا کی حیثیت رکھتی ہے۔

الطاف حسن قریشی

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

اُمڈتے مسائل کا دیرپا حل

ہمارے بنیادی مسائل کیا ہیں، وہ بحرانوں کی شکل کیوں اختیار کرتے رہتے ہیں،
کون کون سے عناصر ان کے ذمے دار ہیں، تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے
میں کیا ہم ان کا دیرپا حل دریافت کر سکتے ہیں؟
ان اہم سوالات کا تجزیہ، الطاف حسن قریشی کے قلم سے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ہم نے اپنی آزادی کے پینسٹھ برسوں میں بڑے بڑے کمالات بھی دکھائے اور سیاست دانوں' جرنیلوں' سرکاری افسروں اور اعلیٰ عدالتوں کے ہاتھوں بڑے زخم بھی کھائے ہیں جو اب ناسور بن گئے ہیں اور ہمارے قومی وجود کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ عالمی تاریخ کے تناظر میں جس طرح پاکستان کی تخلیق ایک معجزہ تھا' اسی طرح اس کا قیام اور استقلال اس سے کہیں بڑا معجزہ ہے۔ اس کی تخلیق کے وقت بیشتر برطانوی اور بھارتی تجزیہ نگار یہ پیشین گوئی کر رہے تھے کہ یہ نیا ملک اپنے مسائل کے بوجھ تلے جلد دم توڑ دے گا۔ انڈین کانگریس نے تو ایک قرارداد کے ذریعے اس اُمید کا باقاعدہ اظہار بھی کر دیا تھا کہ جب تقسیم کا اُبال بیٹھ جائے گا اور جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو پاکستان خود

بھارت میں شامل ہونے کے لیے منت سماجت کرے گا۔ خاکم بدہن بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو نے تو نوزائیدہ مملکت کی زندگی صرف چھ ماہ متعین کی تھی، کیونکہ اُنھیں پورا یقین تھا کہ وہ اقتصادی طور پر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ حالات بھی کچھ ایسے ہی نظر آتے تھے، کیونکہ سخت بے سروسامانی کا عالم تھا۔ نوے لاکھ سے زائد لٹے پٹے مردوزن پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے جس کا ریاستی ڈھانچہ نہایت کمزور اور افراتفری کا شکار تھا۔ سرکاری دفتر خالی پڑے تھے کہ ہندو اور سکھ جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور انتظامی امور چلانے کی مہارت رکھتے تھے، بھارت جا چکے تھے۔ مہاجرین کی اتنی بڑی تعداد میں کفالت اور اُن کی آبادکاری نئی مملکت کے لیے ایک جان لیوا چیلنج سے کسی طرح کم نہ تھی، جبکہ بھارت نے سری نگر میں فوجیں اُتار کر پاکستان کی شہ رگ پر قابض ہونے کی ابتدا کر دی تھی۔ ان پہاڑ جیسی مشکلات کے باوجود ہماری قومی قیادت اور پاکستان کے عوام نے زبردست ایثار، بے پناہ جوش و خروش اور غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیا۔ مہاجرین کی ابتدائی آبادکاری دو سال کے اندر ہی مکمل ہو چکی تھی اور نظام مملکت بھی مستحکم بنیادوں پر قائم ہونے لگا تھا۔ پھر فقط سات برسوں کی قلیل مدت میں پاکستان کی معیشت اس قدر ترقی کر گئی کہ بھارت کو اپنے روپے کی قیمت کم کرنا پڑی۔ اس نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنے روپے کی قیمت کم نہ کی تو اس پر فوجی چڑھائی کر دی جائے گی، لیکن اُسے منہ کی کھانا پڑی۔ پاکستان نے اپنی ایمانی طاقت اور داخلی قوت کا لوہا منوا لیا تھا اور اس نے طوفانوں کے درمیان آگے بڑھنا اور بین الاقوامی تعلقات میں ایک موثر کردار ادا کرنا سیکھ لیا تھا۔

قائداعظمؒ نے اپنی منتشر قوم کو منظم کرنے، تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دینے اور ایک آزاد مسلم ریاست قائم کر کے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا تھا جس کی مثال عصر حاضر کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے آغاز ہی میں پاکستان کے لیے گھمبیر مسائل پیدا کر دیے تھے۔ بہت ساری مشکلات نے برصغیر کی غیر منصفانہ تقسیم کے بطن سے جنم لیا تھا جن کا مداوا آج تک نہیں ہو پایا ہے۔ ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو قائداعظمؒ اور پاکستان کے ساتھ کد رکھتے تھے، اُنھوں نے ریڈکلف ایوارڈ میں خیانت کی اور ضلع فیروز پور اور ضلع گورداسپور کے مسلم اکثریتی علاقے بھارت کے حوالے کر دیے جس کے نتیجے میں کشمیر اور پانی کے مسائل پیدا ہوئے۔ فیروز پور ہیڈ ورکس جو مسلم اکثریتی علاقے میں واقع تھا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بددیانتی کے باعث پاکستان اس سے محروم ہو گیا اور وہاں سے نکلنے والی نہروں کا پانی بھارت نے بند کر دیا۔ اسی طرح ضلع گورداسپور بھارت کی تحویل میں دینے سے اُسے کشمیر تک پہنچنے اور اس پر غاصبانہ قبضہ جمانے کا زمینی راستہ مل گیا۔ صوبہ سرحد کے طاقتور اور متحرک وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم خاں کی طرف سے قبائلیوں کو منظم کر کے بھارت کو ممکنہ غاصبانہ قبضے سے روکنے کی درپردہ کوششیں ہوئیں، مگر اُن کے بطن سے ایک ایسی خرابی نے جنم لیا جو مستقبل میں ایک گھمبیر مسئلے کی حیثیت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اختیار کر گئی۔ عالمِ اسلام کے جدید مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جب جہادِ کشمیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ واضح کی کہ دو مملکتوں کے مابین جہاد کا حکم ریاست ہی دے سکتی ہے اور اس کا باقاعدہ اعلان ہونا چاہیے' اس لیے نان اسٹیٹ ایکٹرز کے لیے فوجی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مولانا کی بالغ نظری نے جہاد کے نام پر اُٹھنے والی تحریکوں اور تنظیموں کا راستہ روکنے کی بروقت کوشش کی تھی' مگر اس وقت کی حکومت نے اُن کی حکیمانہ باتوں پر غور کرنے کے بجائے اُنہیں جیل میں ڈال دیا اور اُن کے خلاف جہادِ کشمیر کے مخالف ہونے کا پروپیگنڈہ پوری قوت کے ساتھ شروع کر دیا۔ یوں ہمارے زیادہ تر مسائل کی جڑیں آزادی کے اوّلین دور تک جا پہنچتی ہیں۔

☆☆☆

آل انڈیا مسلم لیگ نے صرف ۷ سال کی قلیل مدت میں آزاد مسلم ریاست کی منزل پالی تھی' مگر اُسے قومی کردار کی تشکیل اور جماعت کو مضبوط تنظیمی بنیادیں فراہم کرنے کا وقت نہیں ملا۔ قائداعظمؒ اپنے عمل سے جمہوری اقدار کو فروغ دیتے اور اجتماعی فیصلے مشاورت سے کرتے رہے' لیکن حالات کے جبر کے تحت اُنہیں کھوٹے سکوں پر انحصار کے علاوہ جاگیرداروں کی حمایت بھی حاصل کرنا پڑی کہ محدود رائے دہی کا جو نظام انگریزوں نے رائج کیا تھا' اس میں ووٹ کا حق اُسی شخص کو حاصل تھا جو جائیداد کا مالک ہو یا پرائمری پاس ہو۔ اِن طبقات کو جمہوریت کا خوگر بنانے کے لیے ایک عمر درکار تھی جو انڈین کانگریس کو میسر آئی تھی' جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ کو عوام و خواص کی سیاسی تربیت کا بہت کم وقت ملا' کیونکہ اُسے فوری طور پر نئی مملکت کے نظم و نسق کا بار اُٹھانا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل یہ ہوا کہ بھارت پر سبقت لے جانے کا داعیہ مردانِ کار کو جوشِ عمل پر اُبھارتا رہا' البتہ سیاسی تربیت اور نظریاتی بنیادوں پر اُٹھائے جانے والے سیاسی ڈھانچے کے فقدان کے باعث گوناگوں داخلی مسائل جنم لیتے رہے۔ درحقیقت سیاسی قیادتیں اور سیاسی جماعتیں ہی اپنے کارکنوں اور ہم سفروں کو نظم کی پابندی کا خوگر بناتی' اقتدار کے عمل کو ایک سانچے میں ڈھالتی اور عوام کی فلاح و بہبود کو اوّلین اہمیت دیتی ہیں' لیکن مسلم لیگ یہ اوصاف پیدا نہ کر سکی۔

بدقسمتی سے پاکستان کے قیام کے چند ہی ماہ بعد وہ مختلف سیاسی اور مذہبی عناصر جو تحریکِ پاکستان میں ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ کام کر رہے تھے' سیاسی تربیت کی خامی سے ہوسِ اقتدار کا شکار ہو گئے اور منظر نامے بدلتے چلے گئے۔ تحریکِ پاکستان میں اُردو مسلمانوں کی وحدت اور تشخص کی مظہر اور پورے برصغیر میں رابطے کی زبان تھی۔ مسلم بنگال میں قومی سطح کی قیادت بھی اُردو زبان ہی استعمال کرتی تھی اور خواجہ ناظم الدین' خواجہ شہاب الدین' نورالامین' مولانا اکرم' فضل الرحمٰن' چودھری فضل القادر' مولوی تمیز الدین خاں اُردو سے اچھی شناسائی رکھتے تھے۔ اسی طرح دینی مدرسوں میں یہی زبان ذریعہ تدریس تھی' مگر قیامِ

پاکستان کے بعد پورا لسانی تناظر تبدیل ہوتا چلا گیا۔ بنگلہ زبان اُردو کے مدِمقابل آن کھڑی ہوئی۔ قائداعظمؒ مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ گئے اور یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ صرف اُردو ہماری سرکاری زبان ہوگی' تو شیخ مجیب الرحمٰن کی سرکردگی میں نوجوانوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور ایک انتہائی ناخوشگوار صورتِ حال گھمبیر ہوتی گئی۔ فتنہ پرور عناصر نوجوانوں میں پہلے سے یہ گمراہ کن خیالات راسخ کر چکے تھے کہ اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل جانے سے بنگالی ہر معاملے اور شعبے میں پیچھے رہ جائیں گے اور وفاق کی سطح پر اُنہیں اقتدار اور ملازمتوں میں بہت کم حصہ ملے گا۔ بعدازاں اُردو اور بنگلہ دونوں ہی سرکاری زبانیں قرار پائیں' مگر مارچ کے واقعات نے قومی یک جہتی کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا' وہ بالآخر بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوا اور آج پاکستان میں ''قومی زبانوں'' کے حوالے سے ایک نئی بحث چل نکلی ہے جو نئے فتنے جگا سکتی ہے۔

☆☆☆

برصغیر میں دو آزاد اور خودمختار مملکتیں ایک بےمثل طوفانی انقلاب کے ذریعے وجود میں آئی تھیں۔ مسلمانوں کے عظیم راہنما کی حیثیت سے قائداعظمؒ کو مکمل ادراک تھا کہ مسلم معاشرے میں وہ کون سی سماجی خرابیاں رچی بسی ہیں جو نئی مملکت کا انتظام وانصرام عدل وانصاف' میرٹ اور غیر جانب داری کی بنیادوں پر چلانے میں حائل ہوں گی۔ چنانچہ ان لعنتوں اور خرابیوں کا ذکر اُنہوں نے اپنے گیارہ اگست کے مشہور خطاب میں کیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ اس وقت ہندوستان جس بڑی لعنت میں مبتلا ہے' وہ رشوت ستانی اور بدعنوانی ہے۔ دراصل یہ ایک زہر ہے جس کا ہمیں نہایت سختی سے قلع قمع کرنا ہوگا۔ چور بازاری دوسری لعنت ہے جو معاشرے کے خلاف سب سے گھناؤنا جرم ہے۔ تیسری لعنت اقربا پروری اور احباب نوازی ہے اور اس برائی کو بھی سختی سے کچل دینا چاہیے۔ اُنہوں نے اس پختہ عزم کا اظہار کیا کہ میں احباب نوازی اور اقربا پروری برداشت کروں گا نہ کوئی اثر ورسوخ قبول کروں گا جو مجھ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ قائداعظمؒ نے جہاں اس پالیسی خطاب میں مذہبی آزادیوں کی بات کی تھی' وہاں اُن معاشرتی برائیوں کی بھی نشان دہی فرمائی تھی جن کا خاتمہ ایک صحت مند معاشرے کی نشوونما کے لیے بےحد لازم تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے حکمران جو اقتدار کی کشمکش اور ذاتی یا گروہی مفادات کا جلدی شکار ہو گئے تھے' اُنہوں نے ان لعنتوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے بجائے اُنہیں اپنے اسلوبِ حکمرانی کا ایک ناگزیر حصہ بنا لیا جس کے نتیجے میں پاکستان کی اخلاقی بنیادیں کمزور پڑتی گئیں اور سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی شیرازہ بکھرتا گیا جو بانیِ پاکستان کی بیان کردہ ترجیحات سے انحراف کا شاخسانہ تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pakvirtualibrary.pk

مسلمانوں کے عظیم راہنما کی حیثیت سے قائداعظمؒ کو اِس امر کا شدید احساس تھا کہ برطانوی راج میں جو مسلم فوجی اور سول افسروں کی سوچ پروان چڑھی ہے اور مزاج تشکیل پایا ہے' اِسے آزاد اسلامی ریاست کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ازبس ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ فوجی یونٹوں سے خطاب کرتے اور اسٹاف کالج میں اعلیٰ افسروں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے اور غلط سوچ پر ٹوکتے بھی رہے۔ پاکستان کے پہلے یومِ آزادی کے استقبالیے میں کرنل اکبر خاں نے قائداعظمؒ سے گلہ کیا کہ آپ اپنے افسروں کی صلاحیتوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اہم عہدے غیر ملکیوں کو دے رہے ہیں۔ اُنہوں نے کرنل کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا ''تم ریاست کے ملازم ہو اور ہم عوام کے نمائندے فیصلہ کرتے ہیں کہ ملک کس طرح چلانا ہے۔ تمہارا کام صرف اپنے سول حاکموں کے فیصلوں پر عمل کرنا ہے''۔ قائداعظمؒ اسٹاف کالج کوئٹہ تشریف لے گئے اور اُنہیں فوج کے اعلیٰ افسروں سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ افواجِ پاکستان نے جو حلف اُٹھایا ہے' اس کے مضمرات کا وہ پورا شعور نہیں رکھتی' چنانچہ اُنہوں نے اپنے خطاب میں فوج کے شاندار جذبے' اُس کی فرض شناسی اور ایثار کیشی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مقررہ حلف کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور وہ جملے خاص طور پر دہرائے جن میں کہا گیا تھا کہ ''میں ریاست کے آئین کا وفادار رہوں گا''۔ اُنہیں غالباً یہ حُسنِ ظن تھا کہ اگر افواج کے افسر اپنے حلف پر قائم رہے' تو وہ آئینی حدود سے تجاوز کریں گے نہ سیاست کے اندر مداخلت کا راستہ اپنائیں گے۔ مگر ہماری شومئی قسمت سے وہی کرنل اکبر خاں جسے قائداعظمؒ نے یومِ آزادی کے استقبالیے میں ڈانٹ پلائی تھی' اس نے فوج میں ترقی پا کر ۱۹۵۰ء میں فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی ناکام کوشش کی اور جواز یہ دیا کہ جب ہماری فوجیں جموں کے دروازے تک پہنچ گئی تھیں تو حکومت نے سلامتی کونسل کی قرارداد پر فائر بندی کا اعلان کر کے کشمیر کاز کے ساتھ غداری کی ہے۔ قائداعظمؒ نے وقت سے پہلے خطرہ بھانپ لیا تھا' مگر وہ تشکیلِ پاکستان کے تیرہ ماہ بعد ہی دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور اُنہیں فوج کی ذہنی تطہیر کے لیے بہت کم وقت ملا تھا۔

☆☆☆

دوسرا بڑا خطرہ اُنہیں سول بیوروکریسی کی طرف سے تھا جس نے نوآبادیاتی برطانوی دورِ حکومت میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور اسے آزادی کے تقاضوں میں ڈھالنے کے لیے زبردست کوششیں درکار تھیں۔ بلاشبہ کٹے پھٹے پاکستان کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنے' ہیبت ناک مسائل سے نمٹنے اور معیشت کو استحکام دینے میں سول بیوروکریسی نے بے مثال کارنامے سرانجام دیے تھے اور نظم و نسق کو ایک اسٹیل فریم ورک مہیا کیا تھا' مگر اس کے طور طریق حاکمانہ اور شاہانہ تھے۔ قائداعظمؒ نے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرکاری ملازمین سے مختلف مواقع پر خطاب کرتے ہوئے اُن میں آزاد ریاست کی ضرورتوں کا شعور اُبھارنے کی پیہم کوشش کی اور

اُنہیں بار بار پیغام دیا کہ وہ عوام کے حاکم نہیں' بلکہ خادم ہیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں سرکاری افسروں سے خطاب میں اُنہوں نے فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ جو انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی ہے' آپ اس کے گہرے مضمرات کا ٹھیک اندازہ لگائیں۔ آپ کسی بھی فرقے' ذات پات یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں' اب پاکستان کے خادم ہیں اور صرف خدمت کے ذریعے اپنے فرائضِ منصبی اور ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ وہ دن گئے جب ملک پر افسر شاہی کا حکم چلتا تھا۔ آپ کا حکمران طبقے سے کوئی تعلق نہیں اور اب آپ کا تعلق خدمت گزاروں کی جماعت سے ہے۔ عامۃ الناس میں یہ احساس پیدا کر دیجیے کہ آپ اُن کے خادم اور دوست ہیں اور وقار' دیانت' عدل اور غیر جانب داری کی اعلیٰ روایات قائم کیجیے''۔

سبی میں سول سرونٹس کے اندر ایک نئی روح پھونکتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا تھا:

''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی شے آپ کے ضمیر سے بڑھ کر عظیم تر نہیں اور جب آپ اللہ کے سامنے پیش ہوں' تو یہ کہہ سکیں کہ آپ نے اپنا فرض دیانت' راست بازی اور وفاداری کے اعلیٰ ترین شعور کے ساتھ سرانجام دیا تھا۔ اگر آپ اپنے وطن کو قوموں کی برادری میں ایک باوقار ملک بنانا چاہتے ہیں' تو آپ کو حتی المقدور اپنی آسائشیں فراموش کر دینا ہوں گی اور ہر قسم کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دینا ہو گا' خواہ آپ کو نقصان ہی اُٹھانا پڑے''۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

قائداعظم عوام کی طرف سے سرکاری ملازمین کے خلاف شکایات کا سخت نوٹس لیتے اور بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے بارے میں قانون کے مطابق فوری کارروائی عمل میں لاتے اور فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے۔ کراچی میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو اُنہوں نے فوری نوٹس لیتے ہوئے سیکرٹری دفاع اسکندر مرزا کو وارننگ دی کہ اگر امنِ عامہ چند گھنٹوں میں بحال نہ ہوا' تو کسی اور شخص کو سیکرٹری دفاع مقرر کرنا پڑے گا۔ دراصل اُنہوں نے سرکاری ملازمین کو قواعد و ضوابط کا پابند بنانے کے لیے خود قانون کی پاسداری کا ایک مثالی کردار پیش کیا تھا اور قانون کی بالادستی کا ماحول پروان چڑھایا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں شجاعت علی صدیقی ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل تھے اور وزارتِ خزانہ کے ماتحت تھے۔ کسی نے وزارتِ خزانہ میں شکایت کر دی کہ صدیقی صاحب نے لائل پور کا نجی دورہ کیا' جبکہ ریل کا کرایہ سرکاری خزانے سے لیا اور یہ کہ سرکاری اخبار دفتر کے بجائے اُن کے گھر پر دیا جاتا ہے۔ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کو افسرانِ بالا کے سامنے ایک ایک بات کا مدلل جواب دینا پڑا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد سیاسی اقتدار کی کشمکش تیز ہو جانے اور انتخابات میں سول انتظامیہ کو استعمال کرنے کی وجہ سے حکومت پر بیوروکریسی کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سول اور فوجی بیوروکریسی کی ملی بھگت سے ملک

میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا جس نے سیاسی تار و پود اس طرح منتشر کیے کہ ہم آج بھی شدید خلفشار کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

ہماری آزادی کا پہلا عشرہ مختلف اعتبار سے قابلِ ستائش رہا' لیکن ہمارے بیشتر مسائل اسی عہد میں نمودار ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے متروکہ املاک نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر انتہائی مضر اثرات مرتب کیے۔ بھارت کے اقلیتی صوبوں سے جو مہاجرین پاکستان آئے تھے' اُن کی جائیدادیں' مکانات اور اثاثے اُن کے مقابلے میں بہت کم تھے جو ہندو اور سکھ پاکستان میں چھوڑ کر گئے تھے' چنانچہ جھوٹے کلیم داخل کرنے اور ناجائز طریقوں سے زمینیں اور مکانات الاٹ کرانے کی دوڑ شروع ہوگئی جس میں لاکھوں بے مایہ خاندان دیکھتے ہی دیکھتے عالیشان کوٹھیوں اور سونا اُگلتی زمینوں کے مالک بن گئے اور نودولتیوں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا' البتہ اس امتحان میں خاصی بڑی تعداد اُن عظیم انسانوں کی بھی تھی جنھوں نے غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی املاک سے اپنا جائز حصہ بھی لینا گوارا نہ کیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کی ضلع کرنال اور یوپی میں بڑی بڑی جاگیریں تھیں' مگر اُنھوں نے کوئی کلیم داخل نہ کیا اور وزیرِاعظم کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود اُن کی سادگی اور کفایت شعاری کا یہ عالم رہا کہ شہادت کے بعد جب اُن کی شیروانی اُتاری گئی تو چشمِ فلک نے دیکھا کہ اُن کی قمیص پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اُن جیسے ایثار پیشہ لاکھوں پاکستانیوں نے اپنے وطن کو اخلاقی گراوٹ کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچالیا' مگر اس نے ہماری سیاست' ہماری معاشرت اور قومی نفسیات کو بری طرح متاثر کیا اور بڑے سنگین مسائل جنم دیے تھے۔ مہاجروں اور مقامیوں کے درمیان شدید کھچاؤ سالہا سال جاری رہا جس کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

تشکیل کے اس ابتدائی عہد میں دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قراردادِ مقاصد منظور کر کے ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ یہ قرارداد قائداعظمؒ کے دستِ راست نوابزادہ لیاقت علی خاں نے پیش کی اور اپنی تقریر میں کہا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی جدید تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں جو انسان کی عظمت، اخوت اور سلامتی کا دین ہے۔ قرارداد میں اعلان کیا گیا تھا کہ پوری کائنات کا حاکمِ مطلق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اقتدار جو انسانوں کو تفویض کیا گیا ہے' وہ ایک مقدس امانت ہے جسے عوام کے منتخب نمائندے اللہ تعالیٰ کی طے شدہ حدود میں رہتے ہوئے استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس بنیادی دستاویز میں عدلیہ کی آزادی کے علاوہ بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کے عقیدے' رسوم، عبادات اور تہذیبی اور سیاسی حقوق کا احترام کیا جائے گا۔ یہ کلیدی دستاویز پہلے آئین کے دیباچے کے طور پر شامل کی گئی جسے آٹھویں آئینی ترمیم ۲ الف کے ذریعے جنرل ضیاء الحق نے دستور کے متن کا حصہ بنادیا جو اِن دنوں عدالتِ عظمیٰ کے

معرکۃ الآرا فیصلوں کا محور بنا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے قراردادِ مقاصد کے مطابق ہمارے معاشرے کی تعمیر نہ ہو سکی اور سیاست کے اعلیٰ اخلاقی اصول عملی طور پر نافذ نہیں ہوئے ورنہ قراردادِ مقاصد نے فوجی بغاوتوں کا راستہ یکسر بند کر دیا تھا جس میں یہ کلیدی اصول طے پایا تھا کہ اقتدار کے استعمال کا حق فقط عوام کے نمائندوں کو حاصل ہو گا۔ بیسویں صدی کے وسط میں ریاست کی سطح پر پہلی بار اسلام اور جمہوریت کے مابین ایک حسین امتزاج پیدا ہوا تھا جس کی تخلیق پر پاکستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

☆☆☆

ایک طرف تعمیری کام سرانجام پا رہے تھے اور دوسری طرف پاکستان کے تمام صوبوں میں اقتدار کی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ خان افتخار ممدوٹ کے خلاف ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی میں وزیرِ خزانہ میاں محمد ممتاز دولتانہ اور وزیرِ مہاجرین سردار شوکت حیات نے بغاوت کر دی تھی۔ صورتِ حال جب زیادہ خراب ہوئی تو قائداعظمؒ نے گورنر جنرل کی حیثیت سے گورنر پنجاب، وزیراعلیٰ اور وزیرِ خزانہ کو کراچی طلب کر لیا اور اُنھیں کشیدگی ختم کرنے کی ہدایت کی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ وزیراعلیٰ صوبے کا نظم و نسق چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، چنانچہ اُنہوں نے ممتاز دولتانہ کو پنجاب کا وزیراعلیٰ بننے کی پیش کش کی، مگر وہ مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کے ذریعے وزیراعلیٰ منتخب ہونا چاہتے تھے۔ آنے والے وقتوں میں ممدوٹ دولتانہ آویزش انتہائی شدت اختیار کر گئی اور آخرکار وزیراعلیٰ کو اقتدار چھوڑنا اور صوبے میں گورنر راج نافذ کرنا پڑا۔ اقتدار کی کشمکش سندھ میں بھی اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں وزیراعلیٰ سندھ ایوب کھوڑو اور کابینہ کے دو وزرا الٰہی بخش اور غلام علی کے درمیان اختلاف اُبھر کر سامنے آ گئے اور وزیراعلیٰ پر کرپشن کے سنگین الزامات عائد کیے جانے لگے۔ گورنر نے کشیدگی پر قابو پانے کے لیے وزیروں کے محکمے تبدیل کر دیے۔ جناب ایوب کھوڑو نے گورنر کے اس فیصلے کو کابینہ کے معاملات میں غیر آئینی مداخلت قرار دیا۔ گورنر سندھ نے وزیراعلیٰ کی ہوشربا بے ضابطگیوں کے متعلق ایک مفصل رپورٹ گورنر جنرل کو روانہ کی جنہوں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد جناب کھوڑو کو مستعفی ہونے کا آپشن دیا، مگر اُنہوں نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ گورنر جنرل کے آئینی اختیارات کے تحت وہ برطرف کر دیے گئے۔ ایوب کھوڑو نے مہاجرین کی آبادکاری میں تعاون سے گریز کیا تھا جس پر قائداعظم اُن سے کسی قدر ناراض تھے اور اُن کی کرپشن کے قصے بھی زبان زدِ عام تھے۔

صوبہ سرحد کے معاملات کچھ زیادہ ہی دگرگوں تھے۔ وہاں تقسیم سے پہلے کانگریس کی حکومت قائم تھی جس کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خاں صاحب تھے جنہوں نے اعلان کیا کہ اگر مسلم لیگ صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے کا ریفرنڈم جیت لیتی ہے، تو وہ مستعفی ہو جائیں گے، مگر شکست کھانے کے بعد اپنا وعدہ ایفا نہ کیا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اور قیامِ پاکستان کے بعد نیا حلف اُٹھانے اور پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اس پر قائداعظمؒ نے ڈاکٹر خاں اور اُن کی کابینہ کو ۲۲ راگست ۱۹۴۷ء کو اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے برخاست کر دیا۔ انہی دنوں گورنر سرحد مسٹر کننگھم نے قائداعظم کو یہ رپورٹ ارسال کی کہ سرخ پوش تنظیم کے لیڈر خان عبدالغفار خاں عوامی جلسوں میں پختونستان کے جھنڈے لہراتے ہیں' چنانچہ اُنہیں ایف سی آر کے تحت قید کر لیا گیا۔ اس کے بعد مسلم لیگی لیڈر خان قیوم خاں وزیراعلیٰ بنے جو معاملات خوش اسلوبی سے نہ چلا سکے اور پیر مانکی شریف' جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں زبردست حصہ لیا تھا' وہ اُن سے ناراض ہو کر سیاسی مخالفت پر اُتر آئے۔ یوں اقتدار کی جنگ ایک نئی شکل اختیار کر گئی جس میں سیاسی اصول پامال ہوتے اور جمہوری روایات کمزور پڑتی گئیں۔ اسی طرح مشرقی بنگال میں اقتدار کا کھیل بہت جلد شروع ہو گیا تھا۔ خواجہ ناظم الدین صوبے کے وزیراعلیٰ تھے اور حسین شہید سہروردی اس بات کے شاکی تھے کہ اُن کی خدمات کی قدر نہیں کی گئی۔ اُنہوں نے اپنا یہ گلہ ایم اے ایچ اصفہانی تک پہنچایا کہ وفاقی کابینہ میں شمولیت اُن کا حق بنتا ہے۔ اصفہانی صاحب نے سہروردی صاحب کی سفارش کی تو قائداعظمؒ نے جواب دیا کہ اگر میں خواجہ ناظم الدین کی رضامندی کے بغیر اُنہیں کابینہ میں شامل کر لیتا ہوں تو یہ اُن پر عدم اعتماد کا اظہار ہو گا۔ بدقسمتی سے یہ صوبہ سیاسی ہنگاموں کا مرکز بنتا گیا جن میں وفاق گریز رجحانات کی حوصلہ افزائی کے مظاہر عام ہوئے اور پاکستان کے دوسرے صوبوں میں بھی اُن مطالبات کو تقویت ملی جن میں پاکستانی قوم کی شیرازہ بندی کے بجائے قومیتوں کے حقوق مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک جداگانہ قوم کی بنیاد پر پاکستان کی سیاسی اور نظریاتی جنگ لڑی گئی تھی اور اس کے اندر بسنے والی قوم اپنے اندر قومیتیں بھی رکھتی تھی اور اقلیتیں بھی اور اس تنوع میں بڑا حسن اور بے پناہ وسعت اور گہرائی تھی' مگر کوتاہ نظر عناصر آسمان پر تھوکنے کی مشق بڑے طنطنے سے فرما رہے ہیں۔

☆☆☆

پاکستان کے ابتدائی دس بارہ سال ہمارے بنیادی مسائل کا تعین بھی کر دیتے ہیں اور ان ہاتھوں کا بھی جنہوں نے مملکتِ خداداد کو بڑے بڑے بحرانوں سے دوچار کیے رکھا ہے۔ اختصار کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ اقتدار کی رسہ کشی اور جمہوری رویوں کا فقدان رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں صوبہ سرحد' پنجاب' بہاولپور میں صوبائی سطح پر جو انتخابات ہوئے' ان میں ووٹ کا تقدس بری طرح پامال کیا گیا جس کے باعث ''جھرلو'' کا لفظ وجود میں آیا۔ برسرِ اقتدار جماعت اور حکومت نے انتخابات سے پہلے اور انتخابات کے دوران سرکاری مشینری اور اپوزیشن کے خلاف ریاست کی طاقت انتہائی بے دردی سے استعمال کی اور عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ بیلٹ کے ذریعے تبدیلی کے تمام راستے بند ہیں اور جمہوریت محض

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.paksociety.pk

فریبِ نظر کے سوا اور کچھ نہیں۔ مشرقی بنگال میں ۱۹۵۴ء میں ہونے والے انتخابات میں حکومت کے خلاف جگتو فرنٹ بنانے کا تجربہ کیا گیا جس نے مسلم لیگ کی بساط اُلٹ کر رکھ دی اور وزیر اعلیٰ نور الامین ایک گم نام طالب علم کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔ مسلم لیگ پر اس کاری ضرب نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سیاسی پُل میں گہرے شگاف ڈال دیے تھے اور قومی سیاست میں شدید عدم توازن پیدا کر دیا تھا۔

اس عہد تعمیر و تخریب میں سرکاری ملازمین سازشوں کے ذریعے اعلیٰ سیاسی مناصب تک جا پہنچے' جبکہ قائداعظمؒ اُنھیں سیاست سے الگ تھلگ دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک غلام محمد ایک ٹیکنو کریٹ تھے' مگر قابل سیاست دانوں کی تعداد محدود ہونے کے باعث اُنھیں پاکستان کی پہلی وفاقی کابینہ میں وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا' بعد میں اُنھوں نے گورنر جنرل کا حلف اُٹھایا اور آئین اور قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پہلی جست میں وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کا پروانہ جاری کیا اور دوسری جست میں دستور ساز اسمبلی ہی کو چلتا کر دیا۔ اسی طرح اسکندر مرزا بھی ایک سرکاری ملازم اور پاکستان کے پہلے سیکرٹری دفاع تھے۔ اس کے بعد وہ پہلے مشرقی پاکستان میں گورنر تعینات ہوئے اور بعد میں گورنر جنرل ملک غلام محمد کی ''باصلاحیت کابینہ'' میں وزیرِ داخلہ بنے اور ۱۹۵۶ء میں جوڑ توڑ کے ذریعے قومی اسمبلی سے صدرِ پاکستان منتخب ہونے میں کامیاب رہے۔ اُنہوں نے فوجی کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں کے ساتھ ساز باز کر کے ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ کیا' کیونکہ وہ آنے والے انتخابات کے نتائج سے خوفزدہ تھے جن میں امریکی لابی کا صفایا صاف نظر آتا تھا۔ اسی عہد میں وفاقی عدالت کے چیف جسٹس جناب محمد منیر نے نظریۂ ضرورت ایجاد کیا اور اسی عہد میں کمانڈر ان چیف وزیرِ دفاع بنائے گئے۔ اسی عہد میں راتوں رات سیاسی جماعت بنتے اور سیاسی وفاداریوں کا تماشا لگتے دیکھا۔ آج ہم جس دوراہے پر کھڑے ہیں' اس میں اپنی تاریخ کے ابتدائی دس بارہ برسوں سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ انتخابات سر پر کھڑے ہیں اور اُن کے نتائج سے خوفزدہ عناصر فوج کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اقتدار کی ہوس نے ملکی سلامتی اور عوام کی قوتِ برداشت کے بارے میں سنگین سوالات اُٹھا دیے ہیں' جبکہ کوتاہ نظر مذہبی پیشواؤں کے پیٹ کی بھوک فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دے رہی ہے۔ قوم کے وجود کو ہلا دینے والے ان مسائل کا دیرپا حل تلاش کرنے کے لیے درمیانے طبقے اور اہلِ دانش کو سیاسی قیادت اپنے ہاتھوں میں لینا اور قائداعظمؒ کے عظیم جمہوری اور اسلامی تصورات کے مطابق تشکیلِ نو کا بیڑا اُٹھانا ہوگا۔

کیا پاکستانی نوجوان مصری یوتھ کی طرح التحریر اسکوائر میں نکل کر تبدیلی کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنے کو تیار ہیں؟

مصری سونامی کے بعد کی کہانی

پُر عزم مصری صدر

محمد مُرسی کے ۱۰۰ دن

جن کے طوفانی فیصلوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجزیہ نگاروں کو ہلا کر رکھ دیا

مصری سونامی کے ثابت کرنے میں لوگوں نے بڑی جھول کی ہے۔ سادہ دو سے نظر آنے والے صدر کی شخصیت کے پیچھے بہت کچھ ہے جن ان پر لکھی تحریریں، ارادے اور عزائم لوگوں کو بھا رہے ہیں۔ وہ تھکتے نہیں تھکتے مگر سارے کام ہی حقائق کو نیست کر رہے ہیں۔ اقتدار کے تنے ہوئے رسے پر احتیاط سے چلنے والے محمد مرسی کے ۱۰۰ دن، ایک سال نے خوشی، ناکامیابی اور تبدیلی کو ترستے لوگوں کی امیدوں کو بدلا ہے۔

محمد مرسی کا تعلق دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اسلامی جماعت اخوان المسلمین سے ہے۔ اخوان دنیا میں اپنے بھائی چارے، نظم و تربیت، علم و فہم، دینی اقدار سے عشق، بہترین اسلامی لٹریچر اور مخلص اور دیانتدار راہنماؤں کی وجہ سے جانی جاتی ہے۔ تیونس سے لے کر اردن، شام سے لے کر لبنان، امریکا سے لے کر یورپ ہر ملک جہاں عرب بستے ہیں، اخوان کی دعوت اور سوچ نے دلوں میں اپنا گھر کیا ہے۔

عرب دنیا میں آنے والی بہار میں مرکزی اخوان المسلمین کے سیکڑوں جاں نثاروں کی قربانی سے ہی آئی ہے، مگر وہ اس کا کریڈٹ لینے پر تیار نہیں۔ مصر کی ہر پل بدلتی صورت حال کا جائزہ، آج کے جمہوری اذہان کے لیے اس لیے بھی بے حد ضروری ہے کہ آگہی کے بنا نہ تو درست تجزیہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی صحیح نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

مصر کے التحریر اسکوائر میں پیدا ہوئی تبدیلی کی لہر کو پسند کرنے والے کیا پاکستان میں بھی ایسا کر پائیں گے۔ یہی وہ اہم اور بنیادی سوال ہے جس کے جواب کی ہم سب کو تلاش ہے۔

پیش کش: اختر عباس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

" مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ ہمارے مصر میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں مصر کے صدر سے مل سکوں گا۔ جو عرب جمہوریہ مصر کا پانچواں مگر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والا پہلا صدر ہے۔ اپنے سامنے ایک سادہ، متواضع اور عاجزی سے بات کرنے والے صدر کو دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی تھی، میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب ایوانِ صدر میں موجود ایک طالبہ کو میں نے دیکھا جو مصری صدر کا دامن پکڑ کر کہہ رہی تھی **''اتق اللہ فینا''** ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو۔ مصری صدر نے سر جھکا کر کہا میں حاضر ہوں۔ اس کی آواز پست تھی، حالانکہ اس کے دونوں طرف اعلیٰ فوجی افسران پورے کروفر کے ساتھ موجود تھے۔

صدر میری طرف متوجہ ہوئے تو میں حواس باختہ تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کو مالی امداد کی ضرورت ہے یا ذاتی وظیفہ چاہیے؟ جو بھی آپ کی ضرورت ہے مجھے بتائیے۔''

میں نے کہا ''مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔ اپنے جلے ہوئے بیٹے کا علاج اور ہسپتال میں داخلہ چاہیے جس سے وہ انکاری ہیں۔''

صدر نے کہا ''میں مریض کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس سے ملواؤ۔'' گاڑی میں لیٹے ہوئے بیٹے کو لے کر آیا تو صدر نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کے لیے دوبارہ مشروب منگوایا، پھر ہسپتال بھجوانے کے لیے سرکاری گاڑی منگوائی اور ایک افسر کو میرے ساتھ بھیجا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ ہمارے مصر میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ میرے صدر محترم......! اللہ آپ کو برکت دے۔ اس بے چاری قوم کے آپ کو مزید قریب کرے۔ آپ کی قوم کو اللہ کی مدد کے بعد آپ کی توجہ، مدد اور شفقت کی بہت ضرورت ہے۔''

جلے ہوئے جسموں کے علاج کے ماہر ڈاکٹر محمد سمیر نے فیس بک پر اس روتے ہوئے باپ کا مکالمہ اور کہانی درج کی ہے جو اپنے جواں سال بیٹے کو جس کا جسم ۴۰ فیصد سے زائد جلا ہوا تھا، سرکاری ہسپتال میں داخلے کے لیے لایا تھا۔ ڈاکٹر سمیر کہتے ہیں کہ مریض کے زخموں کی حالت دیکھ کر میں نے مشورہ دیا کہ اسے کسی بڑے ہسپتال لے جاؤ، جہاں زیادہ سہولتیں اور آرام ہو۔ مریض کے لواحقین نے اصرار کیا۔ میرے انکار پر وہ ہسپتال کے سربراہ کے پاس چلے گئے۔ میں نے وہاں بھی صورتِ حال واضح کی تو مریض کے لواحقین نے جاتے ہوئے دھمکی دی کہ وہ وزارت صحت ہی نہیں مصری حکومت کے اعلیٰ ترین منصب دار سے بھی میری شکایت کریں گے۔ ان کی بات سن کر میں مسکرا دیا مگر کچھ ہی دیر بعد میری مسکراہٹ غائب ہو گئی جب ایوانِ صدر کی ایک گاڑی، ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہوئی۔ ہال میں ایوانِ صدر کے نمائندے نے مریض کو فوری طور پر داخل کرنے اور اس کا بہترین علاج کرنے کا صدارتی حکم سنایا۔ اب میرے لیے اسے داخل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

ڈاکٹر محمد سمیر نے لکھا کہ مریض کا علاج پوری توجہ سے ہونے لگا تو ایک روز اس کے والد نے اس مصری صدر سے ملاقات کی پوری کہانی سنائی، جس کو ایک بیٹے نے مخاطب کر کے کہا تھا ''اگر آپ نے عوامی اُمنگوں کے مطابق کام نہ کیا تو آپ کے خلاف ''میدان التحریر'' میں سب سے پہلے میں احتجاج کروں گا۔''

وہی صدر جس کی اہلیہ نجلا علی محمود نے میڈیا کو ہدایت کی کہ کوئی اسے خاتونِ اول نہ کہے۔

کوئی اور راہ نہ پا کر میں اپنے جلے ہوئے بیٹے کو گاڑی میں لے کر ایوانِ صدر پہنچا اور متعلقہ عملے سے درخواست کی کہ میں صدر سے ملنا چاہتا ہوں۔ پھر اچانک صدر کے احکامات کے باعث حکام نے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میں مصری صدر سے یوں مل سکوں گا۔

ڈاکٹر محمد مُرسی کے صدر کا عہدہ سنبھالنے کے لمحے سے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دُنیا کی نگاہیں ان پر گڑی ہوئی ہیں۔ حسنی مبارک کے ۳۰ سالہ طویل دورِ آمریت کے بعد عوامی صدر کا انتخاب اور انتقالِ اقتدار آسان نہیں تھا۔

ذاتی زندگی میں انتہائی درویشی کی حد تک سادہ رہنے والے محمد مرسی جواب بھی اپنے پرانے گھر میں مقیم ہیں اور گھر کے قریب پہنچ کر سرکاری محکموں کا حصار توڑ کر سرکاری گاڑی سے اتر جاتے ہیں تاکہ اپنے لوگوں سے مل سکیں، سیاسی طور پر اتنے سادہ ثابت نہیں ہوئے۔

صدر منتخب ہونے کے فوراً بعد جب وہ آئینی عدالت کے سامنے حلف اٹھا چکے تو صدارتی محل جانے کے بجائے انھوں نے پہلے قاہرہ یونیورسٹی جانے کا فیصلہ کیا جہاں پڑھنے والے ہزاروں طلبہ ان کا ہراول دستہ تھے اور جنھیں اب محمد مرسی کا دست و بازو بننا ہے کہ سوشل میڈیا پر وہ سارے لڑکے اور لڑکیاں جنھوں نے التحریر کو التحریر اسکوائر بنایا، بہت فکرمندی کے ساتھ اس عوامی تبدیلی اور بیداری کے نتیجے میں بننے والے صدر کے ہر ہر اقدام پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیوروکریسی اور بہت سے سرکاری اداروں کے کارکنان جن کی برسوں سے حسنی مبارک کے ساتھ وابستگی اور وفاداری ہے، بار بار محمد مرسی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے سے باز نہیں آرہے۔ ان کے اقدامات پر تنقید اور اکثر غلط تشریح کر کے غلط فہمیاں اور مایوسیاں پھیلانے کی مسلسل کوشش میں ہیں۔

انھیں یہ بھی خبر ہے کہ جامع ازہر کی شاہراہ پر واقع دکانوں کے مالک اس بات پر بے حد خوش ہیں کہ صدر کی آمدورفت سے ان کے بزنس پر منفی اثر نہیں پڑتا اور مارکیٹیں بند نہیں کرائی جاتیں۔ ملک میں لوڈشیڈنگ ہو رہی ہے تو ان کے اپنے صدر کے گھر کو بھی اس سے استثنا حاصل نہیں ہے۔

صدر مرسی نے اپنے حلف کے پہلے ہی روز جامع ازہر جانے کا فیصلہ کیا تو سیکورٹی حکام نے مسجد کے دروازوں پر برقی دروازے نصب کر دیے تاکہ نمازی ان میں سے گزر کر اندر جاسکیں اور ان کی تلاشی لی جاسکے تاکہ اسلحہ اندر نہ جائے۔ صدر کو جونہی پتا چلا یہ ساری کارروائی روک دی گئی۔

جامع ازہر کے خطیب نے اپنے صدر کو سامنے پایا تو اسلامی تاریخ کی درخشاں روایت کے مطابق ''دین تو نصیحت ہے'' کے مصداق امیرالمومنین حضرت عمرؓ بن خطاب کے طرزِ عمل اور خدمات کے ذکر کے ساتھ ساتھ محمد مرسی سے بندھی توقعات کا اس دل سوزی سے بیان کیا کہ محمد مرسی زاروقطار رو پڑے۔ انھیں اپنی ذات سے وابستہ توقعات کا بخوبی احساس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں اترے سورما کی ایک ایک حرکت سے قوم کو کیا کیا امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔

محمد مرسی کا پہلا خطاب

صدارتی انتخابات میں کامیابی کے صبر آزما اعلان کے فوراً بعد، جس میں انھیں ایک کروڑ ۳۲ لاکھ ۱۲۱ ہزار (۵۱ء۷۳ فیصد) ووٹ ملے۔ انھوں نے التحریر اسکوائر میں جو خطاب کیا وہ بہت دلچسپ نکات کا حامل تھا۔ اس لحاظ سے بھی کہ کامیابی کے نشے کی خوشی میں چور ہو کر بڑے بڑے لوگ اپنے ارادے، پروگرام اور دعوے سب بھول کر اقتدار کی خواب نگری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ صدر مرسی نے کہا:

1 میں پارٹی کا نہیں مصریوں کا صدر ہوں۔ جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی کے عہدے اور بنیادی رکنیت سے استعفا دے رہا ہوں۔

2 مصر تمام مصریوں کا ہے۔ حقوق کے معاملے میں سب برابر ہیں۔ میرا کوئی حق نہیں، صرف فرائض ہیں۔ مصری عیسائیوں اور مسلمانوں، سب کو مصر کی تہذیب و تعمیر کے لیے کام کرنا ہے۔ انسانی اقدار، آزادی، انسانی حقوق کے احترام، خواتین اور بچوں کے لیے کام کرنا ہے۔ (مصر کے قبطی عیسائیوں نے الیکشن کے دوران محمد مرسی کا بھرپور ساتھ دیا جبکہ میڈیا نے انھیں متنفر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے لیے ایک من گھڑت بیان کی خوب تشہیر کی جس کے الفاظ تھے:

''عیسائیوں کو جان لینا چاہیے کہ فتح قریب ہے۔ مصر اسلامی ہوگا۔ عیسائیوں کو جزیہ دینا ہوگا یا پھر نقل مکانی کرنا ہوگی۔''

مصری الیکٹرونک میڈیا نے آخری وقت تک محمد مرسی کو اقلیت دشمن اور انتہاپسند ثابت کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہاں تک کہ ایک ٹی وی چینل نے تو اپنی ۳ گھنٹے کی براہِ راست نشریات میں اخوان المسلمون اور محمد مرسی کی خوب خبر لی۔ ایک خودساختہ وڈیو دکھائی جیسی ہمارے ہاں سوات میں لڑکی کو کوڑے لگنے کی بنائی اور دکھائی گئی تھی کہ ایک عیسائی کو مسلمانوں نے مارا۔ وڈیو دکھانے کے بعد پوچھا گیا یہ لوگ کس طرح کی حکومت کریں گے۔ کہا گیا کہ شراب نوشی اور بکنی پہننے پر پابندی ہوگی تو مصر میں سیاحت تباہ ہو جائے گی۔ خواتین، بچوں اور عیسائیوں کے حقوق غصب ہو جائیں گے۔ ''گھٹیا'' کا لفظ ہم نے تو صرف سنا ہے وہاں کے میڈیا نے عملاً اس کا مظاہرہ کیا۔

3 ہم دنیا کو امن کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ ہم ان تمام معاہدوں کی پابندی کریں گے جو مصر نے دنیا سے کیے ہیں۔ ہم دیگر ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور نہ ہم کسی کو اپنے معاملات میں مداخلت کرنے دیں گے۔

4 اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی، ہمارے قابلِ احترام شہداء اور زخمیوں نے قربانی دے کر قیمتی خون نہ بہایا ہوتا تو میں مصر کے پہلے منتخب صدر کے طور پر کبھی خطاب نہ کر پاتا۔ تمام شہداء کو سلام، ان شہداء کے وارثوں کو بھی سلام کہ ان کے پیاروں نے اپنی جانوں کو قربان کیا۔ تمام اعلیٰ مقاصد جن کے لیے قربانیاں دی گئیں، ان کے حصول تک انقلاب کا سفر جاری رہے گا۔

5 مصر کے تمام ججوں کو سراہا جانا چاہیے۔ میری ذمہ داری ہے کہ آنے والے کل عدالتیں اور ایگزیکٹو اپنے قانون سازی کے اختیارات سے الگ ہو کر آزادانہ کام کریں۔

6 میں اپنے فوجیوں سے محبت کرتا ہوں۔ جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لیے ان کے کردار اور خلوص کی تعریف کرتا ہوں۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اخوان اور مصری فوج کے تعلقات کی تاریخ

اخوان مصر کی ہی نہیں عرب دنیا کی سب سے طاقتور، منظم اور مؤثر جماعت چلی آرہی ہے۔ مصر کے سیاسی نظام پر فوج ہمیشہ سے غالب رہی ہے۔ کوئی منظم جماعت، گروپ یا تنظیم کبھی بھی فوجی پالیسی سازوں کو پسند نہیں آئی۔ چونکہ عام سویلین لوگ فوجی آمریت، طرزِ عمل اور احکامات کا انکار اس آسانی سے نہیں کرتے، جس بے خوفی سے منظم اور مؤثر اخوان کرتی آئی ہے۔ برطانیہ سے تعلقات کا مسئلہ ہو، نہر سویز کا یا آمرانہ اقدامات کا۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو فوج اور اخوان کے درمیان کشیدگی عروج پر پہنچی جب فوج نے پوری ریاستی قوت اور طاقت سے اخوان پر دھاوا بول دیا۔ اخوان کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ ۲۸ دسمبر کو مصری وزیراعظم پاشا کے قتل کا الزام بھی اخوان پر تھوپ کر کریک ڈاؤن کیا گیا۔ ۴ ہزار سے زائد اخوان جیلوں میں ٹھونس دیے گئے۔ اسی دوران ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو اخوان کے بانی امام حسن البنا کو سرِراہ گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ تب تک اخوان کے اراکین کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ ان کی دعوت اور پیغام آگ کی تیزی سے دلوں میں سرایت کر رہا تھا۔

''اسلام ہی مسئلے کا حل ہے۔'' اخوان اسی کو سلوگن بنا کر کام کر رہے تھے۔ اس مقبولیت سے شاہ فاروق بُری طرح ہراساں تھا، اسرائیل کے ساتھ جنگ میں اخوان کا بھرپور حصہ اور اس کے رضاکاروں کی شجاعت اور

"نحن آل فرعون"

مصری مسلح افواج کے بارے میں محمد مرسی نے بہت نپی تلی بات کی۔ یہ وہ نازک مقام ہے جہاں تمام ترقی پذیر ممالک کی سیاسی لیڈرشپ کے پَر جلتے ہیں۔ مصری فوج کئی عشروں سے سیاسی فوائد سمیٹ رہی ہے۔ مصری تاریخ کے طویل ترین صدر بننے والے انور السادات اور اس کے قتل کے بعد بننے والے صدر حسنی مبارک کا تعلق بھی فوج سے تھا حتیٰ کہ حسنی مبارک کے آخری وزیراعظم، احمد محمد شفیق جسے شدید عوامی دباؤ پر صرف ۳۳ دن کی وزارت عظمیٰ کے بعد مستعفی ہونا پڑا تھا، فوج کے سینئر کمانڈر اور ایئر مارشل کے عہدے تک پہنچے تھے۔ نومبر ۲۰۱۱ء کو ہونے والے الیکشن میں وہ فوج ہی کے نمائندے تھے۔ اسی لیے پوری قوم کی رائے کے برعکس بہت کھل کر حسنی مبارک کو اپنا رول ماڈل کہتے تھے۔

یہ الگ بات ہے کہ حسنی مبارک کی باقیات ہونے کی وجہ سے ملک کی غالب اکثریت اس سے انتہا درجے کی نفرت کرتی تھی۔ نہ صرف فوج بلکہ فوج کی پشت پر موجود امریکی اور برطانوی حکومت بھی اسی کی سرپرستی کر رہی تھیں۔

احمد شفیق کو لبرل، روشن خیال اور سیکولر قوتوں کے ترجمان اور فوج کے فرنٹ مین کے طور پر ابھارا اور سامنے لایا گیا۔ جہاں مصر کے قبطی عیسائیوں نے اس کی الیکشن مہم میں جان ڈالے رکھی وہاں مصری وزارت داخلہ نے فوج کو ۹ لاکھ شناختی کارڈ فراہم کیے تاکہ احمد شفیق کے بیلٹ باکس بھرے جا سکیں۔

مصری میڈیا نے مرسی کو اقلیت دُشمن اور انتہاپسند ثابت کرنے کی پوری کوشش کی

الیکشن مہم کے دوران ہوا کے رُخ کو مرسی کے حق میں دیکھ کر ۱۴ جون کو آئینی عدالت کے ذریعے شدید وار کیا گیا اور ایوانِ زیریں کے ان انتخابات کو ہی کالعدم قرار دے دیا گیا جن میں اخوان المسلمین کی واضح اکثریت تھی۔ الزام یہ لگایا گیا کہ انتخابی قواعد کی رو سے ۱۶۶ سیٹوں پر پارٹی لسٹ کے فعال امیدوار نہیں ہونے چاہئیں، جبکہ منتخب ہونے والوں کی اکثریت فعال پارٹی ورکرز کی تھی۔ عدالت نے کہا اس سے آزاد امیدواروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ عین اس موقع پر کیا گیا جب رائے عامہ ایک واضح فیصلہ کرنے والی تھی۔ اسی پر بس نہیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.urdubooksfree.pk

کارناموں نے مصری حکومت، اسرائیل اور برطانیہ تینوں کو پریشان کر دیا تھا۔

"وطن" کو بُت بنا کر کام کرنے والی تنظیمیں اور حکومتیں جس عرب قوم پرستی کی لہر پر سوار، عوام پر حکمرانی کر رہی تھیں، اخوان کی دعوت نے وطنیت اور قوم پرستی کے بت کو بہت شدت سے متاثر کیا۔ دلائل و براہین سے اس کی ہوا نکال دی۔

۱۹۵۲ء میں قاہرہ میں حکومت کے خلاف عوامی احتجاج اور مظاہرے شروع ہوئے تو احتجاج کا رخ نائٹ کلبوں، ہوٹلوں اور جوا خانوں کی طرف ہو گیا۔ ۷۵۰ نائٹ کلب اور ہوٹل آتشزدگی کا شکار ہوئے۔ حکومت نے اس کا الزام بھی اخوان پر دھر دیا جبکہ وہ بحیثیت جماعت اور تنظیم اس طرح کی تخریبی سرگرمیوں پر نہ یقین رکھتی نہ عمل کرتی ہے۔ ۱۳ جنوری ۱۹۵۴ء کو اسے ایک بار پھر خلاف قانون قرار دے کر دفاتر بند کر دیے گئے۔ اخوان کا اخبار بھی اس بندش کی نظر ہوا۔

جمال عبدالناصر کی حکومت میں یہ اخوان پر سب سے زیادہ آزمائش والا وقت تھا۔ اس کی تمام لیڈرشپ، ہمدرد، کام کرنے والے، حتیٰ کہ کام لینے والے

کیا گیا۔ ۲۰ رجرنیلوں پر مشتمل سپریم کونسل آف آرمڈ فورسز نے ۱۵ رجون کو ایوانِ زیریں ہی کو تحلیل کر دیا۔ ۱۰۰ ارکنی دستور ساز کمیٹی بھی ختم کر دی گئی جس میں اراکین پارلیمنٹ کے علاوہ ۶ رجج، ۹ روکیل، آرمی، پولیس اور وزارت انصاف کے نمائندے شامل تھے۔ سپریم کونسل نے نہ صرف صدر کے اختیارات سلب کر لیے بلکہ خود ہی دستور سازی کے اختیارات بھی سنبھال لیے۔ قوم کو یہ بہت واضح پیغام تھا کہ فوجی جنتا کیا چاہتی ہے۔

صدارتی انتخاب کے پہلے راؤنڈ میں ٹرن آؤٹ ۴۳،۴ رفیصد تھا۔ ان فیصلوں کا الٹا اثر ہوا اور رن آف میں ٹرن آؤٹ ۸۵،۵۱ رفیصد تک پہنچ گیا۔ ۲۱ رجون کو سرکاری نتیجہ کا اعلان ہونا تھا اسے روک دیا گیا۔ محمد مرسی ۵۲ رفیصد ووٹ لے کر کامیاب ہو چکے تھے جو فوج کو کسی حالت میں قبول نہ تھے۔ نتائج کا اعلان رُکتے ہی پورے ملک میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ مبصرین کا خیال تھا کہ الجزائر کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں وہاں یہ تماشا ہو چکا تھا کہ جمہوری طور پر منتخب ہونے والی پارٹی کو اقتدار سونپنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

۱۹ رجون کو تحریر اسکوائر پر انسانوں کا ایک بار پھر ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جمع تھا۔ یہ تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ فوجی اسٹیبلشمنٹ کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ تب تک احمد شفیق کو دوبارہ گنتی میں بھی کامیاب کرانے کے تمام حربے ناکام ہو چکے تھے۔

لوگوں کے متوقع ردِعمل سے بچنے کے لیے ۲۳ رجون کو اعلان کر دیا گیا کہ الیکشن کمیشن ۲۴ رجون کو صدارتی الیکشن کے نتائج کا اعلان کر دے گا۔ محمد مرسی ۱۰ رلاکھ سے زائد ووٹوں کے فرق سے کامیاب قرار دے دیے گئے۔

یہ جیت کوئی معمولی جیت نہیں تھی۔ یہاں پاکستان میں بیٹھ کر آپ الیکشن مہم کی شدت اور جذبات کی حدت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ محمد مرسی کے مقابلے پر جو نعرہ لگتا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

محمد مرسی کے صدر منتخب ہونے پر مصری لوگ کسی نماز

بھی جیلوں کی زینت بنے۔ خواتین اور نوجوان لڑکیوں پر بھی مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ۴۰ سے ۵۰ رہزار تک اخوانی گرفتار ہوئے اور تعذیب و تشدد کا شکار بنے۔ سید قطب جیسے مفسرِ قرآن جنھوں نے تفسیر ''فی ظلال القرآن'' لکھی اور عبدالقادر عودہ جیسے جید دانشوروں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ اخوان کے مرشد عام (صدر، امیر) حسن الہضیبی کو ۳ رسال کی بامشقت قید کا حکم سنایا گیا۔ وہ جیل میں ہونے والے تشدد اور مسلط کردہ مشقت کی تاب نہ لاتے ہوئے ۸ رنومبر ۱۹۶۵ء کو شہید ہو گئے۔ سید قطب کو پھانسی ۲۹ راگست ۱۹۶۶ء کو دی گئی۔ اخوان پر آزمائش اور ابتلاء کا یہ بدترین دور تھا جو بہت طویل ثابت ہوا۔ زینب الغزالی کی کتاب پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ فوجی جنتا اپنے اقدامات کو چیلنج کرنے والوں سے کس حد تک انسانیت سوز سلوک کرنے تک جا سکتی ہے۔ اخوان کے نام اور کام کو ایک جرم بنا کر رکھ دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب انور السادات برسرِ اقتدار آیا تو اخوان کے کچھ لوگوں کو رہائی ملی مگر جلد ہی سادات بھی

ہے وہ ''نحن آل فرعون'' کا دعویٰ تھا۔ اس بلند آہنگ نعرے کی ایک پوری تاریخ ہے۔ ''ہم آل فرعون سے تعلق رکھتے ہیں'' کہنے والے فرعونِ مصر کی طرح جو موسیٰ کے خدا کے ہاتھوں بحیرۂ احمر میں ڈوب گیا تھا، اس بار خدا کے بندوں کے ووٹوں کے ڈھیر میں دفن ہو گئے۔

جس لمحے الیکشن کمیشن محمد مرسی عیسیٰ العیاط کے مصر کا پہلا عوامی صدر منتخب ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ ۱۹ر جون سے تحریر اسکوائر پر دھرنا دینے والے لاکھوں فرزندانِ توحید اللہ اکبر کے نعروں سے شکرانہ بجا لا رہے تھے۔ تکبیر کے نعرے مصر سے ہوتے ہوئے غزہ کی پٹی تک جا پہنچے تھے اور وہاں سے ٹویٹر، فیس بک پر اہلِ ایمان نے ایک دوسرے کو مبارک بادیں پوسٹ کرنا شروع کر دیں۔ مصر کے لاکھوں لوگ کسی نماز کے اوقات کے بناہی ربِ اعلیٰ کے حضور جھکے آنسوؤں سے سجدہ شکر کے کلمات ادا کر رہے تھے۔ سوشل میڈیا پر محمد مرسی اور جشنِ فتح کی تصاویر کا سیلاب آ گیا۔

۸۴ر سال سے خوشی تبدیلی اور کامیابی کو ترسے لوگ

۸۴ر سال سے خوشی کامیابی اور تبدیلی کو ترسے ہوئے لوگ اس اعلان کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے بہت زیادہ سمجھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے ان بیتے ۸۴ر سالوں میں جیلیں ان سے آباد رہیں۔ جہاں ان کے بھائی، بیٹے اور والدین قید و بند کی صعوبتوں کو برسوں برداشت کرتے رہے، اذیت کدوں کے عذابوں کو بھگتتے رہے۔ ان کی کئی نسلوں کی پھانسیوں، جان و مال اور عصمتوں کی قربانیوں کی داستانیں ہر طرف بکھری تھیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

> کے وقت کے بناہی ربِ اعلیٰ کے حضور جھک گئے

جمال عبدالناصر کے نقشِ قدم پر چل نکلا اور اخوان کا سخت دشمن بن گیا۔

سادات نے ۱۹۷۹ء میں اسرائیل کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ کا مشہور امن معاہدہ کیا تو مصر کے اندر اس کے خلاف شدید ردِعمل ہوا۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جب انور السادات فوجی دستوں سے سلامی لے رہا تھا، اُسی وقت ایک فوجی افسر خالد تنولی نے ٹینک سے اتر کر سٹیج پر سلامی لیتے صدر کو گولیوں سے بھون دیا۔ اس کا اخوان سے تعلق نہیں تھا مگر اخوان ایک بار پھر نشانہ بنائے گئے۔ حسنی مبارک صدر انور السادات کا نائب صدر تھا۔ صدر کی موت کے بعد وہ صدر بن گیا۔ آمریت کا دور طویل تو نہیں طویل تر ہو گیا۔

حسنی مبارک خود بھی فوجی تھا۔ فوج کی مدد سے اس نے ۳۰ر سال تک اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ یہ دور تھا جب اس نے جنرل طنطاوی کو فوج کا سربراہ بنایا اور وہ گزشتہ ۲۰ر سالوں سے مصری فوج کا سربراہ تھا جہاں اس کی ریٹائرمنٹ کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ ملک کا فوجی وزیرِ دفاع بھی تھا اور فوج بطور ادارہ حکومتی کاموں میں دخیل تھی۔

مُرسی میٹر

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے رضا کاروں نے اپنے طور پر محمد مرسی کی حکومت کو ۱۰۰ دن دیے ہیں اور ہر دن، ہر پہر کا حساب رکھ رہے ہیں۔ انھوں نے انٹرنیٹ پر ایک ''مُرسی میٹر'' متعارف کرایا ہے جو صدر کے کاموں اور فیصلوں پر روز ٹک ٹک کرتا ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

حلف اُٹھانے کے فوراً بعد صدر مُرسی صدارتی محل کے بجائے قاہرہ یونیورسٹی کے طلبہ کے پاس کیوں چلے گئے؟

ایک ایسے بوسیدہ اور بدبودار سیاسی نظام میں جو ۶۰ سال سے شخصی آمریتوں کو دوام بخشنے کے لیے کام کر رہا تھا، عوام کی فلاح و بہبود کے فیصلے کرنے کے راستے تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مُرسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے کہ میٹر بہت تیز چل رہا ہے۔ ورنہ ترکی ماڈل ان کے بہت کام آسکتا ہے۔

مُرسی کا سب سے بڑا ہتھیار نوجوان ہیں جو اس کے فیصلوں کے ناقد بھی ہیں اور مداح بھی۔ مخالفین کے پاس بھی نوجوان ہی ہراول دستہ ہیں۔ اس کو اس وقت جتنے محاذوں پر لڑنا پڑ رہا ہے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

آئی ایم ایف کے بورڈ کی چھٹیاں

مصر کی تباہ حال معیشت کی بحالی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ملک بجلی کی شدید کمی کا شکار ہے۔ قاہرہ کے نواحی شہروں اور بستیوں میں بجلی آٹھ آٹھ گھنٹوں کے لیے چلی جاتی ہے۔ ہمارا ریکارڈ تو ۲۲ رگھنٹوں سے زیادہ کا ہے۔ اس لیے ۸ رگھنٹے بہت تھوڑے لگ رہے ہیں۔ مصر میں ان دنوں ایک دلچسپ کیس کا بھی چرچا ہے۔ ایک خاتون نے عدالت میں طلاق کے لیے درخواست دی اور ایک انوکھی وجہ لکھی کہ میرا شوہر اپنا قصبہ چھوڑ کر قاہرہ جانے کو تیار نہیں۔ قصبے میں آٹھ آٹھ گھنٹے بجلی نہیں آتی۔ میری زندگی گرمی نے عذاب بنا دی ہے۔ میں اس آدمی کے ساتھ رہنے کے بجائے بجلی کی تلاش میں شہر جانا چاہتی ہوں۔

مصر نے آئی ایم ایف سے ۴ رارب ۸۰ رکروڑ کے قرضے کے لیے فنڈ کے سربراہ کرسٹین لاگارد سے رابطہ کیا ہے۔ قرضے کی منظوری دینے والا آئی ایم ایف کا بورڈ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں پر ہے اور وہ اکتوبر میں اجلاس کرے گا۔ تب تک قرضہ ملنے کا امکان نہیں۔ حالانکہ آئی ایم ایف ۳ رارب ۲۰ رکروڑ کا قرضہ پہلے بھی منظور کر چکا ہے، مگر صرف منظوری تو عوام کے مسائل کا حل نہیں۔ جب تک پیسے حکومتی خزانے میں آنہ جائیں کسی عوامی فلاح کے کام پر لگنے کا امکان نہیں۔ مُرسی ۲۳ رستمبر کو امریکا جا رہے ہیں۔ وہ مصر کے پہلے سول حکمران ہیں اور وہ بھی اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والے، جن سے امریکا کی کبھی نہیں بنی۔ صدر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں شرکت کریں گے۔ اوباما سے ملاقات ابھی تک تو طے نہیں۔ بہرحال ہیلری کلنٹن مصر کے دورے کے دوران ۴ رارب کے قرضے کی معافی کا اعلان کر چکی ہیں۔ عملاً اس اعلان کا بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ پیسے تو آ نہیں رہے۔ کانگریس نے حسنی مبارک کے دورِ حکومت میں ۳۰ رملین کی امداد کی منظوری دی ہوئی ہے اور یہ امداد بھی ابھی آنی باقی ہے۔

اب تک صرف سعودی عرب نے مصر کی اس مشکل کو

اخوان دھن کے پکے نکلے

حسنی مبارک کے دور میں اخوان نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے نئے اہداف کا تعین کیا اور سیاسی سرگرمیوں کو چھوڑ کر فلاحی کاموں پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اس پورے دور میں بھی سختیوں، گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا مگر اخوان بھی دھن کے پکے تھے، وہ ہسپتال کھولتے گئے، رفاہی ادارے بناتے گئے اور اسلام کی دعوت پر مبنی اپنا لٹریچر وسیع پیمانے پر تقسیم کرتے رہے۔ انھوں نے تجارتی ادارے بھی قائم کیے اور بہترین نتائج پیدا کیے۔ مجموعی طور پر اس دور میں عوامی سطح پر ان کا امیج بہت بدل گیا اور حکومتی اقدامات اور اعلانات کے باوجود عامۃ الناس تک ان کو رسائی مل گئی۔ اس کا پہلا اظہار ۲۰۰۰ء کے پارلیمانی انتخابات میں ہوا جب اخوان کے ۱۵ ارکان آزاد امیدوار کی حیثیت سے جیت کر پارلیمنٹ آ گئے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پہنچاتا ہے اور محمد مُرسی کے سعودی دورے کے موقع پر ۴۳۰ ملین ڈالر کی امداد کا اعلان ہی نہیں کیا بلکہ رقم بھجوا بھی دی ہے۔

ایسی صورت میں جب آپ کے پاس ترقیاتی کاموں کے علاوہ انقلابی اعلانات کے لیے بھی فنڈز کی شدید کمی ہو، لیڈرشپ کا اصل امتحان ہوتا ہے۔

محمد مُرسی نوجوانوں کو قوم کی خدمت اور اصلاح کے کاموں میں مصروف کر چکے ہیں تاکہ اخوان کی خدمت کا امیج اور بہتر ہو۔ روزمرہ کے حالات میں تبدیلی محسوس ہو۔ اخوان کے ہسپتالوں، فلاحی اداروں اور بزنس انٹرپرائز بھی جگہوں پر زیادہ سرگرمی سے خدمت کی جا رہی ہے کہ اس بے لوث اور مخلصانہ طرز زندگی نے ان کو مصری عوام کی پہلی ترجیح بنانا ہے۔

عدلیہ (ماضی کے آکٹوپس کا طاقتور بازو)

مصر کی عدلیہ، ماضی کے دونوں آمرانہ حکومتوں کے آکٹوپس، کا فوج کے بعد دوسرا طاقتور بازو رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ ۲۰۰۵ء کے الیکشن میں ججز نے بالعموم دھاندلی کی حوصلہ افزائی، نگرانی اور پشتی بانی کی۔ ابھی حال ہی میں انصاف کے وزیر کے طور پر شامل کیے جانے والے سابق جج احمد کی اس سلسلے کے زندہ گواہ ہیں وہ ججز کی ملک گیر ایسوسی ایشن (ججز کلب) کے سربراہ رہے، انھوں نے ججز کی طرف سے ووٹوں میں دھاندلی اور قانون کی تمام خلاف ورزیوں جو تب کی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے روا رکھی گئیں پر خوب کام کیا تھا۔ (خاص طور پر ۲۰۱۲ء کے الیکشن میں ہاشم الباسوسی کے ساتھ مل کر ووٹوں میں

ہیرا پھیری کرنے والے ججز کی ایک پوری فہرست تیار کی تھی)۔ نتیجے کے طور پر احمد مکی اور ہاشم البا سواسی دونوں کو اپنے ہی جج بھائیوں کی شکایت پر قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ انھوں نے ججز کی لسٹیں کیوں بنائیں؟ ۱۹۹۲ء میں جج احمد مکی نے اس ہڑتال کی بھی قیادت کی تھی جب ان کے ۲۰ ساتھی، ججز تو گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ہڑتال کے نتیجے میں ۳ ہفتے کے اندر ججز رہا ہو گئے اور انھیں فیئر تحقیقات کا حق مل گیا۔ جج احمد مکی کے بڑے بھائی محمود مکی جو پولیس میں خدمات سرانجام دینے کے بعد جج منتخب ہوئے تھے، ۱۹۸۰ء میں چلنے والی آزاد عدلیہ کی مہم کے بڑے مؤثر رہنما تھے۔ یہ تحریک ۰۶-۲۰۰۵ء میں اپنے عروج پر پہنچی۔ محمود مکی ان ججوں میں شامل تھے جنھوں نے ووٹوں کی ہیرا پھیری کا حصہ بننے سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ ان کے خلاف آواز بھی بلند کی تھی۔ انہی محمود مکی کو صدر مُرسی نے ۱۹۵۲ء کے بعد پہلی بار ملک کا سول نائب صدر بنا دیا ہے۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مُرسی کے خلاف اپوزیشن کا سب سے مؤثر ہتھیار ہو سکتے تھے مگر مُرسی نے ان کو اپنی ٹیم کا حصہ بنا لیا ہے۔ اسے آپ بصیرت کہیے، وژن کہیے یا سیاسی سوجھ بوجھ، مرسی نے اپنی ٹیم میں اخوان کے ممتاز اور معروف لوگوں کو شامل نہیں کیا بلکہ مؤثر طبقات کے مؤثر لوگوں کا انتخاب کیا ہے۔

عملی طور پر نائب صدر ملک کے صدر کا دایاں بازو اور سیکنڈ ان کمانڈ ہوتا ہے۔ فوج کے ہاتھوں زخم خوردہ نظام میں ایسے متحرک اور بہادر ساتھی سے صدر مُرسی کو بے حد تقویت ملے گی اور آنے والے دنوں میں وہ اس عدلیہ کے مقابل ہوں گے جس میں بہت سے ججز سیاسی تبدیلی کو اب تک ہضم نہیں کر پا رہے۔ یہ ایک عجب ستم ظریفی ہے کہ تیسری دنیا میں سرکار کے لیے کام کرنے والے، آمرانہ حکومتوں کے کل پرزے بن کر خدمات انجام دینے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ کسی دوسرے عوامی دور میں ان کو سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ پھر سے پرانے آقاؤں کے دور کی واپسی کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نت نئی افواہوں کا بازار ہی گرم نہیں کرتے نظام کے چلنے میں بار بار رکاوٹیں بھی کھڑی کرتے ہیں۔

محمد مُرسی نے پیش بندی کے لیے نامور قبطی مسیحی دانشور کیمیر مرقص، ماہر تعلیم باکینام الشرقاوی اور ادیبہ سکینہ فاد کو بھی اپنا خصوصی مشیر بنا کر بہت مضبوط پیغام دیا ہے کہ وہ ماضی کے آکٹوپس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

مصری سونامی (کانٹوں اور توقعات کا تاج)

اپنے سیاسی عروج کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے ہی بے دست و پا ہو جانے والے محمد مُرسی نے پہلے ۵۰ رروزوں میں جس رفتار سے مختلف محاذوں پر اپنے جھنڈے گاڑے ہیں مصری سونامی کے ان طوفانی فیصلوں نے دنیا کو فی الواقع حیران کر دیا ہے۔

پُرعزم مُرسی نے اپنے ۵۰ رروزوں میں یہ ضرور ثابت کر دیا ہے کہ مسلسل لگن اور محنت ہی نہیں قلب و نظر کی وسعت اور سوچ کی گہرائی ہی سیاسی معاملات میں کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔

مصر اس وقت اپنی پارلیمان کے بغیر ہے۔ دستور سازی جاری ہے اور نوجوان ایک ایک پل اس بے چینی اور بے قراری سے تبدیلی کے منتظر ہیں جو ان کی زندگیاں بدل دے۔ وہ التحریر اسکوائر میں ہفتوں اپنی زندگی داؤ پر لگا کر، اپنے کتنے ہی ساتھیوں کی جانوں کی قربانی دے کر جس تبدیلی اور قیادت کو لے کر آئے تھے، وہ توقعات اور مشکلات کے کانٹوں سے سجا تاج پہنے اس عالم میں آگے بڑھ رہی ہے کہ انھی کے ملک کے ہوشیار لوگ ان کے قدموں تلے سے اس سیڑھی کو ہی نکالنے اور انھیں گرانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

فوجی بالادستی کی اندھیری رات کا خاتمہ

۳ رجون ۲۰۱۲ء کا دن ایک لحاظ سے بہت تاریخی تھا کہ ۷۶ رسالہ فیلڈ مارشل طنطاوی اور فوج کے سپہ سالاروں نے مصر کی تاریخ میں پہلی بار کسی سویلین کو فوجی سیلوٹ کیا۔ یہ اعزاز محمد مُرسی کے حصے میں آیا۔

محمد مُرسی کو اپنی صدارت کے پہلے روز سے ہی فوج اور آئینی عدالت کے ڈیزائن کردہ تنے ہوئے رسے پر چلنا تھا۔ اختیارات کے بنا، ملٹری کونسل کے ماتحت، جس نے پارلیمنٹ کو صرف اس لیے تحلیل کر دیا تھا کہ اس میں محمد مُرسی کی پارٹی کے اراکین کی اکثریت تھی۔ صدر کے

> "محمد مرسی نے نہ صرف فوج کے سربراہ جنرل عنان بلکہ ۲۰ رسال سے ملک کے وزیرِ دفاع فیلڈ مارشل حسین طنطاوی کو بھی بہ یک جنبشِ قلم معزول کر کے ملکی اور غیر ملکی مبصرین کو حیران کر دیا۔ ان کا کہنا تھا "یہ اقدام قومی مفاد میں اٹھایا گیا ہے۔ اس کا مقصد کسی فرد کو ہدف بنانا نہیں، اس میں عوام اور قوم کا فائدہ ہے"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اختیارات سلب کر لیے گئے تھے اور اسے "مجبورِ محض" بنا کر رکھ دیا تھا۔ محمد مُرسی ایسا تابع فرمان صدر بن کر کیسے جی سکیں گے۔ یہی سب سے بڑا سوال تھا جو ملک کے اندر اور باہر موضوعِ بحث تھا۔

اپنے پس منظر اور شخصیت کی باڈی لینگویج کے حوالے سے محمد مُرسی کسی طور پر "عقاب" (Hawk) نہیں لگتے۔ اس لیے فوج کی بالادستی لمبی اندھیری رات کی طرح چلتی نظر آ رہی تھی۔

ایسے میں لوگوں کی توقعات کے برعکس محمد مرسی حقیقی تبدیلی کا نشان ہی نہیں اصل راہنما بھی بن کر سامنے آئے انھوں نے آتے ہی پارلیمنٹ کی بحالی کا اعلان کر کے تہلکہ مچا دیا۔

☆ فوج اور آئینی عدالت نے شدید مخالفت کی مگر انھوں نے پارلیمنٹ کا مختصر اجلاس بلوا لیا پھر فوجی کونسل کے سلب کردہ اختیارات ایک صدارتی حکم کے ذریعے واپس لے لیے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"محمد مُرسی کو اپنی صدارت کے پہلے روز سے ہی فوج اور آئینی عدالت کے ڈیزائن کردہ تنے ہوئے رسے پر چلنا تھا"

☆اسی دوران اچانک ایک ایسا فیصلہ سامنے آیا جس نے مصر کی ہی نہیں پوری دنیا کے تجزیہ نگاروں، کالم نگاروں، سیاسی صورت حال پر نظر رکھنے والوں کو حیران کر دیا۔

اس فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی لگتا تھا مصری عوام خوشی سے بے قابو ہو گئے۔ وہ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ان کے صدر نے وہ کام کر دکھایا تھا جو ان کے تصور سے بھی زیادہ تھا۔ حسنی مبارک کی سبکدوشی کے بعد جس طرح فوجی کونسل نے جبری طور پر اختیار سنبھال کر پورے ملک کو اپنی مرضی کے تابع کر لیا تھا اس سے نجات کا دور دور تک امکان نظر نہ آتا تھا۔ دنیا دم سادھے فوج کے ردِعمل کی منتظر تھی۔ عام گمان یہی تھا کہ کوئی دم جاتا ہے محمد مرسی صدارتی محل سے باہر ہوں گے اور فوج پوری قوت کے ساتھ حکمرانی کے سارے اداروں پر قابض ہو جائے گی۔

صدارتی ترجمان یاسر علی کی طرف سے جاری کردہ اعلامیہ میں بتایا گیا تھا کہ جنرل عبدالفتاح السیسی کو نیا فوجی سربراہ اور ملک کا وزیر دفاع مقرر کیا گیا ہے۔ فوجی کونسل میں یہ سب سے کم عمر جرنیل تھے۔ صرف ۵۷ سال کے۔ اس موقع پر صدر نے مسلح افواج کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''اس فیصلے کے بعد فوج قوم کے دفاع کے مقدس فریضے پر پوری طرح توجہ دے سکے گی۔''

اس کے ساتھ ہی صدر کے اختیارات کم کرنے والے آئینی حکم کو بھی منسوخ کر دیا۔

دنیا حیران رہ گئی جب فوج کی طرف سے فیلڈ مارشل طنطناوی، فوج کے چیف آف سٹاف جنرل سمیع عنان کی معزولی کے علاوہ فضائیہ اور بحریہ کے سربراہوں اور کمانڈروں کی تبدیلی پر فوج نے اجتماعی طور پر چپ سادھ لی اور اسے نئی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔

سی این این اور امریکی مبصرین کا پہلا تبصرہ تھا محمد مُرسی نے شیر کی سواری کر لی ہے۔ اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہر طرف تبصرے بکھرے ہوئے تھے جیسے:

☆ فوج صدمے کی حالت میں ہے۔
☆ فوج کیسے برداشت کرے گی؟
☆ یہ بہت بڑا جوا ہے۔
☆ یہ پاگل پن ہے جو مرسی نے کیا ہے۔
☆ طنطناوی ۲۰ رسال سے وزیر دفاع اور فوج کا سربراہ تھا۔

مبصرین اس بات کو بھولے ہوئے تھے کہ ۲۰ رسال سے فوج میں پروموشنیں رکی ہوئی تھیں۔ نائب پر جگہ خالی نہیں ہوگی تو نیچے سے لوگ کیسے اوپر آسکتے ہیں۔ طنطناوی کی عمر ۷۶ رسال ہو چکی تھی۔ وہ سرکاری نوکری کی عمر کی حد کو کب سے عبور کر چکے تھے مگر ان کو کوئی معزول کیسے کرتا؟

یہ جرات تو حسنی مبارک بھی نہ کر سکے۔ ۲۰ رکنی فوجی کونسل کے جرنیلوں کی عمروں کا اندازہ اس بات سے کریں کہ سب سے کم عمر جرنیل کی عمر ۵۷ رسال تھی جسے اب فوج کی سربراہی کا تاج پہنایا گیا ہے۔ ۶۰ رسال بعد ایک غیر فوجی صدر نے ملکی سیاست اور اقتدار پر مسلط فوجی غلبے کے نشان کو ہٹا دیا تھا۔

چند روز پہلے جب ایک سرحدی قصبے میں دہشت پسندوں کے حملے میں ۷ رفوجی جوان مارے گئے تو محمد مرسی نے فوری طور پر ملک کے انٹیلی جنس کے چیف کو برطرف کر دیا اور ساتھ ہی صوبے کے گورنر کو بھی۔ فوج کے لیے یہ بہت شدید جھٹکا تھا مگر بظاہر انھی کی دلداری اور حفاظت کے لیے تھا۔

مُرسی نے فوج کو حکم دیا کہ دہشت گردوں کے ٹھکانوں کو تہس نہس کر دیا جائے۔ جو حملہ آور بچ کر نکلے تھے انھیں اسرائیلی فوج نے بھون کر رکھ دیا۔ یہ سرحدی شہر دہشت گردوں کا بہت مضبوط گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ کریک ڈاؤن کے نتیجے میں بے شمار دہشت گرد مار دیے گئے اور ان کا گڑھ تباہ کر دیا گیا۔ مضبوط فیصلے کرنے والے صدر کا نیا امیج بن رہا ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جامعہ قاہرہ میں مرسی کی تقریر

جامعہ قاہرہ میں اپنی تقریر میں مصری صدر نے مسلح افواج سے بیرکوں میں چلے جانے کو کہا۔ آپ نے منتخب اداروں کو ازسرِنو بحال کرنے کا اعلان اور مصر کا نیا آئین تیار کرنے کا عزم ظاہر کیا، جس میں شہریوں کے حقوق کا تحفظ ہوگا اور اسلامی قوانین کے اجراء کی یقین دہانی کرائی گئی ہوگی۔ آپ نے فوجی سربراہ طنطناوی کی طرف سے ۲۰۱۱ء میں منتخب ہونے والی عوامی پارلیمنٹ کو کالعدم قرار دینے کے فیصلے کی مذمت کی اور اسے بحال کرنے کے احکام صادر کیے۔ یاد رہے کہ اس پارلیمنٹ کے ممبران کی اکثریت کا تعلق مرسی کی ایف جے پی اور دیگر اسلامی گروپوں سے ہے۔

مرسی کی پھونک کام کرگئی

محمد مرسی نے ایک بار پھر قوم کو سرپرائز دے دیا تھا۔ مسلم دنیا اور بالخصوص عرب ممالک کے فوجی جرنیلوں کی روایت یہ رہی ہے کہ اقتدار پر گرفت مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے آس پاس ایسے مضبوط حصار قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ جسے برسوں بلکہ عشروں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

مصری فوج کے جرنیلوں کی برطرفی پر بی بی سی کا دلچسپ تبصرہ تھا ’’فوجی جرنیلوں کا چراغ پھونکوں سے بجھایا نہ جائے گا۔‘‘ ۲۴ گھنٹے تک جب فوج نے ردعمل نہ دیا تو کہا گیا: ’’لگتا ہے صدر مرسی کی پھونک کام دکھا گئی ہے۔‘‘

فوجی جرنیلوں کی بظاہر ریٹائرمنٹ عملاً برطرفی تھی یہی تھی کہ فوج اخوان کو اپنے اقدامات کے ذریعے مشتعل کر رہی ہے تاکہ وہ الیکشن کا ہی بائیکاٹ کردیں مگر اخوان کے راہنماؤں نے فوج کے ساتھ محاذ آرائی اور بیان بازی سے مسلسل گریز کیا اور کسی بھی مرحلے پر فوجی اقدامات کو چیلنج کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا۔

وہ اتنا سادہ نہیں، جس قدر لگتا ہے

یہ محمد مرسی ہی تھا جس نے حلف کے پہلے روز ہی کہا ’’فوج اب اپنا اصل کام سنبھالے گی جو کہ ملک کے عوام اور اس کی سرحدوں کی نگہبانی کرنا ہے۔‘‘

تب اسے محض سیاسی بیان سمجھا گیا۔ نئے صدر کی طرف سے ایک بے ضرر اصولی گفتگو۔ اسی روز صدر نے کہا جس پارلیمان کو تحلیل کیا گیا وہ ایک منصفانہ اور شفاف

سی این این اور امریکی مبصرین کا پہلا تبصرہ تھا کہ
محمد مُرسی نے شیر کی سواری کرلی ہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جسے فوج نے اپنے نئے چیف آف سٹاف جنرل عبدالفتاح السیسی کے ساتھ ہی قبول کرلیا تھا۔

حسنی مبارک کی رخصتی کے بعد جنرل طنطاوی نے فوجی کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے عملاً ملک کے صدر کا منصب سنبھال لیا تھا۔ عالمی اور عوامی دباؤ کے باعث وہ انتخابات پر تو مجبور ہوئے مگر اخوان سے ازلی دشمنی کے باعث انھوں نے ہر ہر قدم پر روڑے اٹکائے بلکہ بی بی سی کے ایک مبصر کی رائے میں صاف سیاسی دودھ میں مینگنیاں ڈالنا ہرگز نہیں بھولے۔ انھوں نے صدارتی انتخابات کے مرحلے پر اس پارلیمان کو ہی تحلیل کردیا جس میں اخوان اور اسلام پسندوں کی پہلی بار اکثریت منتخب ہو کر آئی تھی۔

پھر صدارتی انتخاب کے دوسرے مرحلے سے پہلے صدر کے تمام اختیارات ہی سلب کرلیے اور عملاً صدر کو صرف نمائشی عہدہ بنا دیا۔ تجزیہ نگاروں کی رائے تب بھی انتخابات کے نتیجے میں بنی تھی اور اس پر ایک نئے جمہوری آئین سازی کے کام کے لیے اعتماد کیا گیا تھا۔

مشرق وسطیٰ کے معاملات پر گہری نظر رکھنے والے مبصر مغدی عبدالہادی کا اس موقع پر کہنا تھا ’’محمد مرسی کو فوج سے ایک انتہائی پیچیدہ رشتہ نبھانا ہے۔‘‘

اس کا کہنا تھا صدر حسنی مبارک کے عہد میں تعینات کیے گئے لوگ ہی تمام اہم حکومتی عہدوں پر فائز اور ان میں سے کئی صدر کے ساتھ کام کرنے پر تیار نہ ہوں گے مگر ان کے تجزیے پر کئی سوالیہ نشان لگ گئے، جب صدر نے پچھلی کابینہ میں کام کرنے والے ایک وزیر ہشام قندیل کو مصر کا وزیراعظم مقرر کردیا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ہشام کا تعلق نہ تو اخوان المسلمون سے تھا اور نہ ہی وہ پارلیمان میں الیکشن جیتنے والی محمد مرسی کی فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی کا رکن تھا۔ ہشام کی

شہرت بطور ایک ٹیکنوکریٹ کے تھی اور اس کا زیادہ وقت انجینئرنگ کے کاموں اور محکموں میں گزرا تھا۔ اسے حسنی مبارک کے بعد کمال الجنزوری کی عبوری حکومت میں پہلی بار وزیر بنایا گیا تھا۔ ہشام کی تقرری کے وقت مصری صدر نے کہا "ایک محبِ وطن اور غیر جانبدار شخصیت کا طویل مشاورت کے بعد تقرر عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسے شخص کا انتخاب تھا جو موجودہ حالات کو سنبھال سکے۔

صدر کی توہین کا قانون

پُرعزم صدر کے دن کا آغاز روز ایک نئے چیلنج سے ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر مصری صدر کا عہدہ بے حد حساس اور "پروٹیکٹڈ" ہے۔ ملک میں صدر پر تنقید پر سخت سزا کا قانون لاگو ہے۔

الدستور Al-Dustowr (لبرل وفد پارٹی کا ترجمان اخبار) کے مدیرِ اعلیٰ اسلام عفیفی پر ان دنوں کورٹ میں مختلف الزامات کے تحت ایک کیس چل رہا ہے ان الزامات میں "صدر کی توہین کرنا" بھی شامل ہے۔

Insulting the President is a Crime

عفیفی مُرسی کا ہی نہیں اخوان کا بھی شدید ناقد ہے۔ عدالت نے اسے ۱۶ ستمبر یعنی اگلی پیشی تک تحویل میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔ عدالتی رائے سامنے آنے کے فوراً بعد نائب صدر محمود مکی نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا صدر اس قانون کو جو صحافیوں کو قید کرنے کے حوالے سے لاگو ہے۔ پارلیمنٹ کی عدم موجودگی میں حاصل قانون سازی کی طاقت استعمال کرتے ہوئے ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

عفیفی پر افواہیں پھیلانے اور عوام کے مفاد کے خلاف کام کرنے کا بھی الزام ہے۔ کئی اور صحافیوں پر بھی ایسے ہی الزامات ہیں۔ ایک ٹی وی چینل کے ہینکر پر تو پاکستانی اینکرز سے بھی دو ہاتھ آگے جا کر صدر مُرسی کو مارنے کی ترغیب دینے کا بھی الزام ہے۔ یہ گفتگو اس نے اپنے پروگرام میں براہِ راست کی۔

عفیفی کا کیس عملاً "پریس کی آزادی" کا کیس بن گیا ہے۔ صحافیوں کا کہنا یہ ہے کہ صحافیوں کے لیے ایسا قانون ہونا ہی نہیں چاہیے کہ جس میں کیس کی سماعت کے دوران انھیں جیل بھجوانے کی بات ہو۔

عفیفی کے وکیل عادل رمضان نے کہا "ہمیں توقع ہی نہیں تھی کہ سفر کرنے سے یہ پہلے سے موجود پابندی کے بعد میرے موکل کو جیل بھی بھیج دیا جائے گا۔ یہ تو امتیازی سلوک ہوا۔

اخوان کے ایک رہنما محمود حیلطے نے جو پارلیمان کے رکن بھی رہے ہیں اس موقع پر خوب بات کہی۔ برسوں پرانے قوانین اب امتیازی لگنے لگے ہیں۔ ہم پر تو ہر قانون امتیازی بنا کر لاگو کیا گیا تھا اور ہم نے اس کو بھگتا۔ یہ موقع سکور کرنے کا نہیں ہے۔ ہم جمہوریت کی طرف جانے والے نازک دور سے گزر رہے ہیں تاکہ قانون کی ہر جگہ عمل داری ہو۔ ہم نے غیر معمولی اور امتیازی قوانین کی سزائیں دیکھی اور سہی ہیں، اس لیے اس تکلیف کو بھی سمجھتے ہیں لہٰذا چاہیے وہ ہمارے مخالفین کو ہی کیوں نہ پہنچے۔ لوگوں کو بھی اپنی ذمے داریاں سمجھنی چاہئیں۔ وہ اچھا کریں یا بُرا، اس کی جواب دہی بھی انھیں کو کرنا ہوگی۔ زندگی تو قانون کی حدود کے اندر ہی رہنی چاہیے۔"

الدستور اخبار کے مدیرِ اعلیٰ اسلام عفیفی کا کیس عملاً "پریس کی آزادی" کا کیس بن گیا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

سازشوں اور نقادوں سے بھرے ماحول میں مُرسی کا چھکا

اس مخالفانہ اور سازشوں بھرے ماحول میں ۳۰ رجون ۲۰۱۲ء کو صدر بننے والے محمد مُرسی نے ایک اور چھکا مارا اور آزادیٔ صحافت کے نام پر بولنے والوں کو اس وقت لاجواب کر دیا جب اپنے قانون سازی کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس قانون کو ہی ختم کر دیا جس کے مطابق پریس میڈیا سے متعلق شکایات پر سماعت کے دوران میڈیا سے متعلق لوگوں کو عارضی حراست میں رکھا جا سکتا ہے۔

رائٹرز کے نمائندے نے حیرت سے کہا ''صدر مُرسی نے اپنے مخالفین کا منہ بند کر دیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ صدر میڈیا میں اپنے مخالفین کا کریک ڈاؤن کرنے والے ہیں۔'' جس قانون کے خاتمے کا پچھلے ۳۰ ربرسوں میں مطالبہ نہ کیا گیا اور نہ توقع رکھی گئی، مُرسی نے اپنے پہلے ۵۰ دنوں میں ہی آرڈی نینس سے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ حالانکہ اس کا سب سے زیادہ فائدہ مُرسی کے نقادوں اور مخالفین کو ہونے والا ہے کیونکہ مرسی اور اس کی پارٹی بیٹنگ کریز پر ہے اور افواہوں، الزاموں، توقعات کے ٹوٹنے، ناکامی کے خدشوں کی ہر بال انہی کو کھیلنی ہے اور اب نوبال کہنے والا یا مسلسل باؤنسر پھینک کر دل و نگاہ کو زخمی کرنے سے روکنے والا کوئی آمرانہ قانون بھی موجود نہیں ہے۔

التحریر اسکوائر اور پاکستانی یوتھ

قاہرہ کے التحریر اسکوائر نے ایک لحاظ سے مصر کے ہائیڈ پارک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آئے دن مختلف الخیال نوجوانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں وہاں جمع ہوتی ہیں۔ اپنا اظہارِ خیال کرتی ہیں، نعرے لگاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ کسی بھی حکومت کے لیے یہ سب دیکھنا، سہنا آسان نہیں ہوتا۔ پہلے حسنی مبارک ہدف تھے تو ابھی

انقلاب ہائی جیک ہوگیا

۱۷ ردسمبر ۲۰۱۰ء کو تیونس میں محمد بوعزیزی کی خودسوزی سے شروع ہونے والی تحریک ۲۵ رجنوری ۲۰۱۱ء کو مصر کے التحریر اسکوائر میں پہنچ گئی۔ ۱۱ رفروری ۲۰۱۱ء کو اس انقلابی تحریک نے حسنی مبارک کو استعفا دینے پر مجبور کر دیا۔ اسی تحریک کے دوران میں ۸۴۶ رافراد جاں بحق جبکہ ۶۴۶۷ رزخمی ہوئے۔ ۱۲ رہزار سے زیادہ گرفتار ہوئے۔ حسنی مبارک کے بعد بھی ۳۰۰ رسے زائد افراد کا خون بہہ چکا۔ مظاہرین پر گولی چلانے اور مارنے کے احکام دینے پر حسنی مبارک کو عمر قید کی سزا سنائی جا چکی تھی۔

۵۰ روز بھی مکمل نہ کر پانے والے صدر مُرسی بھی ان مظاہرین کا نشانہ بننا شروع ہو گئے ہیں۔ ان کا نعرہ ہوتا ہے ''چہرے نہیں نظام کو بدلو۔''

''چارلس سینات'' دنیا کا ایک جانا مانا ٹی وی رپورٹر ہے۔ اس نے التحریر اسکوائر سے واپسی پر مصری انقلاب اور اس کے پس پردہ نوجوانوں کے اصل کردار سے پردہ اٹھایا ہے۔ یاد رہے، مصری سونامی نوجوانوں ہی کی وجہ سے برپا ہوا۔ بڑی عمر کے لوگ اور تجربہ کار سیاسی راہنما اور جماعتیں تو بہت بعد میں شامل ہوئیں۔

پاکستان کے معروضی حالات میں ایک ملین ڈالر کا سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی نوجوان مصر کی طرح تبدیلی اور انقلاب کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں؟

التحریر اسکوائر کے نوجوانوں کا تو بہت دنوں تک کوئی راہنما ہی نہیں تھا کہ جس کے اپنے کردار کی چھان بین شروع ہو جاتی اور ساری توجہ کا رخ تبدیلی کی بجائے تبدیلی کے نشان کی غلطیوں اور گناہوں کی نشان دہی کی طرف ہو جاتا۔

التحریر اسکوائر میں تبدیلی کے لیے جانیں ہتھیلی پر رکھ کر آنے والے نوجوانوں کی اوسط عمر ۲۰ رسال تھی۔ یہ

اخوان کی یوتھ میں اتنا صبر کیسے آیا کہ وہ کامیابی کے بعد بھی انتقام پر نہیں اُترے

سوشل میڈیا کے دیوانے اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ کے علاوہ عام یوتھ سے تعلق رکھتے تھے۔ غصے سے بھرے ہوئے، خوشی اور تبدیلی کو ترسے ہوئے۔ ان کو فوج کی گولیاں، پولیس کی گالیاں، لاٹھی چارج کی چوٹیں، پانی کی کاٹ دینے والی تیز دھاریں، کئی کئی پہروں کی بھوک، جلتی دھوپ، برتی بارشیں کچھ بھی ان کے عزم کی راہ میں کھڑی نہ ہو سکیں۔

چارلس سینات نے ایک دلچسپ اور حیران کن تجزیہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ اخوان المسلمون ایک سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ وہ ایک سوشل موومنٹ کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کا حوصلہ دیکھیں کہ وہ انقلاب لانے اور اس کے پیچھے

نومبر ۲۰۱۱ء تا جنوری ۲۰۱۲ء، مصر کے ایوان زیریں و ایوان بالا کے انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ۳۰ راپریل ۲۰۱۱ء کو اخوان المسلمون نے ''فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی'' (ایف جے پی) قائم کی اور محمد مُرسی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ایوان زیریں میں ایف جے پی نے ۲ء۴۷ رفیصد نمائندگی حاصل کی، دوسرے نمبر پر سلفی اسلامی جماعت ''النور پارٹی'' رہی جس نے ۷ء۲۴ رفیصد نمائندگی حاصل کی۔ اسلام پسندوں نے مجموعی طور پر ۵ء۷۲ رفیصد نمائندگی حاصل کر لی۔ ایوان بالا میں ایف جے پی کو ۴۸ اور النور پارٹی کو ۲۸ رفیصد نمائندگی ملی۔ امریکا و اسرائیل اور مصر کے ''حسن آل فرعون'' کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ وہ اور ان کا میڈیا چیخنے لگا کہ انقلاب ہائی جیک ہو گیا ہے۔ اب ان کی ساری امیدیں صدارتی انتخاب سے وابستہ ہو گئیں کہ ایف جے پی نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے مگر حالات نے انھیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ایف جے پی نے خیرات الشاطر کو صدارتی امیدوار اور محمد مُرسی کو ان کے متبادل امیدوار کے طور پر نامزد کیا۔ خیرات الشاطر نااہل قرار دے دیے گئے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

روکر اصل قوت متحرکہ ہونے کا کریڈٹ بھی نہیں لیتے حالانکہ التحریر اسکوائر میں جب تک اخوان نہیں آئے تھے، اس کی کوئی شکل ہی نہیں نکل رہی تھی۔ انھوں نے آتے ہی زخمیوں کے لیے میڈیکل کیمپ قائم کر دیے۔ وہاں دھرنا دینے والوں کے لیے کھانے کے انتظامات کیے اور سب سے بڑھ کر حسنی مبارک کے حامیوں کے التحریر چوک میں آکر فساد کرنے اور لوگوں کو ڈسٹرب کرنے سے روکنے کا ایسا فول پروف انتظام کیا کہ کوئی دوسرا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے گیٹ نہیں باقاعدہ چوکیاں قائم کر دیں۔

اب اخوان صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم مصر کو بدلنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اچھے مسلمانوں کے طور پر جی سکیں۔ ہم شریعت کی حکمرانی اور عمل داری چاہتے ہیں تاکہ اچھے مسلمان بن کر جینے میں مدد مل سکے۔

اخوان کی یوتھ میں اتنا صبر کیسے آیا کہ وہ اتنی بڑی کامیابی کے بعد بھی انتقام پر نہیں اترے۔ انھوں نے سسٹم اور اس کی خرابیوں اور اس کی مضبوطیوں کو سمجھنے میں بہت وقت لیا ہے۔ انھوں نے اپنے مخالفین کے دل جیتنے اور ان کو ساتھ لے کر چلنے کا گُر سیکھ لیا ہے جبھی تو انتہاپسند سلفی پارٹی سے لے کر قبطی عیسائیوں تک کی قیادت اخوان کے ساتھ چل رہی ہے۔

پاکستانی یوتھ کے سوچنے اور سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اخوان کے اپنے کل ۶/لاکھ ممبر ہیں مگر اسے ووٹ ایک کروڑ ۳۳/لاکھ ملے ہیں۔ یہ ووٹ پارٹی ممبرز کے نہیں بلکہ ان عام لوگوں کے ہیں جنھوں نے مصری سونامی کی قیادت، ان کی سوچ اور پروگرام پر اعتماد کیا۔ وہ ۶۰/سال سے موجود آمرانہ نظام کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکنے کے نعرے لگاتے ہیں۔ ہر پرانے چہرے سے نفرت کا اعلان اور اظہار کرتے ہیں۔ جلوسوں اور جلسوں میں ان کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نعرے لگانے کا منظر بہت دیدنی ہوتا ہے۔ لگتا ہے وہ بے حال ہو کر ابھی تبدیلی کے لیے جان دے دیں گے۔ مگر ان کے قائدین سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی پالیسی اپنا رہے ہیں۔ ان کا اپنا واضح ایجنڈا ہے مگر وہ لوگوں کو کاٹ کر پھینکنے کی پالیسی پر نہیں جوڑنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

پاکستانی یوتھ کو ابھی یہ سب سمجھنے میں بہت وقت لگے گا وہ اپنے آس پاس موجود سیاسی پارٹیوں سے نہیں بلکہ ان کے سربراہوں کی محبت اور نفرت میں گرفتار ہیں۔ ان کی تنقید کا نشانہ ابھی تک نظام نہیں شخصیات ہیں اور عجب بات یہ ہے کہ شخصیات بھی وہ جو اقتدار میں نہیں۔

صاحبانِ اقتدار یا وہ چہرے جو اس بوسیدہ نظام کے محافظ ہیں ابھی تک پاکستانی یوتھ کا ہدف ہی نہیں ٹھہرے۔ پاکستان میں تبدیلی کی دعوے دار ۳ر جماعتیں اور ان کی یوتھ ہے۔ ایم کیو ایم، مگر وہ گزشتہ ۲۵ر سال سے اقتدار کا حصہ ہے۔ صرف بیانات میں تبدیلی چاہتے ہیں ورنہ وہ ''سٹیٹس کو'' کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ ان کی یوتھ صرف ٹیلی فونک خطاب سننے، بڑے بڑے جلسوں میں شریک ہونے کے علاوہ ووٹ ڈلوانے اور شہر کو کنٹرول کرنے کے لیے قائم سیکٹروں کے نظام کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی ہے۔ ایم کیو ایم کے پاس یوتھ کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اگر وہ اپنا پروگرام اور امیج بہتر بنالیں تو آنے والے دنوں میں وہ بھی تبدیلی کا نشان بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دوسرے نمبر پر تبدیلی کے شدید خواہش مند جماعت اسلامی کے نوجوان ہیں۔ مگر عوامی اور سیاسی سطح پر ان کی شنوائی نہیں ہے۔ وہ معمول کی چھوٹی چھوٹی میٹنگز، لٹریچر، پوسٹرز، سٹکرز کی تقسیم تک محدود ہیں۔ ان کی باتیں اگر عوام کی سمجھ میں آتی بھی ہیں تو عوامی پذیرائی نہیں ہے۔

اخوان کی ابتداء

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مارچ ۱۹۲۸ء میں ''اسماعیلیہ'' میں ''اخوان المسلمون'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ابتدا میں یہ جماعت صرف ۶ر افراد پر مشتمل تھی۔ ابتدائی ۵ر سال اس جماعت نے خاموشی سے کام کرتے گزارے۔ اس جماعت کا مرکز ''مسجد'' تھی اور اس کا مشن ''پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ دینا'' تھا۔ خود حسن البناء اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جماعت کے کارکنوں نے کوئی قصبہ اور بستی ایسی نہ چھوڑی جہاں وہ پہنچے نہ ہوں۔ مسجدوں میں، گھروں اور چوپالوں حتیٰ کہ شراب خانوں میں جا کر انھوں نے دعوت پھیلائی۔''

حق اور نور کی یہ دعوت مسلسل پھیلتی گئی۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء تک یہ تحریک ''اسلامی نظریہ حیات'' بن کر ابھرتی چلی گئی اور عوام نے اس تحریک کا مکمل تعارف حاصل کرلیا حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں اخوان نے ''سیاست'' میں قدم رکھا اور حکومت وقت نے اس پر وار کرنا شروع کردیے۔ یہ بہت آزمائش کا دور تھا، اس کے بعد ۱۹۴۶ء سے اخوان المسلمون پر جبر و تشدد اور ظلم کے پہاڑ توڑے گئے اور تحریک کے بانی ''امام حسن البناء'' کی شہادت ہوئی۔

ابتلاء آزمائش کی سخت تکلیف دہ گھڑیوں کا احوال، مصر کے ظالم فرماں روا ''جمال عبدالناصر'' کے قریبی ساتھی احمد ابوالفتح نے یوں بیان کیا ''یہاں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو جیلوں کے اندر خاموشی کے ساتھ موت کی نیند سو گئے ہیں اور کسی کو ان کی موت کی خبر نہیں ہوسکی۔ طرہ جیل کا حادثہ خوب مشہور ہوچکا ہے۔ یہ حادثہ یکم جون کو پیش آیا۔ اس میں ۲۱ر آدمیوں کو جیل کے اندر بیک وقت گولی سے اڑا دیا گیا تھا کیونکہ انھوں نے اس سرکاری حکم کے خلاف احتجاجاً مشقت کرنے سے انکار کرکے، ہڑتال کردی تھی جس کی رو سے ان قیدیوں کو رشتے داروں سے ملاقات کرنے سے محروم کردیا گیا تھا۔''

(بحوالہ کتاب ''اخوان المسلمون'' تصنیف حسن البناء شہید، مترجم: مولانا خلیل احمد الحامدی)

وہ کسی بھی التحریر اسکوائر کو کنٹرول کرنے کے لائق ہیں مگر سوال یہ ہے کہ التحریر اسکوائر میں جمع ہونے والے وہ ہزاروں لاکھوں نوجوان آئیں گے کہاں سے؟ جماعت اسلامی کی پوری قیادت نیک دل بزرگوں کی قیادت ہے۔ عوام سے دور اور عوامی مسائل اور سوچ سے کافی دور۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی دعوت پکی ہے اس لیے سب کو ان کے ساتھ ہونا چاہیے، مگر عوام ان کو درست سمجھتے ہوئے ووٹ بھی دیں گے اور ان کے ساتھ کھڑے بھی ہوں گے، یہ کہنا بہت مشکل ہے کیونکہ عوام انھیں اپنی سیاسی قیادت کا حق دینے پر ابھی تیار نہیں۔ ممکن ہے آنے والے سالوں میں جماعت کی یوتھ کی سوچ غالب آجائے اور جماعت ایک سیاسی جماعت کے بجائے سوشل موومنٹ بن جائے۔ اپنی خدمت، مہارت، دیانت کے سحر سے عام لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیں تو یقیناً وہ تبدیلی کے لیے کسی مہم کے رہنما ہو سکتے ہیں۔ ابھی نہیں۔

تبدیلی کی تیسری خواہش مند جماعت تحریک انصاف ہے جس کی یوتھ کو ابھی تک عوامی خدمت یا رابطوں کا موقع میسر نہیں آیا۔ ایک بہت بڑی تعداد میں سوشل میڈیا اور

”

اب وقت آگیا ہے کہ تبدیلی کے پاکستانی دعوے داروں اور خواہش مندوں کو بھی اپنا اپنا ”مُرسی میٹر“ چلانا چاہیے کہ وہ پہلے ۱۰۰ دن میں اس قوم کو کیا دے سکتے ہیں۔ یاد رہے، ”ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے“ اس میٹر پر نہیں پڑھا جا سکتا۔ تبدیلی نظر آنے والی چیز ہے۔ میٹر بھی اسی کو پڑھ سکے گا اور قوم کو بھی یہی سمجھ آتا ہے جیسا کہ مصر میں ہو رہا ہے

“

تعلیمی اداروں میں قائم نیٹ ورک سے یوتھ موٹی ویٹ ضرور ہوئی ہے مگر انھیں روزانہ اپنے قائد اور دیگر پارٹی قائدین کی صفائیاں دینے کے کام سے ہی فرصت نہیں مل رہی۔ اس یوتھ سے جلسے جلوسوں کے علاوہ بھی کوئی بڑا کام لینا ہوگا۔ خود عمران خان کے پاس بھی ابھی کوئی واضح پروگرام نہیں ہے جو اس یوتھ کو کام پر لگائے۔ نتیجتاً پریس کانفرنسوں، پروگراموں میں یوتھ آپس میں اُلجھ رہی ہے۔ عہدوں پر لڑ رہی ہے۔ نئے آنے والوں پر شدید اعتراضات اُٹھا رہی ہے۔ ایک جلسہ کامیاب ہونے سے وہ بہت خوش تھے مگر سیاسی بصیرت کی کمی کے باعث نہیں جانتے کہ تبدیلی ایک جلسے سے نہیں آتی۔ انھیں خود بھی تبدیلی نظر نہیں آتی اس لیے اس یوتھ کا غصہ کالم نگاروں پر گالیوں اور سوشل میڈیا پر الزاموں کی صورت بہہ رہا ہے چونکہ ابھی تک ان کے سامنے کوئی واضح ہدف نہیں ہے۔ کوئی بڑا پروگرام نہیں ہے، اس لیے نئے آنے والوں کے لیے آمادگی تک نہیں ہے۔ اختلاف کرنے والوں کو ملیامیٹ کرنے کا جنونی جذبہ ان کی ابتدائی کامیابی کو بھی کھائے جا رہا ہے۔

کیا یہ یوتھ کوئی التحریر اسکوائر برپا کر سکتی ہے۔ ابھی تک کے مشاہدے کے نتیجے میں تو جواب ہاں میں نہیں ہے..... تحریک انصاف کو اس طرف بہت سنجیدگی سے متوجہ ہونے کی ضرورت ہے کہ ان کے نوجوانوں میں ٹھہراؤ، برداشت اور خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ لمحہ موجود میں تحریک انصاف کے نوجوان تحریک برپا کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں مگر اسے سنبھالنا، Sustain کرنا اور نتیجہ خیز بنانا، بہت بڑا چیلنج ہے۔ انھیں اسے سمجھنا ہوگا۔ یہ کام ان سے اکیلے نہ ہو سکے گا۔ اب تو تجزیہ نگاروں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اگلے الیکشن میں تبدیلی اور کامیابی تو دور رہی اس شعر کا سا معاملہ ہونے والا ہے۔

لڑتے لڑتے ہو گئی گم
ایک کی چونچ اور ایک کی دُم

پاکستانی یوتھ اپنے آس پاس موجود سیاسی پارٹیوں نہیں بلکہ اُن کے سربراہوں کی محبت اور نفرت میں گرفتار ہے۔ ان کی تنقید کا نشانہ ابھی تک نظام نہیں شخصیات ہیں اور عجب بات یہ ہے کہ شخصیات بھی وہ جو اقتدار میں نہیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مصری سونامی کا قائد، امید اور توجہ کا مرکز

منصب صدارت پر فائز، مصری سونامی کے اس قائد کو سمجھنے میں ان کے مخالفوں نے بڑی بھول کی ہے، جیسے جیسے اس کی شخصیت کے پرت کھل رہے ہیں محمد مُرسی کے رنگ لوگوں کو اور بھا رہے ہیں۔

پچھلے دنوں وزارتِ داخلہ کے ہیڈکوارٹر کے دورے پر گئے تو بڑے بڑے افسران خیرمقدم کے لیے قطار بنا کر کھڑے تھے۔ وزیر داخلہ ایک ایک افسر سے صدر کو متعارف کرا رہے تھے۔ ایک افسر کے سامنے پہنچ کر وزیر داخلہ نے کہا ''یہ بریگیڈیئر ابراہیم شربینی ہے۔'' صدر یہ سن کر مسکرا دیے۔ بولے ''میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ رات ۲/ بجے یہ میرے گھر سے مجھے گرفتار کر کے لائے تھے اور ان کے ساتھ کھڑے ۲/ افسران اور بھی تھے۔'' پھر صدر نے وقفہ دیا اور مسکرا کر بولے ''وہ دونوں بھی تو ان کے ساتھ ہی کھڑے ہیں۔''

تربیتی نظام کے ۳/اُصول

اخوان المسلمون نے جو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیے اور ادوارِ فراعنہ میں قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔ اس کے پیچھے ان کی زبردست تربیت اور ٹریننگ کارفرما تھی۔ ان کے تربیتی نظام کا پہلا اصول ''ربانیت'' کا شعور حاصل کرنا اور دوسرا سنہرا اُصول ''مادہ پرستی اور دُنیاوی خواہشات سے نجات کا حصول'' تیسرا اصول ''شہرت اور ناموری سے گریز۔'' یہ حدیثِ نبویؐ ان کے نصاب کا حصہ تھی:

''خوش نصیب ہے وہ مجاہد جو اللہ کی راہ میں گھوڑے کی لگام پکڑتا ہے۔ اس کے سر کے بال ژولیدہ اور قدم غبار آلود ہوتے ہیں۔ اگر اسے محافظوں میں شامل کر دیا جائے تو اسے کوئی بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی اور اگر اسے فوج کے پچھلے دستے میں رکھ دیا جائے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔''

عبادات، ذکر اذکار، مسنون دعائیں، تہجد گزاری، قیام اللیل ان کے کارکنان کی روحانی غذا تھی جبکہ کوششوں کو صحیح سمت میں رکھنے کے لیے ''حسن البنا شہید'' فرمایا کرتے ''اپنے دلوں میں اسلامی حکومت قائم کرلو، تمھاری سرزمین پر بھی قائم ہو جائے گی۔''

اخلاقی تربیت کے ساتھ، جسمانی تربیت، ورزش، کھیلوں اور مجاہدانہ طریق کار کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ اخوان نے اسکاؤٹنگ، شوٹنگ، فوجی و کشتی سپہ گری کی ٹیمیں تیار کرنے پر بھی خصوصی توجہ رکھی۔ بلاشبہ یہ تربیت، جہاد زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ تربیت کا ایک پہلو جو اخوان المسلمون کی مضبوطی کردار میں سب سے نمایاں ہے وہ ان کی ''باہمی اخوت اور بھائی چارہ'' ہے۔ امام حسن البنا فرمایا کرتے تھے ''بھائی چارے سے مراد یہ ہے کہ ہم محض رشتے وعقیدے کی بنیاد پر باہم ایک جان دو قالب ہو جائیں۔'' اور یہ آیت پڑھتے: ترجمہ ''اور جو اپنے دل کی تنگی سے بچ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (سورۃ تغابن:۱۶)

کسی صحافی نے اخوان کے آپس کے تعلقات کو قابلِ رشک پایا تو پکار اٹھا ''یہ وہ جماعت ہے جس کے کسی کارکن کو اسکندریہ میں چھینک آئے تو ''اسوان'' تک یرحمک اللہ کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔'' باہمی اخوت ومحبت کا یہ جذبہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور اذیت خانوں میں بھی دیکھا گیا۔

PAKISTANVIRTUALLIBRARY www.pdfbooksfree.pk

سب لوگ یہ بات سن کر بے اختیار ہنس دیے۔ وہ جان گئے تھے کہ یہ بات کہنے کے لیے معاف کرنے والا ایک بڑا دل چاہیے جو ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ عوامی طاقت کی پشت پناہی، بصیرت، تیز نگاہ اور اپنے اہداف پر پوری نگاہ رکھنے والے محمد مرسی تنقید کے پتھروں سے پیدا ہونے والی لہروں سے پریشان نہیں ہیں۔ وہ ہر چھوٹے بڑے امتحان میں کھرے ثابت ہو رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس اختیار واقتدار کے علاوہ بھی کچھ ہے جس سے باقی حکمران محروم ہوتے ہیں۔ ابھی تو گزشتہ دنوں جامع ازہر کے باہر جب ایک عورت نے ان کے قریب آ کر ایک تحفہ دینا چاہا تو پولیس افسر نے روکتے ہوئے پوچھا ''اتنے بڑے صدر کو تم قرآن کا یہ نسخہ کیوں دینا چاہتی ہو؟'' اس عورت نے معصومیت سے کہا ''میرے ۲ بیٹوں کی شہادت کے بعد مایوسی سے بھری زندگی میں اس قرآن کے بعد تمھارا یہ صدر ہی میری واحد امید ہے۔ میں اپنی امید کو وہ کتاب دینا چاہتی ہوں جو دنیا کے سارے مایوس لوگوں کی رہنما اور قوت ہے۔ یہ بھی تھکنے اور رُکنے نہیں دیتی۔ مُرسی میٹر چل رہا ہے۔ یہ آنے والا وقت ہی گواہی دے گا کہ صدر مرسی نوجوانوں کی توقعات پر کتنا پورا اُتر سکے گا۔ پُرعزم صدر کے فیصلوں میں تو ایک واضح مستقبل کے اشارے پنہاں ہیں۔

■

اپنے عہد کے
اُس بہترین شخص کا دلگداز تذکرہ
جو رشتوں کا پاس رکھنے اور نیکیوں کو انجام دینے والا تھا

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب

اللہ اور اُس کے رسول کا شیر کا لقب انہی کو عطا ہوا تھا

خالد محمد خالد / ارشاد الرحمن

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اہلِ مکہ عبادت و ریاضت، محنت و مشقت اور کھیل کود کی تھکاوٹ کے باعث نیند میں غرق تھے اور قریش بے ہوشی کی نیند میں بستروں پر پہلو بدل رہے تھے مگر ایک شخص تھا کہ اُس کا پہلو بستر سے نہیں لگ رہا تھا۔ وہ رات کو جلد بستر پر دراز ہو جاتا، کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انتہائی شوق و رغبت کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوتا کیونکہ اس نے اللہ سے ایک عہد کر رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جائے نماز پر کھڑا ہوتا اور اپنے رب سے دعا و مناجات کرنے لگتا، اس کی بیوی جب بھی اس کے دل سے گریہ و زاری کی سنسناہٹ سنتی تو جاگ اٹھتی۔ اُسے شوہر پر ترس آنے لگتا، وہ اسے کہتی کہ اپنے آپ پر رحم کھاؤ اور نیند بھی لے لیا کرو۔ شوہر جواب دینے لگتا تو منہ سے الفاظ نکلنے سے قبل آنکھوں سے آنسو بہہ پڑتے۔ وہ کہتا ''خدیجہ! سونے کا وقت گزر گیا ہے۔''

یہ اس وقت کی بات ہے جب محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو دیکھ کر قریش کے کان کھڑے ہو گئے تھے لیکن ابھی ان کی نیندیں نہیں اُڑی تھیں۔ یہ دور آپ کی دعوت کا بالکل ابتدائی دور تھا، اور آپ انتہائی خفیہ اور رازداری کے انداز میں دعوت پیش کر رہے تھے۔ اس وقت جو لوگ آپ پر ایمان لائے تھے ان کی تعداد انتہائی کم تھی۔ آپ پر ایمان نہ لانے والوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو آپ سے انتہائی محبت رکھتا تھا اور آپ کو بہت زیادہ عزت و احترام دیتا تھا۔ پھر یہ شخص آپ پر ایمان لانے اور آپ کے مبارک قافلے میں شریک ہونے کے لیے ذوق و شوق سے آگے بڑھتا ہے تو معاشرہ و ماحول کا مزاج اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے نہ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اس کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ اسے مشرق میں ہونے والی باتیں تردد میں ڈالتی ہیں نہ مغرب میں ہونے والا پروپیگنڈا شکوک و شبہات سے دوچار کرتا ہے۔

یہ شخص آپؐ کے چچا اور دودھ شریک بھائی حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب تھے۔

حضرت حمزہؓ اپنے بھتیجے کی عظمت و کمال سے بخوبی آگاہ تھے۔ بھتیجے کے معاملے کی حقیقت اور اس کے خصائل کی عمدگی بھی ان کے اوپر روزِ روشن کی طرح واضح تھی، وہ آپؐ کو محض بھائی کا بیٹا ہونے کے ناتے ہی سے نہیں جانتے تھے بلکہ آپؐ کو بھائی اور دوست کی حیثیت سے بھی پہچانتے تھے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپؓ ایک ہی دور میں پیدا ہوئے تھے اور ہم عمر تھے۔ بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ بھائی بھائی کی حیثیت سے اٹھے بیٹھے تھے اور شروع ہی سے ایک راہ پر چلتے رہے تھے۔ البتہ..... ان میں سے ہر کسی کی جوانی اپنے اپنے ڈھب پر گزری تھی۔ حضرت حمزہؓ طیبات و مرغوبات زندگی کے حصول میں اپنے ساتھیوں کی راہ پر چل پڑے اور زعمائے مکہ اور ساداتِ قریش میں اپنا مقام بنانے میں مصروف ہو گئے جبکہ حضرت محمد ﷺ اپنے قلب و روح کی روشنیوں میں گم ہو گئے جس نے آپؐ کے سامنے اللہ کی راہ روشن کیا اور آپؐ زندگی کی رونقوں سے کنارہ کش ہو کر غور و فکر اور ملاقاتِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو گئے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ان دونوں جوانوں میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے سے مختلف سمت میں سفر شروع کر دیا تھا لیکن اپنے خون (محمد ﷺ) کے فضائل و خصائل ایک لمحہ کے لیے بھی حضرت حمزہؓ کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے..... یعنی وہ فضائل و مکارم جنھوں نے اپنے موصوف کو لوگوں کے دلوں میں بلند مقام پر پہنچا دیا تھا اور اس کے عظیم مستقبل کی واضح تصویر پیش کر دی تھی۔

ایک روز صبح کے وقت حضرت حمزہؓ معمول کے مطابق باہر نکلے تو کعبہ کے گرد کچھ معززین قریش کو بیٹھے دیکھا۔ آپؓ بھی ان کے پاس جا بیٹھے اور ان کی باتیں سننے لگے جو وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کر رہے تھے۔ حضرت حمزہؓ نے پہلی بار قریش کو بھتیجے کی دعوت پر مضطرب دیکھا کہ آپؐ کے متعلق ان کی گفتگوؤں میں کینہ و بغض اور غیظ و غضب جھلک رہا تھا۔ اس سے قبل قریش نے آپؐ کی دعوت کے معاملے کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ وہ اس سے عدم توجہ ہی برتتے رہے لیکن آج ان کے چہرے اضطراب و بے چینی اور غم و پریشانی سے بھرے دکھائی دے رہے تھے۔ حضرت حمزہؓ ان کی باتوں کو کافی دیر تک سنتے رہے اور ان کی باتوں کو مبالغہ آرائی اور غلط فہمی خیال کیا۔

ابوجہل نے بیٹھے ہوئے لوگوں سے زوردار انداز میں کہا: حمزہ سب سے زیادہ ان خطرات کو جانتا ہے جو محمد کی دعوت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ چاہتا ہے کہ معاملے کو اسی طرح چلنے دیا جائے یہاں تک کہ قریش سو جائیں، صبح اٹھیں تو ان کی صبح بُری ہو اور اس کا بھتیجا ان کے اوپر غالب آ چکا ہو۔

قریش کے یہ معززین اپنی باتوں میں دھمکیاں دے رہے تھے اور چنگھاڑ رہے تھے۔ حضرت حمزہؓ ایک بار پھر مسکرائے اور ایک بار پھر پریشان ہوئے۔ جب لوگ اٹھ گئے اور ہر کسی نے اپنی راہ لی تو حضرت حمزہؓ کا سر نئے خیالات اور حالات سے بوجھل تھا، آپ اپنے بھتیجے کے مستقبل پر غور و خوض کر رہے تھے، اپنے دل میں ایک نئے موضوع اور عنوان پر سوچ بچار کر رہے تھے۔

دن گزرتے گئے، اور ہر گزرتے دن کے ساتھ قریش کی چیخ و پکار دعوتِ رسولؐ کے گرد بڑھنے لگی۔ پھر یہ گلو گرفتگی دھمکیوں میں بدلنے لگی۔ حضرت حمزہؓ دور سے سارے منظر کا جائزہ لے رہے تھے۔ بھتیجے کا عزم و ثبات انھیں حیران کر دیتا ہے۔ آپؐ دعوت و ایمان کی راہ میں بھتیجے کی جاں نثاری کو تمام قریش کے سامنے ایک نئی چیز خیال کر رہے تھے حالانکہ قریش نے عزم و استقامت اور جاں نثاری کے بڑے بڑے واقعات دیکھے تھے۔

اس روز کوئی شک و شبہ رسول ﷺ کی صداقت و عظمت کے بارے میں کسی کو دھوکا دے سکتا تھا مگر حضرت حمزہؓ کے دماغ میں ایسا کوئی شائبہ راہ نہ پا سکتا تھا جو انھیں بھتیجے کی دعوت کے معاملے میں متردد کرتا۔

حضرت حمزہؓ تو وہ بہترین شخص تھے جو جناب محمد ﷺ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کو ان کے معصومانہ بچپن سے لے کر طاہرانہ جوانی اور جوانی سے لے کر امانتدارانہ مردانگی تک خوب جانتے تھے۔ وہ آپ کو ایسے ہی جانتے تھے جیسے اپنے آپ سے واقف تھے۔ بلکہ اپنے سے بھی زیادہ جانتے تھے۔ وہ حضرت محمد ﷺ کو اس وقت سے جانتے تھے جب دونوں شاہراہِ زندگی پر قدم پیا ہوئے تھے۔ ایک ساتھ کھیلے کودے تھے اور ایک ساتھ ہی بلوغت و شباب کی حدوں تک پہنچے تھے اور جناب محمد ﷺ کی ساری زندگی سورج کی شعاعوں کی مانند صاف و شفاف تھی۔ حضرت حمزہؓ کو کوئی ایسا واقعہ تک یاد نہیں تھا جس میں جناب محمد ﷺ کو غصہ و مایوسی، حرص و لاپروائی اور اشتعال میں دیکھا ہو۔

حضرت حمزہؓ محض جسمانی قویٰ سے ہی کام نہیں لیا کرتے تھے بلکہ غور و فکر اور عقل و دانش کو بھی کام میں لایا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ان کی طبیعت و مزاج کے خلاف تھا کہ آپ ایک ایسے انسان کی متابعت و پیروی اختیار نہ کریں جس کی پوری صداقت و امانت کو آپ جانتے تھے۔ اس طرح آپؓ نے اپنے قلب کو اس معاملے پر مرکوز کر لیا جو عنقریب آپؓ کے اوپر منکشف ہونے والا تھا۔

☆☆

بالآخر وہ وقت آگیا جو قادرِ مطلق نے مقرر کر رکھا تھا۔ حضرت حمزہؓ ایک ماہر شکاری تھے۔ ایک روز اپنے پسندیدہ مشغلے ''شکار'' کے لیے کمان اٹھائے گھر سے نکلے۔ شکار کھیلتے آدھا دن گزر گیا۔ جب واپس آئے تو عادت کے مطابق کعبہ گئے تاکہ گھر جانے سے قبل طواف کریں۔ کعبہ کے قریب ہی آپؓ کو عبداللہ بن جدعان کی خادمہ ملی، وہ آپؓ کو دیکھتے ہی کہنے لگی ''ابوعمارہ! کاش! تمھیں معلوم ہو جائے کہ تمھارے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ ابوالحکم بن ہشام نے کیا سلوک کیا ہے! ابوالحکم (ابوجہل) نے محمد کو وہاں بیٹھے مارا پیٹا اور سب و شتم کیا۔ محمدؐ کو اس سے بہت زیادہ تکلیف پہنچی ہے۔

حضرت حمزہؓ نے توجہ کے ساتھ خادمہ کی بات سنی، پھر لمحہ بھر کے لیے سر جھکایا اور اپنی کمان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کو مضبوطی سے پکڑ کر کندھے پر رکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کعبہ کی جانب چل پڑے تاکہ وہیں ابوجہل سے ٹاکرا ہو جائے اور اگر وہ وہاں نہ ملے تو اسے تلاش کر کے چھوڑیں گے۔

حضرت حمزہؓ کعبہ کے نزدیک پہنچتے ہیں تو ابوجہل صحنِ مسجد میں ساداتِ قریش کے درمیان بیٹھا نظر آتا ہے۔ حضرت حمزہؓ پُرسکون اور باوقار ہیبت ناک انداز میں ابوجہل کی طرف بڑھتے ہیں اور اپنی کمان سیدھی کر کے ابوجہل کے سر پر دے مارتے ہیں اور اس کو خون آلود کر دیتے ہیں۔ حاضرینِ مجلس کے سنبھلنے سے پہلے ہی حضرت حمزہؓ گرج کر ابوجہل سے کہتے ہیں ''کیا تم محمدؐ کو گالیاں دیتے ہو جبکہ میں بھی اس کے دین پر ہوں، میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتا ہے، اگر تمھارے اندر طاقت ہے تو مجھے بھی کچھ کہہ کر دیکھو۔''

حاضرین اس توہین آمیز سلوک اور ابوجہل کے سر سے بہنے والے خون کو بھول جاتے ہیں اور ان الفاظ پر توجہ مرکوز کر لیتے ہیں جو ان پر بجلی بن کر گر رہے ہیں کہ حمزہؓ نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ بھی محمد ﷺ کے دین پر ہے، وہ بھی وہی نظریہ و عقیدہ رکھتا ہے جو محمد ﷺ کا ہے۔

کیا حمزہؓ مسلمان ہو گیا ہے......؟؟

کیا قریش کا ایک معزز و کڑیل جوان مسلمان ہو گیا ہے......؟؟

یہ تو ایسی قیامت تھی جس کو روکنا قریش کے بس کی بات نہ تھی۔ حضرت حمزہؓ کا اسلام تو بہت سے سرداروں کے قبولِ اسلام کا باعث بن سکتا تھا جس سے محمد ﷺ بہت جلد ایسی طاقت و قوت پا لیتے کہ ان کی دعوت کو سہارا مل جاتا اور وہ توانا ہو جاتی۔ اس روز قریش ایسے تباہ کن ہتھیار سے آشنا ہو رہے تھے جو اُن کے معبودانِ باطل پر کاری ضرب لگا کر ان کو تہس نہس کر سکتا تھا۔

اللہ اکبر...... حضرت حمزہؓ مسلمان ہو گئے! اور انھوں نے اس پوشیدہ راز کو برملا منکشف کر دیا جسے ابھی تک دل میں چھپائے بیٹھے تھے اور قریش کی اس ٹولی کو انگشت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بدناں کر کے رکھ دیا جو اپنی امیدوں کے ناکام ہو جانے پر کفِ افسوس مل رہی تھی اور ابوجہل اپنے زخم خوردہ سر سے بہنے والے خون کو چاٹ رہا تھا۔ حضرت حمزہؓ نے دوبارہ اپنا ہاتھ اپنی کمان کی طرف بڑھایا اور اس کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ کر پرسکون اور جرأت مندانہ انداز میں گھر کو چل دیے۔

☆☆

حضرت حمزہؓ عقلِ سلیم اور ضمیرِ مستقیم رکھتے تھے۔ جب آپؓ واپس گھر پہنچے اور دن بھر کی تھکاوٹ دور ہوئی تو بیٹھ کر غور و فکر کرنے لگے۔ آپؓ اپنی توجہ اس حادثہ پر مرکوز کیے ہوئے تھے جو ابھی ابھی پیش آیا تھا۔

آپؓ نے کس انداز اور کس وقت قبولِ اسلام کا اعلان کیا؟

آپؓ نے جوش و غضب اور حمیت کے لمحہ میں یہ اعلان کیا تھا۔ آپؓ کو یہ بات کھا گئی تھی کہ آپؓ کے بھتیجے کو تکلیف پہنچے اور اس پر اس حال میں ظلم توڑا جائے کہ اس کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہو۔ بنی ہاشم کے خاندانی وقار کی حمیت نے آپؓ کو اکسایا اور آپؓ نے ابوجہل کے سر پر کمان دے ماری اور اس کے منہ پر اپنے اسلام کا اعلان بھی کر دیا۔

لیکن کیا یہ اچھا طریقہ تھا کہ کوئی انسان زمانوں سے چلے آنے والے اپنے آبائی اور قومی دین کو یوں چھوڑ دے اور ایک ایسے دین کی طرف متوجہ ہو جائے جس کی تعلیمات کے متعلق وہ کچھ نہ جانتا ہو اور اس کی حقیقت سے بھی کچھ زیادہ واقفیت نہ رکھتا ہو۔

یہ بات درست ہے کہ آپؓ کو جناب محمدﷺ کی صداقت اور مقصد کی پاکیزگی میں ذرا شک نہ تھا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی جوشِ غضب میں ایک نئے دین کو ذمے داریوں اور جوابدہی کے کامل احساس کے ساتھ قبول کر لے؟

یہ بات ٹھیک ہے کہ آپؓ اس نئی دعوت کے احترام میں دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے جس دعوت کا پرچم آپؓ کے بھتیجے نے بلند کر رکھا تھا۔ لیکن اس دین میں داخل ہونے کا مناسب وقت کون سا تھا؟

کیا غضب و حمیت کی کیفیت یا غور و فکر کی حالت؟

یہ تھی وہ صورتِ حال جس میں آپؓ کے ضمیر کی استقامت اور عقل کی ستھرائی نے آپؓ کو پورے معاملے پر ازسرِنو گہرے غور و خوض پر مجبور کیا۔ آپؓ نے اس مسئلے پر سوچنا شروع کر دیا۔ اس کیفیت میں کئی دن ایسے گزر گئے کہ آپؓ کو دن کو سکون ہوتا نہ رات کو آنکھ لگتی۔

جب انسان عقل کے ذریعے کسی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے تو شک حقیقت تک پہنچنے میں ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ حضرت حمزہؓ بھی جب اسلام کے معاملے کی تحقیق کے لیے عقل کو استعمال کرنے لگے اور دینِ قدیم اور دینِ جدید میں موازنہ کرنے لگے تو آپؓ کے دل میں بھی شکوک و شبہات کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا جس نے آپؓ کے اندر آبائی دین کے ساتھ فطری و موروثی محبت اور ہر نئی چیز سے دور رہنے کے جذبے کو بیدار کر دیا۔ کعبہ اور اس کے اندر رکھے معبودوں اور اس دینی شرف و بزرگی سے وابستہ یادیں بیدار ہو گئیں جو ان تراشیدہ معبودوں نے قریش بلکہ پورے مکہ کو عطا کر رکھی تھی۔

حضرت حمزہؓ کو اس بات پر تعجب ہوا کہ انسان اپنے آبائی دین کو اس آسانی اور سرعت کے ساتھ چھوڑ دینا کس طرح آسان سمجھتا ہے؟ آپؓ اپنے کیے پر نادم ہو رہے تھے لیکن آپؓ عقل کے استعمال کا سفر شروع کر چکے تھے اور اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ تنہا عقل پورے اخلاص کے باوجود آپؓ کو غائبانہ رازوں تک نہیں لے جا سکتی۔ لہٰذا آپؓ کعبہ کے قریب آسمان کی طرف منہ کر کے روتے گڑگڑاتے، کائنات کے قادرِ مطلق اور ارض و سماء کے نور و ضیا سے دعا کرنے لگے کہ وہ حق اور صراطِ مستقیم کی طرف آپ کی رہنمائی فرمائے۔ آیئے ہم بقیہ واقعہ آپؓ ہی کی زبانی سنتے ہیں، آپؓ کہتے ہیں:

''پھر مجھے اپنا آبائی اور قومی دین چھوڑنے پر ندامت ہونے لگی۔ میں نے پوری رات شکوک و شبہات کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

طوفان میں ہی گزار دی۔ ساری رات میری آنکھ نہ لگ سکی۔ پھر میں کعبہ میں آیا اور اللہ سے دعا و مناجات کی کہ وہ حق کے لیے میرے سینے کو کھول دے اور شکوک و شبہات کو مجھ سے دور کر دے۔ اللہ نے میری دعا کو قبول فرمایا اور میرے دل کو یقین کی کیفیت سے بھر دیا۔ اگلی صبح میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو سارا واقعہ و کیفیت سنائی تو آپؐ نے اللہ سے دعا فرمائی کہ اللہ میرے دل کو دینِ اسلام پر ثبات عطا فرمائے۔"

یہ ہے حضرت حمزہؓ کے یقینی قبولِ اسلام کی کہانی!

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت حمزہؓ کے ذریعے اسلام کو طاقت عطا کی اور آپؓ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے کمزور ساتھیوں کی حفاظت و دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ابوجہل نے آپؓ کو مسلمانوں کی صف میں کھڑا دیکھا تو اس نے سوچا کہ اب جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ اس نے قریش کو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ پر ظلم کرنے کی ترغیب دینا شروع کر دی اور اپنے بغض و حسد کی آتش ٹھنڈی کرنے کے لیے انھیں اندرونی جنگ کے لیے اکسانا شروع کر دیا۔

اگرچہ تنہا حضرت حمزہؓ قریش کی ان ساری تعذیبات و عقوبات کو نہیں روک سکتے تھے تاہم آپؓ کا اسلام لے آنا اس راہ میں بڑی ڈھارس ثابت ہوا۔ شروع شروع میں بہت سے قبائل کے قبولِ اسلام کا باعث حضرت حمزہؓ کا اسلام ہی تھا اور بعدازاں حضرت عمر بن خطابؓ اسلام لائے تو لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے۔

حضرت حمزہؓ نے جب اسلام قبول کر لیا تو اپنی تمام طاقتیں اور صلاحیتیں اللہ اور اس کے دین کی نذر کر دیں حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو (اللہ اور اس کے رسول کا شیر) کے عظیم لقب سے سرفراز کیا۔

اسلام کا پہلا سریہ جو دشمن کے مقابلے کے لیے نکلا اس کے امیر حضرت حمزہؓ ہی تھے اور وہ مسلمان جس کے ہاتھ میں سب سے پہلا پرچم تھمایا گیا وہ بھی جناب حمزہؓ ہی تھے۔

اور جب غزوہ بدر میں مسلمانوں اور قریش کے دو لشکر میدان میں جنگ آزما ہوئے تو اسد اللہ و اسد رسولؐ نے

ابوجہل نے آپؓ کو مسلمانوں کی صف میں کھڑا دیکھا تو اس نے سوچا کہ اب جنگ ناگزیر ہو گئی ہے

وہاں حیران کن جوہر دکھائے!

قریش کے جنگی پرچموں کا رخ بدر سے مڑ کر مکہ کی طرف ہوا اور وہ اپنی شرمناک شکست اور ناکامی کا نوحہ پڑھتے، گرتے اٹھتے اور لغزشیں کھاتے مکہ کی طرف بوجھل قدموں سے جا رہے تھے۔ ابوسفیان کا دل ٹوٹ گیا تھا اور سرنگوں ہو گیا تھا۔ وہ ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن عدی جیسے قریش کے دسیوں سرداروں، جوانمردوں، بہادروں اور جنگجوؤں کو ارضِ معرکہ میں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ قریش، اسلام کے ہاتھوں ہونے والی اپنی اس شکست کو کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے از سرِ نو معرکہ کی تیاری شروع کر دی اور اپنی منتشر قوت کو جمع کرنے لگے تاکہ اپنی ذات، اعزاز اور اپنے مقتولوں کی خاطر اپنے دشمن پر ایک بار پھر حملہ آور ہوں۔

قریش نے جنگ کی ٹھان لی اور غزوۂ اُحد کا وہ دن آ گیا جب قریش اپنی پوری جمعیت اور قبائل عرب کے اپنے حامیوں، حلیفوں کو لے کر ایک بار پھر ابوسفیان کی قیادت میں جنگ کے لیے نکل آئے۔

زعمائے قریش نے اپنے اس نئے معرکۂ کارزار کا ہدف صرف دو شخصیات کو بنایا۔ ایک اللہ کے رسول ﷺ اور دوسری حضرت حمزہؓ!

اللہ اکبر! جنگ کے لیے نکلنے سے قبل جو شخص بھی قریش کی گفتگوؤں اور مشاورتوں کو سنتا تھا وہ جانتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت حمزہؓ کو کس طرح معرکے کا ہدف ٹھہرایا گیا ہے۔

قریش نے روانگی سے قبل ایک شخص کو منتخب کیا جسے حضرت حمزہؓ کو انجام تک پہنچانے کا کام سونپا گیا۔ یہ شخص

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ایک حبشی تھا اور نیزہ بازی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ قریش نے اس کو صرف یہی ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ حمزہؓ کو شکار کرے اور اسے اپنے نیزے کی کاری ضرب لگا کر زندگی سے محروم کر دے۔ قریش نے اسے اس مقصد کے علاوہ کسی اور کام میں مصروف ہونے سے سختی سے منع کر دیا تھا کہ جنگ جو بھی صورت اختیار کر جائے اور اس کا اختتام جو کچھ بھی ہو رہا ہو تمھارا کام بس یہی ہے کہ تم حمزہؓ کا خاتمہ کرو گے۔

قریش نے اسے بہت بڑے انعام کا لالچ بھی دیا تھا اور یہ اسے آزاد کر دینے کا لالچ تھا۔ یہ آدمی جس کا نام وحشی تھا، جُبیر بن مطعم کا غلام تھا اور جُبیر کا چچا میدان جنگ میں مارا گیا تھا۔ جُبیر نے وحشی سے کہا ''تم بھی لوگوں کے ساتھ جنگ کے لیے نکلو اگر تم حمزہؓ کو قتل کر دو تو تم آزاد ہو۔''

دنیا کا یہ قیمتی سامان دیکھ کر وحشی کی رال ٹپک پڑی

پھر قریش نے وحشی کو ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مزید ابھارے جو قریش کے پیشِ نظر تھا۔ دراصل ہند کا باپ، چچا، بھائی اور ایک بیٹا میدان بدر میں مارے گئے تھے اور اسے بتایا گیا تھا کہ ان لوگوں میں سے کچھ کو حمزہ نے خود قتل کیا تھا اور کچھ کے قتل میں دوسروں کی مدد کی تھی۔

اس طرح اکثر قریشی مردوں اور عورتوں کا جنگ کے لیے تحریص دلانے کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ انھیں جنگ کی صورت میں جو قیمت بھی ادا کرنا پڑی وہ ادا کریں گے لیکن حمزہ کا سر لے کر رہیں گے۔

قریش کے جنگ کے لیے نکلنے سے قبل کئی دن ہند کے لیے اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ وہ اپنا پورا بغض و کینہ وحشی کے دل میں منتقل کر دے اور اس کی ذمہ داری اچھی طرح اس کے ذہن نشین کر دے تاکہ وہ اسے انجام دے کر ہی رہے۔

اس نے وحشی سے یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ اسے اپنا بیش قیمت زر و جواہر سے مرصع زیور دے دے گی۔ اس نے اپنی انگلیوں کے بغض بھرے پور اپنی گردن میں پڑے سونے کے اس ہار پر رکھے جو قیمتی موتیوں سے مرصع تھا۔ پھر وحشی پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا ''یہ سب کچھ تیرا ہوگا اگر تو حمزہؓ کو قتل کر دے!''

دنیا کا یہ قیمتی سامان دیکھ کر وحشی کی رال ٹپک پڑی اور اس کے شوق و رغبت نے اسے اس معرکہ میں کودنے کے لیے تیار کر دیا جو عنقریب اسے آزادی سے بھی ہمکنار کرنے والا تھا۔ وہ معرکہ جس کے بعد وہ غلام نہ رہ سکتا تھا اور جس کے باعث اسے قریش کی سردار، ایک سردار کی بیوی اور ایک سردار کی بیٹی کے گلے میں پڑا قیمتی زیور بھی ہاتھ لگنے والا تھا۔

اس ساری صورت حال کو دیکھا جائے تو جنگ کا سارا مدار اور مشاورتوں کا اصل موضوع حضرت حمزہؓ کا قتل تھا۔

☆☆

آخرکار غزوۂ اُحد کا روز آگیا اور دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے۔ حضرت حمزہؓ جنگی لباس میں ملبوس اور سینے کو زرہ کی کڑیوں سے سجائے ارضِ موت و جنگ کے وسط میں گھس گئے۔ آپؓ اِدھر اُدھر اپنی طاقت و مہارت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ کسی مشرک کے سر کی طرف بڑھتے تو اسے تن سے جدا کر کے رکھ دیتے۔ آپؓ مشرکین کی گردنیں اس بُری طرح اُڑا رہے تھے جیسے موت آپؓ کے حکم کی پابند ہو کہ آپؓ جسے چاہتے موت کے منہ میں پہنچا دیتے۔

اگر مسلمانوں کے تیرانداز پہاڑی دّرے کو نہ چھوڑتے تو مسلمان...... جو کہ دلجمعی اور پامردی کے ساتھ دشمن سے نبردآزما تھے، قریب تھا کہ انھیں حتمی فتح نصیب ہو جاتی اور قریش کے پرچم شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ اگر وہ اپنی جگہ نہ چھوڑتے اور قریش کے جنگ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

بازوں کو وہاں سے اندر داخل ہونے کا موقع نہ دیتے، تو غزوۂ احد قریش کے تمام مردوں، عورتوں کی ہی نہیں اونٹوں، گھوڑوں کی بھی قتل گاہ بن جاتا۔

اس دوران قریش کے جنگجوؤں نے مسلمانوں کو غافل پا کر حملہ کر دیا اور ان پر اپنی خونخوار وجنون زدہ تلواروں کے پے در پے وار کر دیے۔ قریش کا یہ حملہ بڑا سخت تھا جس کے باعث مسلمانوں کو سنبھلنے میں کچھ وقت لگ گیا اور یہی وہ وقت تھا جب وہ اپنے قیمتی جوانمردوں سے محروم ہوئے۔

حضرت حمزہؓ نے دشمن کے حملہ کو دیکھ کر اپنی قوت و ہمت کو مجتمع کیا اور اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے تلوار چلانے لگے۔ اس دوران وحشی اس تاک میں تھا کہ جونہی موقع ملے تو وہ اپنا وار کر دے۔ آئیے! اس قتل کا واقعہ ہم وحشی کی زبانی ہی سنتے ہیں وہ کہتا ہے:

''میں ایک حبشی تھا اور حبشہ کے طرز پر نیزہ بازی کرتا تھا۔ میرا نشانہ کم ہی خطا جاتا تھا۔ جب دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہوئے تو میں بھی حمزہؓ کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں تاکتا رہا حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان خیالے اونٹ کی طرح انھیں دیکھا کہ وہ لوگوں کو تہہ تیغ کیے جا رہے ہیں اور کوئی چیز اُن کے سامنے ٹھہر نہیں رہی۔

واللہ! میں ان پر حملے کی تیاری میں ایک درخت کی اوٹ میں چھپ رہا تھا تاکہ دور ہی سے ان پر نیزہ پھینک سکوں یا وہ ذرا میرے قریب ہو جائیں تو پھر اپنا وار کروں۔ اسی دوران جب سباع بن عبدالعزیٰ نے انھیں دیکھا تو مجھے ان کی طرف کھینچتے ہوئے کہا: اے مقطعۃ البظور کے بیٹے! آگے بڑھو۔ پھر اس نے نشانہ لے کر حمزہؓ کے سر پر وار کیا جو خطا نہ گیا۔ میں نے اپنا نیزہ اٹھایا اور جب اسے پھینکنے کے لیے اچھی طرح جانچ تول لیا تو فوراً پھینک دیا۔ نیزہ ان کی کوکھ کو لگا اور دونوں قدموں کے درمیان سے آگے نکل گیا۔ وہ میری طرف چلنے تو زخموں کی شدت نے انھیں حرکت نہ کرنے دی اور وہ وہیں ڈھیر ہو کر دم توڑ گئے۔

میں نے اپنا نیزہ اٹھایا اور چھاؤنی میں آ کر بیٹھ گیا کیونکہ اب مجھے مزید لڑنے کی حاجت نہیں تھی۔ میں آزاد ہونے کے لیے انھیں قتل کر چکا تھا۔''

مناسب ہوگا کہ ہم یہاں وحشی کا بقیہ بیان بھی نقل کریں، وہ کہتا ہے:

''جب میں مکہ کو واپس لوٹا تو آزاد ہو چکا تھا۔ پھر میں یہیں مقیم رہا حتیٰ کہ رسول اللہﷺ فتح مکہ کے روز یہاں داخل ہوئے تو قریش خوف کے مارے بھاگ نکلے۔ جب طائف کا ایک وفد اسلام لانے کی غرض سے رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے نکلا تو مذاہب کی حقانیت کا مسئلہ میرے ذہن میں اٹک گیا۔ میں کہنے لگا کہ حقیقی مذہب شام میں ہے یا یمن میں یا کہیں اور ہے۔

واللہ میں اپنی اسی پریشانی میں گرفتار تھا کہ ایک آدمی نے مجھے کہا تم برباد ہو جاؤ! اللہ کی قسم جو شخص رسولؐ اللہ کے دین میں داخل ہو جائے وہ اسے ہرگز قتل نہیں کرتے۔

میں بھی اٹھا اور مدینہ میں رسول اللہﷺ کی خدمت میں جا پہنچا۔ آپؐ نے مجھے دیکھا تو میں آپؐ کے سامنے حق کی گواہی دے رہا تھا۔ جب آپؐ نے میری طرف دیکھا تو پوچھا کیا تم وحشی ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں یا رسول اللہﷺ! آپؐ نے فرمایا مجھے بتاؤ کہ تم نے حمزہؓ کو کیسے قتل کیا تھا؟ میں نے آپؐ کو سارا واقعہ سنایا، بات سے فارغ ہوا تو آپؐ نے فرمایا ''تم ہلاک ہو جاؤ! مجھ سے اوجھل ہو جاؤ۔ اس کے بعد رسول اللہﷺ جہاں بھی ہوتے میں آپؐ سے اوجھل ہی رہتا تاکہ آپؐ مجھے دیکھ نہ سکیں۔ میں آپؐ کی وفات تک آپؐ کی نظروں سے اوجھل ہی رہتا رہا۔ جب مسلمان یمامہ کے مسیلمہ کذاب سے جنگ کے لیے نکلے تو میں بھی ان کے ساتھ نکل پڑا۔ میں نے اپنا وہی نیزہ اٹھایا ہوا تھا جس سے حمزہؓ کو قتل کیا تھا۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے تو میں نے مسیلمہ کذاب کو ہاتھ میں تلوار پکڑے دیکھا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اپنا نیزہ لہرانے کے بعد اچھی طرح نشانہ لے کر اس کو مارا تو نیزہ جسم میں دھنس گیا۔ میں نے اگر اس

نیزہ سے بہترین انسان حمزہؓ کو قتل کیا تھا تو اسی نیزہ سے بدترین انسان مسیلمہ کا کام تمام کیا۔ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے حمزہؓ کا قتل معاف فرما دے گا۔''

☆☆

اللہ و رسولؐ کے شیر حضرت حمزہؓ شہید ہو کر گر پڑے۔ جس طرح آپؓ کی زندگی بارعب تھی موت بھی بارعب ہوئی۔ آپؓ کے دشمنوں نے صرف آپؓ کے قتل پر اکتفا نہ کیا اور وہ اکتفا کر بھی کیسے سکتے تھے یہ تو وہ لوگ تھے جو اپنے تمام حوالی و موالی اور جنگجو اس جنگ میں لے آئے تھے جس کا مقصد رسولﷺ اور عم رسولﷺ کے خاتمے کے سوا کچھ نہ تھا۔

ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے وحشی کو حکم دیا کہ وہ حمزہؓ کا جگر اس کے پاس لائے۔ وحشی نے اس سنگ گزیدہ خواہش کی تکمیل کر ڈالی۔ جب وہ حمزہؓ کا جگر لے کر ہند کے پاس آیا تو وہ ایک ہاتھ سے یہ جگر وصول کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا ہار وحشی کے حوالے کر رہی تھی۔ یہ وحشی کے کارنامے کا بدلہ تھا!

پھر شرک و وثنیت کے لشکر کے قائد ابوسفیان کی بیوی اور بدر میں قتل ہو جانے والے عتبہ کی بیٹی ہند، حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے لگی۔ وہ ایسا کر کے اپنے اندر بغض و کینہ کی آتش کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔ مگر کلیجہ اس کے داڑھوں میں پھنس گیا اور وہ اسے نگل نہ سکی۔ اس نے اسے منہ سے باہر پھینک دیا اور کہنے لگی:

''ہم نے تم سے بدر کے زخموں کا بدلہ لے لیا۔ جنگ کے بعد جنگ تو دیوانگی ہی ہوتی ہے۔ میں اپنے باپ عتبہ، چچا شیبہ اور اپنے بھائی اور بیٹے کی موت پر صبر نہیں کر سکتی تھی۔ اب میرے دل کو سکون ہو گیا ہے اور میں نے اپنی نذر پوری کر دی ہے۔ وحشی نے میرے اندر کا بغض مٹا دیا ہے۔''

جنگ اپنے اختتام کو پہنچی تو مشرکین اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر قافلوں کی صورت میں مکہ کی طرف چلے گئے۔ رسول اللہﷺ اور آپ کے صحابہؓ ارض معرکہ میں اپنے شہداء کو دیکھنے کے لیے رک گئے۔ آپؐ میدان میں اپنے ان صحابہ کے چہرے شناخت کر رہے تھے جنھوں نے اپنی جانیں اللہ کے حضور بیچ دی تھیں اور اپنے آپ کو مقبول و منظور حالت میں اپنے رب کے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس دوران آپؐ چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ اوپر نیچے کے دانتوں کو باہم ملاتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہا ڈالتے ہیں۔

یہ بات آپؐ کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ عربوں کی فطرت اس بدترین درندگی کا مظاہرہ کرنے پر بھی اُتر سکتی ہے کہ کسی میت کے چہرے کا مثلہ کر دیا جائے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وہ میت جس کا مثلہ کیا گیا ہے وہ آپ کے شہید چچا اسد اللہ و اسد الرسول، حمزہؓ بن عبدالمطلب کی لاش ہے۔ رسول اللہﷺ نے ہنڈیا کی طرح آنسوؤں سے اُبلتی اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے چچا کی لاش پر نظر ڈالتے ہوئے فرمایا:

''تیرے صدمے جیسا صدمہ مجھے کبھی نہیں پہنچے گا۔ میں آج اس سے بڑھ کر زندگی میں کسی غضب انگیز واقعے سے دوچار نہیں ہوا۔

اگر مجھے صفیہ (حمزہؓ کی بہن) کے غمناک ہو جانے اور اپنے بعد یہ طریقہ بن جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں تجھے یہیں پڑا رہنے دوں حتیٰ کہ تو درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں میں چلا جائے۔

اگر اللہ نے کسی موقع پر مجھے قریش پر غلبہ عطا کیا تو میں اس کے تیس آدمیوں کا مُثلہ کر کے چھوڑوں گا۔''

صحابہؓ یہ سن کر فوراً بول پڑے ''اللہ کی قسم اگر اللہ نے ہمیں ایک دن بھی قریش پر غلبہ دیا تو ہم ان کا ایسا مثلہ کریں گے کہ عرب کی سرزمین پر کسی نے ایسا مُثلہ نہ کیا ہوگا۔''

لیکن وہ اللہ جس نے حضرت حمزہؓ کو شہادت کے اعزاز سے سرفراز فرمایا تھا وہ ایک بار پھر حضرت حمزہؓ کے قتل و شہادت کو اس عظیم درس کا موقع بنا دینا چاہتا تھا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عدل و انصاف کو محفوظ کر کے رکھ دے اور ہر جگہ، موقع حتیٰ کہ سزا و قصاص میں بھی زحمت سے کام لینے کو فرض و واجب قرار دے دے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

رسول اللہﷺ اپنی اس شدید تنبیہ سے فارغ ہی ہوئے تھے اور ابھی اس جگہ سے ہل بھی نہ پائے تھے کہ ان آیات کریمہ کی صورت میں وحی آ گئی:

''اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔ تمھارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔

اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

اے نبی، صبر سے کام کیے جاؤ...... اور تمھارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔

اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔''

☆☆

رسول اللہﷺ حضرت حمزہؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ حضرت حمزہؓ رسول اللہﷺ کے چچا ہی نہیں دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ وہ آپؐ کے بچپن کے ساتھی اور زندگی بھر کے دوست تھے۔

حضرت حمزہؓ کی مفارقت و وداع کے ان لمحات میں رسول اللہﷺ کے پاس اس سے بہتر کوئی ہدیہ اور تحفہ نہ تھا کہ آپؐ ان کی نماز جنازہ تمام شہداء کی تعداد کے برابر ادا کرتے۔ حضرت حمزہؓ کا جسدِ میت ارضِ معرکہ کے اس مقام سے اٹھا کر لایا گیا جہاں ان کا خون گرا تھا اور وہ شہید ہوئے تھے۔ رسول اللہﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ایک شہید کو لایا گیا اور حضرت حمزہؓ کے پہلو میں رکھ کر اس کی نماز بھی پڑھی گئی۔ اب اس شہید کی لاش کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا اور حضرت حمزہ کی لاش کو وہیں رہنے دیا گیا اور تیسرے شہید کو لا کر

ہندہ ایک ہاتھ سے جگر وصول اور دوسرے ہاتھ سے اپنا ہار وحشی کے حوالے کر رہی تھی۔ یہ وحشی کے کارنامے کا بدلہ تھا

حضرت حمزہؓ کے پہلو میں رکھ کر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ اس طرح ایک کے بعد دوسرا شہید لایا جاتا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی اور اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا حتیٰ کہ رسول اللہﷺ نے ستر بار اپنے چچا کی نماز جنازہ پڑھی۔

☆☆

رسول اللہﷺ شہداء کی تدفین کے بعد مدینہ کا رُخ کرتے ہیں تو راستے میں بنی عبدالاشہل کی عورتوں کو اپنے شہداء پر روتے دیکھتے ہیں۔ آپؐ حضرت حمزہؓ کی فرطِ محبت میں کہتے ہیں ترجمہ: ''مگر حمزہؓ پر رونے والی کوئی نہیں!''

حضرت سعد بن معاذؓ آپؐ کے یہ الفاظ سنتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شاید آپؐ یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں آپؐ کے چچا پر بھی روئیں، وہ جلدی سے ان عورتوں کے پاس جاتے ہیں اور انھیں حکم دیتے ہیں کہ حمزہؓ پر روؤ۔ عورتیں ان کے حکم کی تعمیل کرتی ہیں، لیکن جونہی آہ و بکا کی یہ آوازیں رسول اللہﷺ کے کان میں پڑتی ہیں تو آپؐ عورتوں کے پاس جا کر کہتے ہیں:

''(سعد) میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا، (اے خواتین!) جاؤ واپس چلی جاؤ، اللہ تم پر رحم فرمائے، آج کے بعد کوئی آہ و بکا نہیں!''

☆☆

حضرت حمزہؓ کی مدح میں کہے گئے صحابہ کے قصیدوں اور مرثیوں میں وہ الفاظ بہترین ہیں جو رسول اللہ نے شہداء کو دیکھتے وقت ان کی میت کے قریب کھڑے ہو کر فرمائے تھے ''اللہ تجھ پر اپنی رحمت برسائے میرے علم کے مطابق تو رشتوں کا پاس رکھنے والا اور نیکیوں کو انجام دینے والا تھا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اے مرے فرزند....! جس بات پر میں خوش ہوں گا وہ یہ کہ تُو خدا سے خوف کرے اور اُس کے فرائض میں کوتاہی نہ کرے

ایک محبت کرنے والے باپ
علیؓ بن ابوطالب کی
بیٹے حسن بن علیؓ
کے نام وصیت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

محمد بشیر جمعہ

ایسی بھرپور، جامع اور دل پذیر تحریر آپ نے کم ہی پڑھی ہوگی

اے مرے فرزند......! زمانے کی گردش، دنیا کی بے وفائی اور آخرت کی نزدیکی نے مجھے ہر طرف سے غافل کر کے صرف آنے والی زندگی کے اندیشوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب مجھے اپنی فکر ہے۔ تمام نشیب و فراز پیش نظر ہیں۔ بے نقاب حقیقت آنکھوں کے سامنے ہے۔ سچا معاملہ روبراہ ہے۔ اسی لیے میں نے یہ وصیت تیرے لیے لکھی ہے، خواہ تیرے لیے زندہ رہوں یا فوت ہو جاؤں کیونکہ مجھ میں تجھ میں کوئی فرق نہیں۔ تو میری جان ہے، میری روح ہے۔ تجھ پر آفت آئے گی تو مجھ پر پہلے آئے گی۔ تیری موت میری موت ہوگی۔

فرزند، دل کو موعظت سے زندہ کر، زہد سے مار، یقین سے قوت دے، حکمت سے روشن کر، موت کی یاد سے اس پر قابو پا، فانی ہونے کا اس سے اقرار لے، مصائب یاد دلا کر اسے ہوشیار بنا، زمانے کی نیرنگیوں سے اسے ڈرا، بچھڑ جانے والوں کی حکایتیں اسے سنا، گزرے ہوؤں کی تباہی سے عبرت دلا، ان کی اجڑی بستیوں میں گشت کر، ان کی عمارتوں کے کھنڈر دیکھ اور دل سے سوال

کر: ان لوگوں نے کیا کیا؟ کہاں چلے گئے؟ کدھر رخصت ہوگئے؟ کہاں جا کر آباد ہوگئے؟ ایسا کرنے سے تجھے معلوم ہوجائے گا کہ وہ اپنے دوست و احباب سے جدا ہوگئے، ویرانوں میں جا بسے اور تو بھی بس دیکھتے ہی دیکھتے اُنھی جیسا ہوجائے گا۔

فرزندا! (میں تجھے وصیت کرتا ہوں) خدا سے خوف کر، اس کے حکم پر کاربند ہو۔ اس کے ذکر سے قلب کو آباد کر۔ اسی کی رسی کو مضبوطی سے تھام کیونکہ اس رشتے سے زیادہ مستحکم کوئی رشتہ نہیں جو تجھ میں اور تیرے خدا میں موجود ہے، بشرطیکہ تو خیال کرے۔

لہٰذا اپنی جگہ درست کر لے۔ آخرت کو دنیا کے بدلے نہ بیچ، بے عملی کی حالت میں بولنا چھوڑ دے، بے ضرورت گفتگو سے پرہیز کر، جس راہ میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہو اس سے باز رہ، کیونکہ قدم کا روک لینا ہولناکیوں میں پھنسنے سے بہتر ہے۔

تو نیکی کی تبلیغ کرے گا تو نیکوں میں سے ہوجائے گا۔ برائی کو اپنی زبان سے برا ثابت کر، بروں سے الگ رہ۔ خدا کی راہ میں جہاد کر، جیسا حق ہے جہاد کرنے کا۔ خدا کے معاملے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہ ڈر۔ حق کے لیے مصائب کے طوفان میں کود جا۔ دین میں تفقہ حاصل کر۔ مصائب کی برداشت کا عادی بن، کیونکہ برداشت کی قوت بہترین قوت ہے۔ سب کاموں میں اپنے لیے خدا کی پناہ تلاش کر، اسی طرح تو مضبوط جائے پناہ اور غیر مسخر قلعے میں پہنچ جائے گا۔

اپنے خدا سے دعا کرنے میں کسی کو شریک نہ کر، کیونکہ بخشش و عطا، منع و حرمان، سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ استخارہ زیادہ کیا کر۔ میری یہ وصیت خوب سمجھ لے۔ اس سے روگردانی نہ کرنا، وہی بات ٹھیک ہوتی ہے جو مفید ہوتی ہے۔ بے فائدہ علم بے کار ہے اور اس کی طلب ناروا۔

فرزندا! جب میں نے دیکھا کہ آخر عمر کو پہنچ گیا ہوں اور ضعف بڑھتا جاتا ہے تو یہ وصیت لکھنے میں مجھے جلدی کرنا پڑی۔ میں ڈرا، کہیں وصیت سے پہلے ہی مجھے موت آجائے یا جسم کی طرح عقل بھی کمزور پڑجائے یا تجھ پر نفس کا غلبہ ہوجائے، یا دنیاوی فکریں تجھے گھیر لیں اور تو سرکش گھوڑے کی طرح قابو سے باہر ہوجائے۔ نوعمروں کا دل خالی زمین کی طرح ہوتا ہے جو ہر بیج قبول کرلیتی ہے۔

اسی خیال سے میں نے وصیت لکھنے میں جلدی کی تاکہ دل کے سخت ہونے اور ذہن کے دوسری طرف لگ جانے سے پہلے ہی تو اس معاملے کو سمجھ لے، جس کے تجربے اور تحقیق سے اگلوں نے تجھے بے نیاز کردیا ہے۔ اس کی راہ کی تگ و دو اور تجربے کی تلخیوں سے تجھے بچالیا ہے۔ وہ چیز تیرے پاس بلاکلفت پہنچ رہی ہے، جس کی جستجو میں ہمیں خود نکلنا پڑا تھا، اب وہ سب تیرے سامنے آرہا ہے جو شاید ہماری نگاہوں سے بھی اوجھل رہ گیا ہو۔

فرزندا! میری عمر اتنی دراز نہیں جتنی اگلوں کی ہوا کرتی تھی، تاہم میں نے ان کی زندگی پر غور اور ان کے حالات میں تفکر کیا ہے، ان کے پیچھے بحث و جستجو میں نکلا ہوں۔ حتیٰ کہ اب میں انھی کا ایک فرد ہوچکا ہوں بلکہ ان کے حالات سے حد درجہ واقف ہونے کی وجہ سے گویا ان کا اور ان کے بزرگوں کا ہم سن بن گیا ہوں۔

اسی طرح یہاں کا شیریں و تلخ، سفید و سیاہ، سود و زیاں، سب مجھ پر کھل گیا ہے۔ اس سب میں سے میں نے تیرے لیے ہر اچھی بات چن لی ہے، ہر خوشنما چیز منتخب کرلی ہے۔ ہر بُری اور غیر ضروری بات تجھ سے دور رکھی ہے اور چونکہ مجھے تیرا ویسا ہی خیال ہے جیسا شفیق باپ کو بیٹے کا ہوتا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ یہ وصیت ایسی حالت میں ہو کہ تو ابھی کم عمر ہے، دنیا میں نووارد ہے۔ تیرا دل سلیم ہے، نفس پاک ہے۔

پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ تجھے صرف کتاب اللہ اور اس کی تفسیر اور شریعت اور اس کے احکام حلال و حرام کی تعلیم دوں گا، پھر خوف ہوا، مبادا تجھے بھی اسی طرح شکوک و شبہات گھیر لیں گے جس طرح لوگوں کو نفس پرستی کی وجہ سے گھیر چکے ہیں لہٰذا میں نے یہ وصیت ضروری سمجھی۔ یہ تجھ پر شاق ہوسکتی ہے مگر میں نے اسے پسند کرلیا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اور گوارا نہ کیا کہ ایسی راہ میں تجھے تنہا چھوڑ دوں جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید ہے خدا میری وصیت کے ذریعے تجھے ہدایت دے گا اور سیدھی راہ کی طرف تیری راہنمائی کرے گا۔

فرزند! تیری جس بات سے میں خوش ہوں گا، یہ ہے کہ تو خدا سے خوف کرے، اس کے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کرے، اپنے اسلاف اور خاندان کے پاک بزرگوں کی راہ پر گامزن ہو کیونکہ جس طرح آج تو اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اسی طرح کل وہ بھی اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔ آخر تجربوں نے انھیں مجبور کر دیا کہ سیدھی راہ پر آ جائیں اور فضول بات سے پرہیز کریں۔

لیکن اگر تیری طبیعت یہ قبول نہ کرے اور انہی کی طرح بذات خود تجربے حاصل کرنے پر مصر ہو، تو بسم اللہ تجربہ شروع کر مگر عقل و دانائی کے ساتھ، شبہوں اور بحثوں میں بے عقلی سے الجھ کر نہیں، اور اس سے پہلے کہ یہ کام تو شروع کرے، اپنے خدا سے مدد کا خواستگار ہو، اس کی توفیق کا طالب ہو، اور ہر قسم کے شبہات تجھے حیرت و گمراہی میں ڈال دیں گے۔ جب تجھے یقین ہو جائے کہ قلب صاف ہو کر قبضے میں آ گیا ہے، عقل پختہ ہو کر جم گئی ہے اور ذہن میں یکسوئی پیدا ہو چکی ہے، تو اس وقت اس وادی میں قدم رکھ ورنہ تیرے لیے یہ راہ تاریک ہو گی اور تو اس میں بھٹکتا پھرے گا۔ حالانکہ طالب دین کو نہ بھٹکنا چاہیے، نہ حیرت میں پڑنا چاہیے، ایسی حالت میں طالب دین کے لیے اس راہ سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

فرزند! میری وصیت خوب سمجھ، اور جان لے کہ جس کے ہاتھ میں موت ہے اسی کے ہاتھ میں زندگی بھی ہے۔ جو پیدا کرنے والا ہے وہی مارنے والا ہے۔ جو فنا کرتا ہے وہی حیات نو بھی بخشتا ہے اور جو مصیبت میں ڈال کر امتحان لیتا ہے وہی نجات بھی دیتا ہے۔

یقین کر...... دنیا کا قیام اللہ کے اس ٹھہرائے ہوئے قانون پر ہے کہ انسان کو نعمتیں بھی ملتی ہیں اور ابتلا و آزمائش بھی پیش آتی ہے اور پھر آخرت میں آخری جزا دی جاتی ہے، جس کا ہمیں علم نہیں۔ اگر کوئی بات تیری سمجھ میں نہ آئے تو انکار نہ کر بلکہ اسے اپنی کم فہمی پر محمول کر کے غور کر۔ کیونکہ اول اول تو جاہل ہی پیدا ہوا تھا، پھر بتدریج علم حاصل ہوا اور ابھی نہیں معلوم کتنی باتیں ہیں جن سے تو لاعلم ہے، جن میں تیری عقل حیران رہ جاتی ہے اور بصیرت کام نہیں دیتی لیکن بعد چندے ان کا علم تجھے ہو جاتا ہے۔ پس تیری وابستگی اسی ذات سے ہو جس نے تجھے پیدا کیا، رزق دیا اور تیری خلقت پوری کی ہے۔ اسی کے لیے تیری عبادت ہو، اسی کی طرف تیرا سر جھکے، اسی سے تیری خشیت ہو۔

فرزند! اگر تیرے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے، اس کی سلطنت و حکومت کے آثار دکھائی دیتے، اس کے افعال و اعمال بھی ظاہر ہوتے مگر نہیں، وہ اللہ تو ایک ہی ہے۔ جیسا کہ خود اس نے اپنے بارے میں فرمایا ہے۔ اس کی حکومت میں کوئی شریک نہیں۔ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا۔ سب سے اول ہے مگر خود کی ابتدا نہیں۔ سب سے آخر ہے، مگر خود کی انتہا نہیں۔ اس کی شان اس سے کہیں بلند ہے کہ قلب کے تصور اور بصر کے ادراک پر اس کی ربوبیت موقوف ہو۔

پس تیرا عمل ویسا ہو جیسا اس شخص کا ہوتا ہے جس کی حیثیت چھوٹی ہے، مقدرت کم ہے اور اپنے پروردگار کی طرف اس کی طاعت کی جستجو میں، اس کی عقوبت کی وحشت میں اور اس کے غضب کے خوف میں، جس کی محتاجی بہت بڑی ہے۔ یاد رکھ تیرے پروردگار نے تجھے اچھی باتوں ہی کا حکم دیا اور صرف برائیوں سے منع کیا ہے۔

فرزند! میں نے تجھے دنیا کا نقشہ دکھایا ہے، اس کی حالت بتا دی ہے، اس کے ناپائیدار اور ہرجائی ہونے کی خبر سنا دی ہے، آخرت کی حالت بھی تیرے پیش نظر کر دی اور اس کی لذت و نعیم کی بھی خبر دے دی ہے۔ میں نے مثالیں دے کر سمجھایا ہے تاکہ تو عبرت حاصل کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔

جن لوگوں نے دنیا کو پرکھ لیا اور اس کی جدائی سے گھبراتے نہیں، ان کی مثال ایسے مسافروں کی ہے جو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ناموافق اور قحط زدہ علاقہ چھوڑ کر سرسبز و زرخیز علاقے کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ یہ مسافر راہ کی تکلیفیں برداشت کرتے، احباب کی جدائی گوارا کرتے، سفر کی مشقتیں اٹھاتے اور خوراک کی خرابی سہتے ہیں تاکہ کشادہ اور آرام دہ مقام پر پہنچ جائیں۔ کسی تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتے، کسی خرچ سے جی نہیں چراتے۔ ان کے لیے ہر وہ قدم جو منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہے، سب سے زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے لیکن جو لوگ دنیا سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے، ان کی مثال اس مسافر جیسی ہے جو سرسبز و شاداب زمین چھوڑ کر قحط زدہ زمین کی طرف چلا ہے، اس کے لیے یہ سفر بدترین اور خوف ناک ہوگا۔ اصلی مقام کی جدائی اور نئے مقام میں آمد کو وہ بھیانک مصیبت سمجھے گا۔

فرزند! اپنے اور دوسروں کے درمیان خود اپنی ذات کو میزان بنا۔ جو بات تجھے اپنے لیے پسند ہے، وہی ان کے لیے بھی پسند کر اور جو بات تو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے ان کے حق میں بھی ناپسند کر۔ کسی پر ظلم نہ کر کیونکہ دوسرے کا ظلم تو اپنے اوپر نہیں چاہتا۔ سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آ، جس طرح تیری خواہش ہے کہ وہ تجھ سے پیش آئیں۔ لوگوں کی جو باتیں ناپسند ہوں اپنی بھی وہ باتیں ناپسند کر۔ اگر لوگ تجھ سے وہی برتاؤ کریں جو تو ان سے کرتا ہے تو اسے ٹھیک سمجھ۔ بغیر علم کے کچھ نہ کہہ، اگرچہ تیرا علم کتنا ہی کم ہو اور ایسی بات کسی کے حق میں نہ کہہ جو خود تو ان سے اپنے لیے سننا نہیں چاہتا۔

خود پسندی حماقت ہے اور نفس کے لیے ہلاکت، لہٰذا سلامت روی سے اپنی راہ طے کر، دوسروں کے لیے خزانچی نہ بن۔ جب تجھے خدا سے روشنی مل جائے تو تیرا تمام تر خوف صرف اپنے پروردگار سے ہو۔

فرزند! تجھے ایک دور دراز، دشوار گزار سفر درپیش ہے۔ اس سفر میں حسن طلب کی بڑی ضرورت ہے۔ اس سفر میں تیرا بوجھ ضرورت سے زیادہ نہ ہونے پائے کیونکہ اگر تو طاقت سے زیادہ بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھا کر چلے گا تو تیرے لیے وبال جان بن جائے گا، لہٰذا اگر ''بھوکے مزدور'' تیرا زادِ راہ قیامت تک کے لیے اٹھانے کو مل رہے ہوں تو انھیں غنیمت جان اور انھیں کھانا کھلا کر اپنا بوجھ ان پر رکھ دے تاکہ کل ضرورت پر یہ توشہ تجھے کام دے۔ مقدرت کی حالت میں تیرا یہ توشہ بار ہو جانا چاہیے کہ مبادا ضرورت آ گھیرے اور تو کچھ نہ پائے۔ دولت مندی کے زمانہ میں اگر کوئی قرض مانگے تو فوراً دے دے تاکہ قیامت کے دن ناداری کے زمانہ میں وہ تجھے واپس مل جائے۔

فرزند! خدا کی بابت کسی نے ویسی تعلیم نہیں دی جیسی محمد ﷺ نے دی ہے۔ پس محمد ﷺ ہی کو اپنا راہ نما بنا اور نجات کے لیے انھی کو قطب نما تصور کر۔ میں نے تجھے نصیحت کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور یقین کر کہ اپنی بھلائی کے لیے تو کتنا ہی غور کرے، میرے برابر غور نہ کر سکے گا

فرزند! تیرے سامنے ایک کٹھن گھاٹی ہے۔ اس گھاٹی میں ایک ہلکا پھلکا آدمی ایک بوجھل آدمی سے بہتر اور سست رفتار تیز رفتار سے بدتر ہے۔ تیرا اس گھاٹی سے گزرنا لازمی ہے۔ اس کے بعد جنت ہے یا دوزخ، لہٰذا آخری منزل پر پہنچنے سے پہلے اپنا پیش خیمہ بھیج دے اور قیامت سے پہلے ہی جگہ ٹھیک کر لے کیونکہ مر جانے کے بعد نہ معذرت ممکن ہوگی نہ دنیا کی طرف واپسی۔

کبھی اجابت دعا میں اس لیے دیر ہوتی ہے کہ سائل کو زیادہ ثواب ملے، امیدوار کو زیادہ بخشش دی جائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی مانگتا ہے اور بظاہر محروم رہتا ہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

طلب کی اِجازت دے کر

یقین کر...... جس کے دستِ تصرف میں آسمان و زمین کے خزانے ہیں، اس نے مانگنے کی اجازت دے دی اور قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مانگ مل جائے گا، رحم کی التجا کر رحم کیا جائے گا۔ اس نے اپنے اور تیرے درمیان دربان کھڑے نہیں کیے جو تجھے اس کے حضور پہنچنے سے روکیں، نہ سفارشیوں ہی کا تجھے محتاج بنایا ہے جو اس کے سامنے تیری سفارش کریں۔ تیری توبہ ٹوٹ جاتی ہے تو بھی وہ تجھے نہ محروم کرتا ہے نہ تجھ سے انتقام لیتا ہے اور جب تو دوبارہ اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ نہ تجھ پر طعنہ زن ہوتا ہے نہ تیری پردہ دری کرتا ہے، حالانکہ تو اس کا مستحق ہوتا ہے۔ وہ توبہ کے قبول کرنے میں حجت نہیں کرتا، اپنی رحمت سے مایوس ہونے نہیں دیتا، بلکہ اس نے توبہ کو نیکی قرار دیا ہے۔ ایک بدی کو وہ بزرگ و برتر ایک ہی گنتا ہے، مگر ایک نیکی دس شمار کرتا ہے۔ اس نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے، وہ تیری پکار سنتا ہے، تیری مناجات پر کان دھرتا ہے، تو اس سے مرادیں مانگتا ہے، دل کی حالت بیان کرتا ہے، اپنی بِپتا سناتا ہے، اپنی مصیبتوں کی فریاد کرتا ہے، اپنی مشکلوں میں مدد مانگتا ہے۔ تو اس سے عمر کی درازی، جسم کی تندرستی، رزق کی کشادگی چاہتا ہے اور اس کی رحمت کے ایسے ایسے خزانے طلب کرتا ہے جو اس کے سوا کوئی اور دے نہیں سکتا۔

غور کر...... اس نے طلب کی اجازت دے کر اپنی رحمت کی کنجیاں تیرے حوالے کر دی ہیں۔ تُو جب چاہے دعا کر کے اس کی نعمتوں کے دروازے کھلوا لے، رحمتوں کا مینہ برسوا لے۔ لیکن اگر اجابت دعا میں دیر ہو تو مایوس نہ ہو، کیونکہ قبول دعا کا مدار نیت کی صحت پر ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مگر جلد یا بدیر طلب سے زیادہ اسے دیا جاتا ہے یا پھر محرومی ہی اس کے حق میں بہتر ہوتی ہے۔ نہیں معلوم کتنی مرادیں ایسی ہیں کہ پوری ہو جائیں تو انسان کی عاقبت برباد ہو جائے۔ پس تیری دعا انھی باتوں کے لیے ہو جو تیرے لیے سودمند ہیں اور جو نقصان دہ ہیں وہ دور رہیں۔ سن لے...... مال و دولت بڑی چیز نہیں۔ مال تیرے لیے باقی رہے گا نہ تُو مال کے لیے۔

فرزند! تو آخرت کے لیے پیدا ہوا ہے نہ کہ دنیا کے لیے۔ فنا کے لیے بنا ہے نہ کہ بقا کے لیے۔ تو ایک ایسے مقام میں ہے جو ڈانواں ڈول ہے اور تیاری کرنے کی جگہ یہ محض آخرت کا راستہ ہے۔ موت تیرے تعاقب میں لگی ہے، تو لاکھ بھاگے، بچ نہیں سکتا۔ ایک نہ ایک دن تجھے شکار ہو جانا ہے، لہٰذا ہوشیار رہ کہ موت ایسی حالت میں نہ آ جائے کہ تو ابھی توبہ اور انابت کی فکر میں ہی ہو اور وہ درمیان میں حائل ہو جائے۔ ایسا ہوا تو بس تو نے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔

فرزند! موت اپنے عمل پر اور موت کے بعد کی حالت پر، ہمیشہ تیرا دھیان رہے، تاکہ جب اس کا پیام پہنچے تو تیرا سب کچھ پہلے سے ٹھیک ٹھاک ہو، اور تجھے اچانک اس پیام کو نہ سننا پڑے۔

فرزند! دنیا میں دنیا داروں کی محویت اور اس کی طلب میں ان کی مسابقت تجھے فریب نہ دے۔ کیونکہ خدا نے دنیا کی حقیقت کھول دی ہے۔ خدا ہی نے نہیں خود دنیا نے بھی اپنے فانی ہونے کا اعلان کر دیا ہے، اپنی برائیوں پر سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ دنیادار تو بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں جو ایک دوسرے پر غراتے

ہیں، طاقتور کمزور کو کھاتے ہیں، بڑے چھوٹوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو بندھے ہوئے اونٹ ہیں جو نقصان کرنے سے عاجز ہیں اور کچھ چھٹے ہوئے اونٹ ہیں جو ہر طرح کا نقصان کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی عقل کم ہے۔ انجان رستوں پر پڑے ہوئے ہیں، مصائب کی ناہموار وادیوں میں بلائیں اور آفتیں چرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں نہ کوئی ان کا گلہ بان ہے نہ رکھوالا۔

دنیا انھیں تاریک گزرگاہوں میں لے گئی ہے۔ ان کی آنکھیں روشنی کے منار نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے اور اس کی لذتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسی کو اپنا رب بنا لیا ہے۔ دُنیا ان کے ساتھ کھیل رہی ہے اور وہ اُس سے کھیل رہے ہیں۔ افسوس، انھوں نے آنے والی زندگی بالکل فراموش کر دی ہے۔ عنقریب تاریکی چھٹ جائے گی اور قافلہ منزل پر پہنچ جائے گا۔ لیل و نہار کے مرکب پر جو سوار ہے وہ تو برابر رواں دواں ہی ہے، چاہے کسی جگہ کھڑا ہی کیوں نہ ہو، مسافر ہے اگرچہ کہیں مقیم ہی کیوں نہ ہو۔

فرزند! تو اپنی سب امیدوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ زندگی سے زیادہ جی نہیں سکتا۔ تو بھی اسی راہ پر چلا جا رہا ہے، جس پر تجھ سے پہلے لوگ جا چکے ہیں۔ لہٰذا اپنی طلب میں اعتدال مدنظر رکھ۔ کمائی میں سلامت روی سے تجاوز نہ کر۔ یاد رکھ کوئی طلب ایسی بھی ہوتی ہے جو حرماں نصیبی کی طرف لے جاتی ہے۔ نہ ہر مانگنے والے کو ملتا ہے نہ ہر خوددار محروم رہتا ہے۔ ہر قسم کی ذلت سے اپنے آپ کو بچا، چاہے وہ کیسی ہی مرغوبات کی طرف لے جانے والی ہو۔ کیونکہ عزت کا معاوضہ تجھے کبھی مل ہی نہیں سکتا۔ دوسروں کا غلام نہ بن، کیونکہ خدا نے تجھے آزاد پیدا کیا ہے۔ وہ بھلائی بھلائی نہیں جو برائی سے آئے، وہ دولت دولت نہیں جو ذلت کی راہ سے حاصل ہو۔

خبردار، خبردار! تجھے حرص و ہوس ہلاکت کے گھاٹ پر نہ لے جائے، جہاں تک ممکن ہو اپنے اور خدا کے درمیان کسی کے احسان کو نہ آنے دے کیونکہ تجھے تیرا حصہ بہرحال مل کر رہے گا۔ خدا کا دیا ہوا تھوڑا مخلوق کے دیے ہوئے بہت سے زیادہ ہے اور شریفانہ بھی۔ اگرچہ مخلوق کے پاس بھی جو کچھ ہے خدا ہی کا دیا ہوا ہے۔

خاموشی کی وجہ سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تدارک آسان ہے۔ مگر گفتگو سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تدارک مشکل ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ مشک کا منہ باندھ کر ہی پانی روکا جاتا ہے؟ اپنا مال نہ خرچ کرنا دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے کہیں اچھا ہے۔ مایوسی کی تلخی سوال کرنے سے بہتر ہے اور آبرو کے ساتھ محنت و مزدوری بدکاری کی دولت سے بہتر ہے۔

آدمی اپنا راز خود ہی خوب چھپا سکتا ہے۔ کبھی آدمی اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارتا ہے۔ جو زیادہ بولتا ہے زیادہ غلطی کرتا ہے۔

نیکوں کی صحبت اختیار کرو، نیک ہو جاؤ گے، بدوں کی صحبت سے پرہیز کرو گے، بدی سے دور رہو گے۔ حرام کھانا، بدترین کھانا ہے۔ کمزور پر ظلم کرنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ جب نرمی سختی بن جائے تو سختی نرمی بن جاتی ہے۔ کبھی دوا بیماری ہو جاتی ہے اور بیماری دوا۔ کبھی بدخواہ خیرخواہی کر جاتا ہے اور خیرخواہ بدخواہی۔ موہوم امیدوں پر تکیہ نہ کرو، کیونکہ یہ بے عقلوں کا سرمایہ ہے۔ تجربے یاد رکھنے کا نام عقل ہے۔ بہترین تجربہ وہ ہے جو نصیحت آموز ہو۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ اس سے پہلے کہ وہ تمھارے خلاف ہو جائے۔ ہر کوشش کرنے والا کامیاب نہیں ہوتا۔ ہر جانے والا واپس نہیں آتا۔ مال کا ضائع کرنا اور عاقبت کا بگاڑنا فساد عظیم ہے۔ ہر چیز کا ایک انجام ہے، جو کچھ تیرے نوشتہ تقدیر میں ہے جلد یا بدیر سامنے آجائے گا۔ تاجر ایک لحاظ سے قمار باز ہوتا ہے۔ کبھی قلت میں کثرت سے زیادہ برکت ہوتی ہے۔

توہین کرنے والے مددگار اور سوءظن رکھنے والے دوست میں ذرا بھلائی نہیں، جب تک زمانہ ساتھ دے زمانے کا ساتھ دو۔ حرص تجھے اندھا نہ کر دے اور عداوت تجھے بے عقل نہ بنانے پائے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دوست دوستی توڑے تو تم اسے جوڑ دو۔ وہ دوری اختیار کرے تو تم نزدیک ہو جاؤ۔ وہ سختی کرے تو تم نرمی کرو۔ وہ غلطی کرے تو تم اس کے لیے عذر تلاش کرو۔ دوست کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو گویا تم غلام ہو اور وہ آقا لیکن خبردار، وہ برتاؤ بے محل نہ ہو۔ نااہل کے ساتھ نااہل نہ بنو۔ دوست کے دشمن کو دوست نہ بناؤ ورنہ دوست بھی دشمن ہو جائے گا۔ دوست کو بے لاگ نصیحت کرو، بھلی لگے یا بُری۔ غصہ پی جایا کرو، میں نے غصہ کے جام سے زیادہ میٹھا کوئی جام نہیں دیکھا۔ جو تم سے سختی کرے، تم اس سے نرمی کرو، خود بخود نرم پڑ جائے گا۔ دوستی کاٹنا ضروری ہی ہو تو بھی کچھ نہ کچھ لگاؤ باقی رکھو تاکہ جب چاہو دوستی کو جوڑ سکو۔

جو تم سے حسن ظن رکھے، اس کے حسن ظن کو جھوٹا نہ ہونے دو۔ دوست کے حقوق اس گھمنڈ میں تلف نہ کرو کہ دوست ہے کیونکہ جس کے حقوق تلف کر دیے جاتے ہیں وہ دوست نہیں رہتا۔

ایسے نہ ہو جاؤ کہ تمھارا خاندان ہی تمھارے ہاتھوں سب سے زیادہ بدبخت (اور تیری نیکی سے محروم) بن جائے۔ جو کوئی بے پروائی ظاہر کرے اس کی طرف نہ جھکو۔ دوست دوستی توڑنے میں اور تم دوستی جوڑنے میں برابر نہ ہو، تمھارا پلہ ہمیشہ بھاری رہے گا۔ نیکی سے زیادہ بدی میں تیز نہ ہو۔

ظالم کے ظلم سے تنگ دل نہ ہو، کیونکہ وہ خود اپنا نقصان اور تمھارا نفع کر رہا ہے۔ جو تمھیں خوش کرے اس کا صلہ یہ نہیں ہے کہ تم اسے رنج پہنچاؤ۔

فرزند! رزق ۲ قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جس کی تو جستجو کرتا ہے، دوسرا وہ جو تیری جستجو کرتا ہے۔ پس اگر تو جستجو چھوڑ دے تو رزق خود ہی تیرے پاس آجائے گا۔ دنیا میں تیرا حصہ بس اتنا ہے جتنے سے تو اپنی عاقبت درست کر سکے۔ اگر تو اس چیز پر رنج کرتا ہے جو تیرے ہاتھ سے نکل گئی ہے تو ہر اس چیز پر رنج کر جو تیرے ہاتھ میں نہیں آئی ہے۔ آیندہ کو گزشتہ سے غیر سمجھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جن پر نصیحت نہیں، ملامت اثر کرتی ہے۔ دانا آدمی، معمولی تادیب سے مان جاتا ہے مگر چوپایہ مار سے باز آتا ہے۔

خواہشوں اور دل کے وسوسوں کو صبر و یقین کی عزیمتوں سے زائل کر دو۔ جو کوئی راہ اعتدال سے تجاوز کرتا ہے، بدراہ ہو جاتا ہے۔ دوست، رشتے دار کی طرح ہے۔ سچا دوست وہی ہے جو پیٹھ پیچھے حق دوستی ادا کرے۔ نفس کی خواہشوں اور بدبختیوں میں ساجھا ہے۔

کتنے اپنے ہیں جو غیروں سے زیادہ غیر ہیں اور کتنے غیر ہیں جو اپنوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ پردیسی وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

جس نے راہِ حق چھوڑ دی اس کا راستہ تنگ ہے۔ جو اپنی حیثیت پر رہتا ہے اس کی عزت باقی رہتی ہے۔ سب سے زیادہ مضبوط تعلق وہ ہے جو آدمی اور خدا کے مابین ہے۔ جو کوئی تیرا پردہ نہیں کرتا وہ تیرا دشمن ہے۔ جب امید میں موت ہو تو ناامیدی زندگی بن جاتی ہے۔ ہر عیب ظاہر ہو جاتا ہے نہ ہر موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کبھی آنکھوں والا ٹھوکر کھا جاتا اور اندھا سیدھی راہ چلا جاتا ہے۔ بدی کو دور رکھو کیونکہ جب چاہو گے، لوٹ آئے گی۔ احمق سے دوستی کاٹنا عقلمند سے دوستی جوڑنے کے برابر ہے۔

جو دنیا پر بھروسا کرتا ہے، دنیا اس سے بے وفائی کر جاتی ہے اور جو دنیا کو بڑھاتا ہے، دنیا اسے گرا دیتی ہے۔ ہر تیر نشانے پر نہیں بیٹھتا۔ جب حاکم بدلتا ہے تو زمانہ بھی بدل جاتا ہے۔ سفر سے پہلے سفر کے ساتھیوں کو دیکھ لو۔ مقیم ہونے سے پہلے پڑوسیوں کی جانچ کر لو۔

خبردار، تمھاری گفتگو میں ہنسانے والی کوئی بات نہ ہو، اگرچہ کسی دوسرے کا مقولہ ہی کیوں نہ ہو۔

اپنے کنبے کی عزت کرو، کیونکہ وہ تمھارا بازو ہے جس سے اڑتے ہو، بنیاد ہے جس پر ٹھہرتے ہو، ہاتھ ہے جس سے لڑتے ہو۔

فرزند! میں تیری دنیا و عقبیٰ خدا کے سپرد کرتا ہوں اور دونوں جہاں میں اس ذات برتر سے تیرے لیے فلاح و بہبود کی دعا کرتا ہوں۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کامیاب بنیئے

عاطف مرزا

عملی زندگی میں قدم رکھنے والے طالب علموں کے لیے دنیا کے مؤثر اور ممتاز افراد کی کار آمد باتیں

دنیا کی بڑی یونیورسٹیوں کی ایک شاندار روایت ہے کہ تعلیمی سفر کے اختتام پر طالب علموں کو ڈگریاں تقسیم کرنے کی تقریب پُروقار طریقے سے منعقد کی جاتی ہے، جس میں ممتاز اور مؤثر افراد کو طالب علموں سے خطاب کی دعوت دی جاتی ہے۔ ان ممتاز افراد میں بزنس مین، سیاست دان، مصنف اور سائنسدان شامل ہوتے ہیں۔ یہ افراد اپنی تقریروں میں ان باتوں اور اصولوں کا ذکر کرتے ہیں جو عملی زندگی میں قدم رکھنے والے طالب علموں کے لیے راہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بنیادی طور پر یہ مقررین طالب علموں سے بے خوفی کی زندگی گزارنے کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ وہ طالب علموں کو بتاتے ہیں کہ عملی زندگی کے آغاز سے ان کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں ان کے لیے بے شمار چیلنجز ہوں گے لیکن زندگی کی خوبصورتی اسی میں ہے کہ ان چیلنجز کو قبول کیا جائے۔

ہمارے طالب علم بھی زندگی میں کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہمارے ہاں بے شمار مشکلات اور رکاوٹیں ہیں لیکن انہی مشکلات سے ترقی کے بے شمار مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں عملی زندگی میں کامیابی اسی صورت ملے گی جب وہ اپنے رجحانات اور پسند کے مطابق اپنے پیشے کا انتخاب کریں گے۔ طالب علموں کو بڑے خواب بھی دیکھنے ہوں گے اور اپنی زندگی کے لیے ایک بڑا وژن بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ انھیں اپنی ذات کے لیے بڑا نام، ذاتی کامیابی، دولت اور زندگی کی آسائشیں اکٹھی کرنے میں مگن نہیں رہنا بلکہ اس حوالے سے بھی سوچنا ہوگا کہ وہ جو کام کر رہے ہیں اس سے معاشرے کے لیے کیسے مفید بن رہے ہیں۔ بے شمار چیزیں ان کے اختیار میں ہیں۔ انھیں اپنے فیصلے ذمے داری سے کرنے ہیں کیونکہ اسی سے وہ ایک قابلِ رشک زندگی تخلیق کرسکیں گے۔ ایسی زندگی جس کے اختتام پر بہت کم پچھتاوے ہوں گے۔

طالب علم جب اس انداز میں سوچیں گے تو ہمارے ہاں بھی تحقیق، ایجادات اور نئے علوم اور تصورات کا چلن عام ہوگا۔ ہمارے ہاں بھی مائیکروسافٹ، گوگل اور فیس بک جیسے بڑے منصوبوں پر سوچنے والے پیدا ہونے لگیں گے۔ گزشتہ برسوں میں امریکی یونیورسٹیوں میں جن مؤثر اور ممتاز شخصیات کو طالب علموں سے خطاب کی دعوت دی گئی، آئیے...... ایک نظر ان کی باتوں پر ڈالیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے طالب علم ان سے کیا سیکھ سکتے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نیا زاویہ

مائیکل ڈیل

مائیکل ڈیل، کمپیوٹر کمپنی ڈیل (Dell) کا بانی ہے۔ مائیکل ڈیل یونیورسٹی آف ٹیکساس کے طالب علموں کو بتا رہا تھا:

''نئی باتوں کو جاننے اور مواقعوں کو نئے انداز سے دیکھنے سے ہم ڈیل (Dell) میں اپنے لیے ترقی کے راستے بناتے رہے ہیں۔ بلاشبہ خریداروں کو براہِ راست اشیا بیچنے کا تصور ہم نے متعارف نہیں کروایا۔ پرسنل کمپیوٹر بھی ہم نے ایجاد نہیں کیا اسی طرح انٹرنیٹ بھی ہم نے ایجاد نہیں کیا لیکن چیزوں کو بہتر بنانے کا امکان ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ آپ چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک نقشہ یا جینیاتی معلومات رکھنے والا Genome کیسے بنایا جائے، ایک ملک کو کیسے آزاد کرایا جائے یا باسکٹ بال ٹیم کو فائنل مرحلے میں کیسے پہنچایا جائے، یہی بات ان سب کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ کتابیں پڑھیں، ویب سائٹس دیکھیں، لوگوں کی خامیوں اور امکانات کا جائزہ لیں پھر ایک ویژن بنائیں کہ چیزوں کو کیسے بہتر بنایا جاسکتا ہے اور اس کے لیے دن رات ایک کردیں۔''

امکانات کی دنیا

میٹی ہنٹر

ممتاز امریکی سینیٹر میٹی ہنٹر، ماؤنٹ ہولیوک کالج کے طالب علموں کو بتا رہی تھی کہ وہ جو کچھ بننا چاہتے ہیں، بن سکتے ہیں:

''دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے اور یہ آپ کے منتظر ہیں۔ اس لیے دلیری سے کام لیں اور اپنی پسند اور رجحانات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم جو کچھ بننا چاہتے ہیں، بن سکتے ہیں یہ مت سوچیں کہ اب وقت گزر چکا ہے۔ زندگی پچھتاووں کا نام نہیں۔ اپنے لیے کوئی ایسا کام منتخب کریں جو آپ دلچسپی اور یکسوئی سے کرسکیں۔ دولت، عزت ہر چیز خودبخود ملنے لگے گی۔ اس بارے میں سوچتے رہنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں یا ایسا شخص بننا چاہتا ہوں، ہمت سے کام لیں جو بننا چاہتے ہیں وہی بنیں۔ اپنا وقت خواب دیکھتے رہنے میں ضائع نہ کریں۔ یہ رویہ آپ کے لیے تباہ کن ہوگا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

آپ کی ڈیلی لائف میں جس کا ہے ایک اہم رول...
200 YEARS
وہ ہے
ہاشمی
بھوسی
اسپغول
Hashmi
Ispaghol
Mohammad Hashim Tajir Surma
E-mail: a.hashmi@cyber.net.pk Web: www.hashmisurma.com
SINCE 1794

زیادہ نعمتیں، زیادہ توقعات

بل گیٹس

بل گیٹس، سافٹ ویئر بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی کا بانی اور دنیا کے موثر ترین افراد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس نے ہارورڈ یونیورسٹی کے طالب علموں سے وابستہ اپنی توقعات کا ذکر کچھ یوں کیا:

''جس دن میں ہارورڈ میں داخل ہوا اس دن میری والدہ بہت خوش تھیں اور مجھے کہہ رہی تھیں دوسروں کے لیے بھی کچھ کرنے کا سوچو۔ میری شادی سے کچھ دن پہلے انھوں نے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اس میں اُنھوں نے میری بیوی ملینڈا کے نام لکھا ہوا خط پڑھا۔ میری والدہ اس وقت کینسر کے مرض میں مبتلا تھیں لیکن اپنی سوچ دوسروں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے اس تقریب سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے خط کے اختتام پر وہ کہہ رہی تھیں کہ جن لوگوں کو زیادہ نعمتیں ملی ہوں ان سے توقعات بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ آپ طالب علموں کے پاس ایسی ٹیکنالوجی ہے جس کا ہماری نسل کے لوگوں نے تصور تک نہ کیا تھا۔ اگر آپ نے ان لوگوں کو تنہا چھوڑ دیا جن کی زندگیوں کو آپ تھوڑی سی کوشش سے بدل سکتے تھے تو آپ کا ضمیر آپ کو ملامت کرتا رہے گا۔ لہٰذا آپ کو ہر کام جلد شروع کرنا اور ہم سے زیادہ عرصے تک کرنا ہے۔''

ناکامی، کامیابی کی بنیاد بن سکتی ہے

جے کے رولنگ

جے کے رولنگ، مقبول ہیری پوٹر سیریز کتابوں کی مصنفہ ہے جبکہ وہ ناول نگار بننا چاہتی تھی۔ اس کے والدین نے غربت میں زندگی گزاری تھی۔ وہ ہر لحاظ سے غریب تھی لیکن اس نے اپنے ناول نگاری کے شوق پر توجہ دی اور دنیا کی مقبول ترین کتابیں تصنیف کرنے میں کامیاب ہوئی۔ وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے طالب علموں کو بتا رہی تھی کہ ناکامی کیسے کامیابی کی بنیاد بن سکتی ہے۔

''میں ناکام ہونے کے فائدوں کے بارے میں کیوں بات کر رہی ہوں کیونکہ یہ غیر ضروری چیزوں کو علیحدہ کر دیتا ہے۔ میں نے خود کو وہ سب کچھ سمجھنا ختم کر دیا جو میں نہیں تھی اور اپنی ساری توانائی کا رخ اس کام کی طرف موڑ دیا جو میرے لیے سب سے اہم تھا۔ اگر میں کسی اور کام میں کامیاب ہو جاتی، تو میرے اندر اس کام میں کامیاب ہونے کے لیے عزم اور حوصلہ نہ آتا جو میرا اصل میدان ہے۔ میں خود کو آزاد محسوس کر رہی تھی کیونکہ میرا سب سے بڑا خوف حقیقت بن چکا تھا اور میں اس کے باوجود زندہ تھی۔ میرے پاس میری بیٹی تھی جس سے میں محبت کرتی تھی۔ ایک پرانا ٹائپ رائٹر تھا اور ذہن میں ایک بڑا آئیڈیا۔ یہ انتہائی حالت میرے لیے وہ ٹھوس بنیاد بن گئی جس پر میں نے اپنی زندگی کو دوبارہ تعمیر کیا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہمدرد
رمضان کریم
سب سے میٹھا صبر ہے
رب کی بارگاہ میں
اس کا اتنا شکر ہو تو
اور کیا چاہیے
رُوح افزا

جیف بیزوس

اہم فیصلے

جیف بیزوس (Bezos) ایمیزون کمپنی کے بانی ہیں جو انٹرنیٹ پر کتابیں فروخت کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ ۹۰ء کی دہائی میں انٹرنیٹ تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ جیف اس کی ترقی سے بہت متاثر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر آن لائن کتابیں فروخت کرنے کا تصور متعارف کروایا جائے تو یہ بہت کامیاب رہے گا۔ جیف نے اپنے لیے کم محفوظ راستے کا انتخاب کیا لیکن وہ اس انتخاب پر خوش تھا۔ اس کے آن لائن بزنس کو زبردست کامیابی ملی۔ جیف بیزوس نے ۲۰۱۰ء میں پرنسٹن یونیورسٹی کے طالب علموں سے خطاب میں کہا:

''آپ اپنے فیصلے سمجھداری سے کریں۔ زندگی دراصل ہمارے فیصلوں (Choices) کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہماری ناکامی اور کامیابی کا انحصار انہی فیصلوں پر ہوتا ہے۔ میں ایک پیشین گوئی کرنا چاہوں گا۔ جب آپ ۸۰ سال کے ہوں گے اور کسی پرسکون لمحے میں اپنی گزری ہوئی زندگی کی اہم باتوں کو یاد کریں گے تو اس میں سب سے بامعنی لمحے ان فیصلوں سے متعلق ہوں گے جو آپ نے زندگی میں کیے ہوں گے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کئی دہائیوں کی منصوبہ بندی

روس پیراٹ سینئر امریکا کا معروف بزنس مین ہے۔ وہ سدرن میتھوڈسٹ یونیورسٹی کے طالب علموں کو بتا رہا تھا:

''آپ کو لمبی عمر گزارنی اور اس کے مطابق منصوبہ بندی کرنی ہے۔ آپ میں سے بہت سے لوگ اپنی عمر کی آٹھویں اور نویں دہائی میں بھی فعال نظر آنا پسند کریں گے۔ میں چاہوں گا کہ آپ مستقبل میں اپنے ملک کی خدمت کے بارے میں اور اسے کچھ واپس لوٹانے کے حوالے سے سوچیں۔ اس عمر میں آپ کو چاہیے کہ دنیا میں سفر کریں اور اس کے بارے میں جانیں۔ اس دنیا کے باسیوں کے بارے میں جانیں اور ان کی عزت کریں۔ مہم جوئی بھی کریں اور اپنے بارے میں بھی جانیں۔ اپنے رجحانات کا جائزہ لیں پھر اپنے لوگوں کی خدمت کریں۔''

روس پیراٹ سینئر

A WILL TO
WIN
May today's achievement be the beginning of tomorrow's success!
Congratulations!!
Quality Enhancement Cell (QEC)
of
Riphah International University
Wins 1st Position in HEC rankings amongst QECs of all the "W" Category Private Sector Universities in the Country.
1
Note: Quality Enhancement Cells are established by HEC in Public and Private Sector Universities to monitor Quality of Education, through a well structured Feedback
Riphah International University has been ranked 6th by the HEC in General (Medium) Category Universities
RIPHAH
International
University
Chartered by the Federal Government.
Degrees Recognized Worldwide
www.riphah.edu.pk
UAN: 111-510-510

لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا

امریکا آن لائن، آن لائن سروسز مہیا کرنے والی کمپنی ہے۔ سٹیو کیس، امریکا آن لائن کا چیف ایگزیکٹو رہا ہے۔ وہ جارج میسن یونیورسٹی کے طالب علموں کو بتا رہا تھا:

''جو لوگ آپ کے اردگرد ہوتے ہیں وہ بھی اہم ہیں۔ آپ زندگی میں چاہے کوئی بھی کام کر رہے ہوں آپ کے کامیاب ہونے کی صلاحیت کا انحصار بہت حد تک لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ اہم نہیں بلکہ آپ کن لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہیں یہ زیادہ اہم ہے۔ آپ کے اردگرد موجود لوگ چاہے وہ شریک حیات ہو، دوست ہو یا کولیگ، آپ کی زندگی کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا صرف اسی پر دھیان نہ دیں کہ ملازمت میں کیا ذمے داریاں لکھی گئی۔ جس ادارے میں آپ جا رہے ہیں اس کا برانڈ (Brand) کیا ہے بلکہ آپ کن لوگوں کے لیے اور کن لوگوں کے ساتھ کام کریں گے اس پر بھی توجہ دیں۔''

سٹیو کیس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

زندگی۔ آرٹ کا نمونہ

ٹونی موری سن امریکی ناول نگار اور پروفیسر ہے۔ اس نے ۱۹۹۳ء میں ادب کا نوبل انعام بھی جیتا تھا۔ وہ ویلیسلے کالج کے طالب علموں کو اپنی زندگی خود تخلیق کرنے کا مشورہ دے رہی تھی:

''آپ کی زندگی ایک ایسی کہانی ہے جسے آپ خود تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے انسان ہونے کا کیا مطلب ہے آپ اس کے بارے میں آزادی سے سوچ سکتے ہیں۔ اگرچہ آپ اس پر پورا اختیار نہیں رکھتے۔ (یقین جانیے میرے خیال میں کوئی مصنف ایسا اختیار نہیں رکھتا) لیکن آپ اسے تخلیق ضرور کر سکتے ہیں۔ اگر میں اپنے نقطۂ نظر کی بات کروں جو کہ ایک کہانی لکھنے والے کا نقطۂ نظر ہے تو آپ کی زندگی انتظار کر رہی ہے کہ اسے آرٹ کا نمونہ بنایا جائے۔''

ٹونی موری

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.paksbooksfree.pk

نہ گھبرائیں نہ ڈریں! نہ جن شن نکالنے، جادو ٹونا کرنے والے 180 سالہ سنیاسی باوا کو فون کرنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت جو لوگ بازار سے B کوالٹی سستے لیدر، ربڑ یا کاٹن گلوز پرچیز کرتے ہیں اُنکی دو چار سپلائیوں کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے یا اُن کو اِس طرح کے خواب آنے لگتے ہیں۔ اگر آپ کو بھی کوئی ایسا مریض نظر آئے تو یہ کہہ کر اُس پر پھونک دیجئے " کوٹلہ کی معیاری گلوز اور وہ بھی خدمت ریٹس پر " مریض ٹھیک ہو جائے گا۔

1st Floor, Aslam Arcade, 16-Mcleod Road, Lahore. Ph: 37314287-88, 0322-4113495

صرف شوق کافی نہیں

سٹیو بالمر

سٹیو بالمر مائیکروسافٹ کمپنی کا چیف ایگزیکٹو ہے۔ وہ یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا کے طالب علموں کو پُرعزم بننے کا مشورہ دے رہا ہے:

''شوق ہی کافی نہیں، پُرعزم ہونا بھی ضروری ہے۔ رغبت یا لگاؤ، کسی کام کے بارے میں بہت زیادہ پُرجوش ہونے کی اہلیت ہے۔ ارادے کا پکا ہونا، اس کام سے جڑے رہنے کی اہلیت ہے۔ اگر آپ آج تک شروع کی جانے والی کمپنیوں پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا ان میں سے زیادہ تر ناکام ہوجاتی ہیں۔ اگر آپ ان کمپنیوں کو دیکھیں جو کامیاب ہوئیں جیسے مائیکروسافٹ، ایپل، گوگل، فیس بک، ان کمپنیوں پر بھی مشکل وقت آیا۔ معاملہ ایسا ہی ہے کہ آپ کو تھوڑی سی کامیابی ملتی ہے پھر آپ کے سامنے رکاوٹیں آجاتی ہیں۔ آپ کسی نئے آئیڈیے، نئی ایجاد کو متعارف کرتے ہیں اور ابتدا میں وہ کام نہیں ہوتا۔ آپ اس کے بارے میں کتنے پُرعزم، پُرامید اور کس حد تک ڈٹے ہوئے ہیں، یہ چیز آپ کی کامیابی کا تعین کرتی ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بڑے خواب دیکھنے والے جنونی

لیری پیج، گوگل کا شریک بانی ہے۔ گوگل انٹرنیٹ سرچ میں دنیا کا سب سے بڑا نام ہے۔ وہ یونیورسٹی آف مشی گن کے طالب علموں کو بڑے خواب دیکھنے کے فائدوں کے بارے میں بتا رہا تھا:

''میں سمجھتا ہوں کہ خواب جتنے بڑے ہوں ان کو حقیقت بنانا اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔ آپ کو یہ بات بڑی عجیب لگے گی۔ لیکن آپ اس بات پر غور کریں کہ بہت کم ایسے جنونی ہوں گے جو اتنے بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو کم لوگوں سے مقابلہ کرنا ہوگا بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب کو ان کے نام سے جانتا ہوں۔ بہترین لوگ بڑے بڑے چیلنجوں پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ گوگل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔''

لیری پیج

قال رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام :

أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا

وأشار بالسبابة والوسطى وفرج بينهما شيئا

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا شخص جنت میں اس طرح (قریب) ہوں گے"
اور آپ نے اپنی شہادت کی انگلی اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کیا

ہمارا عزم لاکھوں یتیم بچوں کی کفالت

é ZÀÛØ¡ %

"میرے ۳ بچے ہیں اور میرے شوہر کو فوت ہوئے تیسرا سال ہے۔ سب سے بڑا بیٹا چھٹی جماعت میں ہے اور باقی ایک بیٹا اور بیٹی چھوٹے ہیں۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ گھروں میں کام کاج بھی کیا کہ کسی طرح بچوں کی تعلیم جاری رکھ سکوں لیکن دو وقت کی روٹی پوری کرنا محال ہو گیا۔ قریب تھا کہ بڑے بیٹے کو بھی اسکول سے اٹھانا پڑتا مگر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ الخدمت فاؤنڈیشن نے مجھ سے رابطہ کیا اور میرے مسائل سننے کے بعد میرے بچوں کی غذائی اور تعلیمی ضروریات کے حوالے سے مدد کی۔ بچوں کی تعلیم ان بچوں کے مرحوم والد کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ میں اس خواہش کی تکمیل پر خوش ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

(زینب بی بی۔ والدہ ارسلان۔ حضرو، اٹک)

Unicef کے مطابق پاکستان میں بیالیس لاکھ بچے یتیم ہیں جنہیں تعلیم وتربیت اور خوراک کی مناسب سہولیات میسر نہیں

خدمت خلق کا میدان . . . آرفن کیئر پروگرام

اس پروگرام کا مقصد ان یتیم بچوں کو اخلاقی اور مالی امداد پہنچانا ہے جو اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہیں مگر گھر کے کفیل نہ ہونے کے باعث تعلیم، صحت اور خوراک کی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ آرفن کیئر پروگرام کے تحت تمام صوبہ جات بشمول آزاد جموں وکشمیر، گلگت بلتستان اور فاٹا میں اس سال دس ہزار (10,000) یتیم بچوں کی کفالت خصوصی معاونت سے کی جائے گی۔

خرچ 2,500 روپے ماہانہ فی بچہ

خرچ 30,000 روپے سالانہ فی بچہ

www.al-khidmatfoundation.org

آغوش الخدمت

الحمدللہ اس وقت الخدمت آغوش اٹک میں 210 یتیم بچے قیام پذیر ہیں جن کو قیام وطعام، تعلیم وصحت، ذہنی وجسمانی نشوونما کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا جارہا ہے۔ الخدمت آغوش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اسلام آباد مری ایکسپریس وے پر پینتالیس کنال کے قطعہ اراضی پر ایک نیا کمپلیکس تعمیر ہو رہا ہے۔ جہاں 400 بچوں کے لیے رہائش، تعلیم، صحت سمیت زندگی کی بنیادی سہولیات بہم پہنچائی جائیں گی۔ 510 ملین روپے کے اس منصوبے پر کام تیزی سے جاری ہے۔

دستِ تعاون بڑھایئے کیونکہ!

کفالتِ یتیم سے... جنت کا حصول بھی... رفاقت رسول ﷺ بھی

اپنی زکوٰۃ، عطیات ملک بھر میں الخدمت آرفن کیئر پروگرام کے آن لائن

MCB اکاؤنٹ نمبر **0599681071007795** میں جمع کرائیں

الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان

711، بی-2، جوہر ٹاؤن، لاہور فون: 042-35957260
ای میل: info@al-khidmatfoundation.org

www.al-khidmatfoundation.org

بہتر وقت

''یاہو'' دنیا کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی ویب سائٹس میں شامل ہے۔ ہر ماہ تقریباً ۷۰۰ ملین افراد اس ویب سائٹ پر آتے ہیں۔ جیری یانگ ''یاہو'' کا سابق چیف ایگزیکٹو ہے۔ وہ یونیورسٹی آف ہوائی کے طالب علموں کو بہتر وقت کے بارے میں بتا رہا تھا:

''بُرے معاشی حالات میں بڑے بڑے منصوبے سامنے آتے ہیں۔ ''یاہو'' کمپنی نے ۹۰ کی دہائی کے بُرے معاشی حالات میں اپنا سفر شروع کیا۔ اسی طرح کئی بڑی کمپنیاں، بڑے تصورات، مصنوعات، حتیٰ کہ سماجی تحریکیں اس وقت سامنے آئیں جب لوگ ''سٹیٹس کو'' کو پرے پھینک رہے اور ہر چیز نئے طریقوں سے کر رہے تھے۔ اس تبدیلی کا حصہ بننے کے لیے اس وقت ڈگری حاصل کرنے سے بہتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

جیری یانگ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ایک دن مجھے اس دُنیا سے چلے جانا ہے

سٹیو جابز پرسنل کمپیوٹر کا موجد اور ایپل کمپنی کا بانی تھا۔ سٹین فورڈ یونیورسٹی کے طالب علموں سے اس کا خطاب بھی بہت مقبول ثابت ہوا۔ اُس نے زندگی گزارنے کا ذکر یوں کیا:

''جب میری عمر ۱۷ سال تھی تو میری نظر سے ایک مقولہ گزرا کہ اگر آپ ہر دن ایسے گزاریں کہ جیسے یہ آپ کی عمر کا آخری دن ہو تو آپ یقیناً ایک دن اس معاملے میں سچے ثابت ہو جائیں گے۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اُس دن سے آج تک ۳۳ سال کے عرصے میں میری یہ عادت رہی ہے کہ میں روزانہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر آج میری زندگی کا آخری دن ہو تو کیا میں وہ کام کرنا چاہوں گا جو مجھے آج کرنے ہیں۔ جب بھی کئی دن اس سوال کا جواب مسلسل نہیں میں آتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ اب کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔'' ■

سٹیو جابز

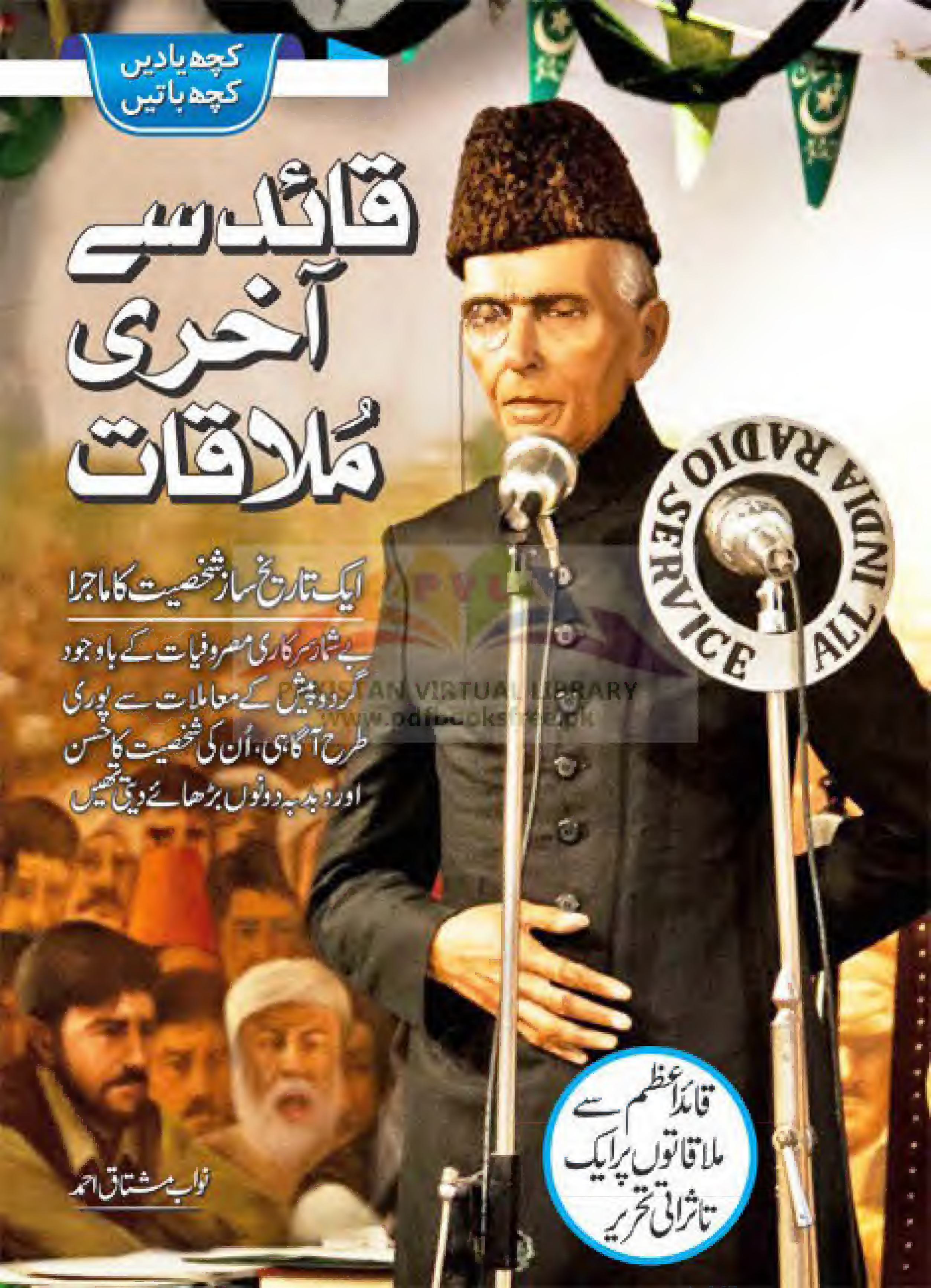

کچھ یادیں
کچھ باتیں

قائد سے آخری مُلاقات

ایک تاریخ ساز شخصیت کا ماجرا

بے شمار سرکاری مصروفیات کے باوجود گرد و پیش کے معاملات سے پوری طرح آگاہی، اُن کی شخصیت کا حُسن اور دبدبہ دونوں بڑھائے دیتی تھیں

نواب مشتاق احمد

قائداعظم سے ملاقاتوں پر ایک تاثراتی تحریر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

قوموں

کے عروج وزوال کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ہر قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اُسے قعرِ مذلّت سے نکالنے کے لیے ایک عظیم اور فعّال ہستی اُبھر کر اوپر آتی ہے اور اپنے کردار اور شخصیت سے اپنی قوم کا مقدر بدل جاتی ہے۔ ایسی شخصیت صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پاکستان کے معمار محمد علی جناحؒ کا شمار بھی انھی تاریخ ساز ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی مسیحائی سے برسوں کی نیم مردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی، اُسے اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم کی لڑی میں پرو دیا اور پھر اپنے فولادی عزم، بے مثال قوتِ ارادی اور استقامت سے اپنوں اور اغیار کی مخالفتوں کے باوجود صدیوں کی غلامی سے نجات دلا کر اُسے آزاد اور زندہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ قوم میں لیڈر تو بہت ہوتے ہیں، مگر ایسا لیڈر جو اپنی قوم کی تقدیر ہی کو بدل دے، اللہ تبارک تعالیٰ کا خاص عطیہ ہوتا ہے۔ میں اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے معمار کی عظیم شخصیت سے مجھے ایک اہم قومی مشن کے ضمن میں ذاتی رابطہ اور قرب کا شرف حاصل رہا۔ یہ مختصر مضمون اسی رابطے کی خوشگوار یادوں کا خلاصہ ہے۔

قائداعظمؒ سے میری ملاقات ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں ہوئی جہاں میں زیرِ تعلیم تھا۔ اُس وقت محمد علی جناح ایک نامور قانون دان کی حیثیت سے مشہور تھے اور اپنی ذہانت، خوش لباسی اور مونوکل لگانے کی وجہ سے سوسائٹی میں سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ وہ کسی کام سے کیمبرج یونیورسٹی میں تشریف لائے تھے۔ ایک مختصر سی نجی دعوت میں مجھے اُن سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک عمدہ سے سُوٹ میں ملبوس، مونوکل سے لیس چھریرے بدن کے ایک دُبلے پتلے آدمی کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا اور جب انھوں نے اپنے خاص انداز میں گفتگو شروع کی (جس میں خوداعتمادی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی) اور محفل پر چھا گئے، تو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں یوں بھی کم سخن ہوں، بھلا ایسے ذہنی ''بلڈوزر'' کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا تھا، چنانچہ میں ان کے اندازِ گفتگو اور سراپا سے اتنا مرعوب ہوا کہ میں نے سوائے دو چار رسمی فقروں کے گفتگو میں کوئی خاص حصہ نہ لیا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ ملک کے ایک نامور قانون دان ہیں، بمبئی کی عدالتوں میں ان کے بے باکانہ اندازِ خطاب اور چٹکلوں کے قصے بھی سُن چکا تھا، مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں مفاہمت کرانے کی کوششوں میں انھوں نے ایک ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا تھا۔ لیکن اُس دن سے پہلے مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی شخصیت اتنی جاذبِ نظر ہو سکتی ہے۔

اس واقعے کے کئی برس بعد علی گڑھ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی اقامت گاہ میں اُن سے میری دوسری ملاقات ہوئی۔ قائداعظمؒ کی تشریف آوری کے موقع پر حُسنِ اتفاق سے میں بھی وہیں مقیم تھا۔ دوپہر کے کھانے پر تعارف ہوا۔ تعارف کیا تھا، صرف میرا نام بتایا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ میرا تعلق حیدرآباد سے ہے اور علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے۔ دورانِ گفتگو مہمانوں میں سے ایک بزرگ نے قائداعظمؒ سے سوال کیا:

''آپ جیسا مصروف آدمی سال میں دو تین بار علی گڑھ آنے کے لیے کیسے وقت نکال سکتا ہے؟''

قائداعظمؒ نے بلاتوقف جواب دیا:

''علی گڑھ میری تحریک کا مرکز ہے، یہیں سے میرے نوجوان سفیر برِاعظم ہندوستان کے ہر کونے میں جا کر مسلمان عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ان کا مشنری جذبہ اور تحریک سے بے لوث لگاؤ ہی میری ساری متاع ہے۔ میں علی گڑھ دس کام چھوڑ کر آتا ہوں اور ان بچوں کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان سے باتیں کر کے اپنے عزم اور ارادے میں تقویت حاصل کرتا ہوں۔''

یہ جواب جو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے، سُن کر میں بہت متاثر ہوا اور حیرت ہوئی کہ اس شخص کی نظر

کتنی دور رس ہے۔ کسی قوم کے پاس پیشہ ور سیاست دانوں کی کتنی ہی بڑی فوج ظفر موج ہو، نوجوان رضا کاروں کی بے لوث خدمت کے بغیر کوئی تحریک ساحلِ مُراد سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اسی صحبت میں مَیں نے اپنی حماقت کہیے یا سادہ لوحی، قائداعظمؒ کی خدمت میں عرض کیا:

''میری رائے میں ہمارا تعلیمی نظام بالکل ناقص ہے، آپ اس کی درستگی کے لیے کیا اقدامات کر رہے ہیں؟''

یہ سنتے ہی انھوں نے گزشتہ چند مہینوں کی مقبولِ عام اصطلاح میں ''گیند میرے کورٹ میں پھینک دیا'' اور فرمایا:

''تم نے خود بھی تو غور کیا ہوگا کہ اگر کوئی نقائص ہیں، تو کیا ہیں اور وہ کس طرح دُور ہو سکتے ہیں۔ تم تعلیم یافتہ نوجوان ہو، تم کو ہر مسئلے کی گہرائی میں جانا چاہیے اور خود اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ اگر تمھارے پاس کوئی تعمیری پروگرام ہے، تو لاؤ، میں اس پر غور کروں گا۔''

میں نے تو ایک چلتی سی بات کہہ دی تھی، میرے پاس تعمیری پروگرام کہاں تھا۔ نہ اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے سوچا تھا جو آیندہ پیش کرنے کا وعدہ کرتا، اس لیے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ میری اس جسارت پر قائداعظمؒ کے ردِعمل کا مجھ پر یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ ہر مسئلے کو ٹھنڈے دل اور تعمیری انداز میں سوچنے کے عادی ہیں اور ہوائی باتیں کرنا اُنھیں پسند نہیں۔ جب کئی برس کے بعد میرا ان سے قریبی رابطہ پیدا ہوا، تو یہ تاثر میرے لیے خضرِ راہ ثابت ہوا اور ان کے سامنے کسی مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیے بغیر رائے دینے کی غلطی مجھ سے آیندہ سرزد نہیں ہوئی۔

یوں تو اپنی قانونی مصروفیات کے سلسلے میں قائداعظم کئی بار حیدر آباد تشریف لا چکے تھے لیکن جولائی ۱۹۴۶ء میں وہ وہاں جس شان سے آئے اور حیدر آباد کے مسلمان عوام نے جس محبت اور تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا، اس کی خوشگوار یادیں دل میں بس گئی ہیں اور کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔ قائداعظمؒ کا حیدر آباد میں دورہ، حضور نظام کی خاص دعوت پر تھا اور وہ بطور شاہی مہمان ''راک لینڈز'' مہمان خانے میں ٹھہرائے گئے۔ پہلی ملاقات کے دوران میں کوئی ایسی بات ہو گئی کہ قائداعظم تھوڑی سی دیر ہی میں شاہی محل سے واپس تشریف لے آئے۔ چونکہ قائداعظم اور حضور نظام کی ملاقات کے وقت کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہ تھا، اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کیا ہوا۔ عوام میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ حضور نظام نے قائداعظمؒ کے سگار پینے کو آدابِ شاہی کے خلاف سمجھ کر اعتراض کیا تھا۔ یہ کہانی دلچسپ تو ضرور ہے، مگر قرینِ قیاس نہیں۔ حضور نظام سے اتنے چھچھورپنے کا اظہار کیسے ممکن تھا کہ خود اپنی دعوت پر آئے ہوئے مہمان سے میزبانی کے آداب کے منافی کوئی اس قسم کی بات کرتے اور اسلامیانِ ہند کے مسلمہ لیڈر سے ایسا برتاؤ کرتے جسے وہ اپنے شاہانہ جاہ و جلال کے باوجود قائداعظم کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ ایک سال بعد جب میں ایجنٹ جنرل مقرر ہو کر پاکستان آیا تو خود میرے تعارفی خط میں حضور نظام نے ''مائی ڈیئر قائداعظم'' کے الفاظ سے انھیں مخاطب کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر کانگریس نواز سید مرزا اسمٰعیل کے مجوزہ تقرر پر اختلافِ رائے کا یہ ردِعمل تھا۔ یہ ایک مصدقہ بات ہے کہ ملاقات کے دن حضور نظام کو بخار چڑھا ہوا تھا جس کا قائداعظم کو علم تھا، چنانچہ ان کی شاہی محل سے واپسی کے فوراً بعد میرے چھوٹے بھائی کو جو اُس وقت چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا، حضور نظام نے براہِ راست ٹیلی فون کیا کہ وہ معزز مہمان کے اعزاز میں ایک سرکاری دعوت دینا چاہتے ہیں، مگر چونکہ وہ تو بیمار ہیں، اس لیے ان کی عدم موجودگی میں ولی عہد شہزادہ اعظم جاہ ان کی نیابت کریں گے اور میرے چھوٹے بھائی کو ہدایت دی کہ وہ قائداعظم کی خدمت میں فوراً حاضر ہو کر ان کی رضامندی حاصل کرے، چنانچہ وہ قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اگلے دن دوپہر کے کھانے پر قائداعظم اپنے اعزاز میں دی ہوئی دعوت میں نہ صرف شریک ہوئے، بلکہ انھوں نے خود کھڑے ہو کر حضور نظام کا جامِ صحت نوش فرمایا۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

یعنی وزارتِ عظمیٰ کے لیے نامزدگی کے بارے میں اختلافِ رائے کی وجہ سے اگر کوئی ناراضی تھی، تو وہ محض وقتی اور عارضی تھی اور اس کا اثر ان کی طبیعت پر زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ خیر، یہ بات تو برسبیلِ تذکرہ آگئی، اب میں اُس واقعے کی طرف رجوع کرتا ہوں جو میں مسلمانانِ حیدرآباد کے قائداعظم سے لگاؤ کے ثبوت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شاہی محل سے قائداعظم کی اس طرح سے جلد واپسی سے متعلق مختلف قسم کی افواہیں پھیل چکی تھیں اور شاید اس ناخوشگوار صورتِ حال کا حضور نظام کی طبیعت پر بھی بوجھ تھا، چنانچہ اپنی ناسازیٔ طبیعت کے باوجود وہ عوام کا ردِعمل اور تاثرات معلوم کرنے کے لیے موٹر میں بیٹھ کر قائداعظم کی رہائش گاہ کے سامنے سے گزرے۔ جب عوام نے سواری کو آتے دیکھا، تو میری طرح بہت سے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ ان میں سے بیشتر لوگ پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔ عوام کے ردِعمل کی اس سے زیادہ کیا وضاحت ہو سکتی تھی۔

اسی دورے میں حیدرآباد کی خواتین نے قائداعظم سے اپنے ایک جلسے میں شرکت کی درخواست کی۔ حیدرآباد میں سخت قسم کے پردے کا رواج تھا۔ رضامندی کی صورت میں قائداعظم کو اس میں تنہا جانا پڑتا، مگر عورتوں کے پیہم اصرار سے متاثر ہو کر حامی بھر لی۔ چنانچہ زمرد محل ٹاکیز کے وسیع ہال میں بڑی شان اور اہتمام سے یہ جلسہ ہوا۔ اس جلسے کے شرکاء میں سے بہت سی خواتین اب پاکستان میں موجود ہیں۔ قائداعظم سٹیج پر تنہا تھے اور چاروں طرف خواتین ہی خواتین تھیں جو قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک باپ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے درمیان بیٹھ کر انھیں نصیحت کر رہا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر جو تقریر کی، وہ طبقۂ اناث کے لیے معاشرے میں اس کے صحیح اور جائز مقام اور اس کے فرائض کی نشاندہی کرتی ہے:

’’مجھے خوشی ہے کہ خواتین کے طبقے میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ بعض خواتین مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ ہم کیا

قائداعظم نے میرے تذبذب کو دیکھ کر اپنی فراست سے اندازہ لگایا اور بولے:

’’مجھے معلوم ہے...... کامیابی نہیں ہوئی۔‘‘

کریں۔ ہم کو مرد آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ جب ہم نے مسلم لیگ کو قائم کیا، تو ہمارے بھائی بند اُس کی ترقی کے راستے میں روڑے اٹکاتے تھے، مگر اللہ کے فضل سے وہ رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں۔ آپ لوگ اپنے مردوں کو سمجھائیے کہ مرد و عورت کے اشتراک کے بغیر معاشرے کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جو کام آپ کر سکتی ہیں، وہ مرد نہیں کر سکتے۔ آپ کا پہلا اور اہم کام تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اگر آپ تعلیم یافتہ نہ ہوں گی، تو آپ کے بچے بھی تعلیم سے محروم رہیں گے۔ بچوں کو صحیح طور پر تربیت دینا اہم کام ہی نہیں، بلکہ قوم کی ایک عظیم خدمت ہے۔ اس کے بعد غریب ساتھیوں سے ہمدردی کا مسئلہ ہے۔ آپ لوگ معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ دیجیے، یہ کام بھی آپ بہت اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔ اس کے لیے آپ کو روپے پیسے کی ہی نہیں، بلکہ اپنے راحت و آرام کی بھی قربانی دینی ہوگی۔ اسی طرح آپ اپنی قوم کو مضبوط بنانے میں ایک موثر کردار ادا کر سکتی ہیں......‘‘

یُوں تو قائداعظم کی بہت سی تصویریں موجود ہیں، مگر ایسی تصویر جس میں وہ کئی سو عورتوں کی جھرمٹ میں تن تنہا دُلہا بنے بیٹھے ہوں، ایک نادر چیز ہے۔ ایک مرتبہ میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے دورانِ گفتگو عرض کیا کہ میں آپ کو آپ کے بھائی کی ایک ایسی تصویر پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ کے پاس بھی نہ ہوگی۔ انھوں نے فرمایا: ’’یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے پاس ان کی سب

تصویریں ہیں۔''

میں تصویر کی ایک بڑی کاپی اپنے ساتھ لے گیا تھا، فوراً پیش کر دی۔ انھوں نے تصویر کو حیرت سے دیکھا اور کہا ''واقعی یہ تصویر میرے پاس نہیں تھی۔'' گویا انھوں نے بھی اس تصویر کے نادر ہونے کی تصدیق کر دی۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں میرا تقرر بحیثیت ایجنٹ جنرل برائے مملکت حیدرآباد ہوا۔ کراچی آ کر اپنی نئی ذمہ داری سنبھالتے ہی پہلی دشواری جس سے مجھے دوچار ہونا پڑا، وہ اپنے سفارتی رُتبے کی حیثیت کو برقرار رکھنے کا مسئلہ تھا جس کے لیے مجھے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔ میرے تقرر کے کاغذات کی عبارت سے یہ مفہوم لیا گیا کہ یہ سفارتی رُتبہ نہیں، بلکہ اس کی حیثیت اس سے کم درجے کی ہے، اس لیے تقرر کے خریطے کی صدرِ مملکت کے سامنے رسمی پیشکش کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس تجویز کے خلاف سخت احتجاج کیا، کیونکہ اگر پاکستان میں حیدرآباد کے نمائندے کی مناسب پذیرائی نہ ہوا اور وہ ان مراعات اور سفارتی احترام کا مستحق نہ سمجھا جائے جو بھارت میں اس کے ہم رُتبہ نمائندے کو حاصل ہیں، تو یہ ایک بڑا المیہ ہوگا اور ہمارے مفاد پر بڑی کاری ضرب لگے گی۔ میری دلیل یہ تھی کہ میرے تقرر کی منظوری دے کر پاکستان نے حیدرآباد کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لیا ہے، اس لیے اس اقدام کے منطقی نتیجے کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔ بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ صورتِ حال کی وضاحت کر کے فیصلہ قائداعظم پر چھوڑ دیا جائے۔ میں مطمئن ہوگیا، کیونکہ بطور ایک عقیدت مند کے مجھے یہ یقین تھا کہ وہ ہر پہلو پر پورا غور کیے بغیر فیصلہ نہیں دیں گے اور ان کا فیصلہ بہرصورت دانشمندانہ ہوگا۔ چار پانچ دن کے بعد مجھے یہ اطلاع ملی کہ اگلے دن مجھے قصرِ گورنر جنرل میں اپنا خریطہ پیش کرنا ہے، یعنی انھوں نے اس بارے میں میرے موقف کی حمایت کی ہے: چنانچہ ۱۰ اپریل کو میری پیشی ہوئی جو میری زندگی کی خوشگوار ترین یادوں میں سے ہے۔ جونہی میں قائداعظم کے کمرے میں داخل ہوا؟ میں نے دیکھا کہ وہ صوفے پر ایک طرف بیٹھ کر کچھ کاغذات پڑھنے میں منہمک ہیں۔ سامنے تپائی پر کچھ مسلیں اور چند کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ایک نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مصافحہ کیا۔ میں نے کاغذات پیش کیے۔ انھوں نے حضور نظام کا خط کھولا اور غور سے پڑھا۔ ان چند لمحات میں مجھے ان کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اللہ غنی، جسمانی اعتبار سے کتنا کمزور اور منحنی انسان مگر اپنے کردار، بلند حوصلگی اور استقامت کے اعتبار سے کتنی بڑی عظمت کا مالک ہے۔ اس نحیف اور نزار جسم میں ساری قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ انھوں نے برسوں کی سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا، اس کی منزل کو متعین کیا اور پھر اپنی خداداد فراست اور ذہانت سے ہزار دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود اسے صحیح سلامت منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ تپائی پر رکھی ہوئی کتابوں کے سرورق پر نظر پڑی، تو معلوم ہوا کہ وہ زیادہ تر دستوری قانون سے تعلق رکھتی تھیں۔ معمارِ پاکستان کی دُوررس نگاہوں کو شاید مستقبل کے دھندلکے میں کچھ نظر آ رہا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اپنی حینِ حیات میں نوزائیدہ مملکت کے دستور کی گتھیوں کو بھی سلجھا دیں۔ کاش! موت و حیات کا مالک انھیں زندگی کے چند برس اور بخش دیتا تاکہ قوم کا باپ اپنی بنائی ہوئی مملکت کو دستور کا تحفہ بھی دے جاتا اور یہ مسئلہ لاینحل ایک بار طے ہو جاتا اور ان کی اولاد، وراثت کے جھگڑوں میں نہ پڑتی۔

قائداعظم نے میرا پیش کردہ خط پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا۔ مجھ سے حضور نظام کی خیریت دریافت کی اور حیدرآباد کے حالات کے بارے میں چند سوالات کیے۔ اس کے بعد وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوگئے، پھر ایک دم میری طرف دیکھ کر پوچھا:

''کیا تم خاص حیدرآباد کے رہنے والے ہو؟''

جب میں نے اپنی جائے پیدائش کا نام لیا اور حیدرآباد سے اپنے تعلق کی وضاحت کی، تو انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے خاص انداز میں فرمایا:

''ایک پنجابی نژاد پاکستان میں حیدرآباد کی نمائندگی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کے لیے آیا ہے، بہت خوب۔'' پھر فرمایا ''اقطائے ہند کے ہر گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں کا حیدر آباد کے ماحول میں ایک سانچے میں ڈھل جانا مجھے بہت پسند ہے۔ اگر یہ لوگ متحد رہے اور خودداری اور آزادی کی اُمنگ ان میں برقرار رہی، تو پھر کوئی طاقت انھیں زیر نہیں کر سکتی۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہو اور عوام غیر اسلامی تعصبات کو جو اُن کے لیے کسی وقت بھی خطرے کا موجب ہو سکتے ہیں، ختم کر دیں اور اس طرح سے اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر بنائیں۔'' وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے، مگر کہتے کہتے رُک گئے اور گفتگو کا رُخ میرے مشن کی طرف موڑ دیا۔ اس میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور یقین دلایا کہ اُس کی کامیابی میں نوابزادہ لیاقت علی خان ہر قسم کی مدد دیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے یہ کہتے ہوئے رخصت کی اجازت دے دی کہ اگر مجھے کوئی اہم یا خاص بات اُن تک پہنچانا ہو، تو میں اُن کے سیکرٹری سے رابطہ پیدا کروں، وہ مختصر نوٹس پر ملاقات کا موقع دیں گے۔ حضرت قائداعظم سے میری یہ پہلی سرکاری ملاقات تھی۔ مجھے ایک انتہائی نازک اور اہم مشن پر بھیجا گیا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر پاکستان کے سربراہِ مملکت نے جس مشفقانہ انداز اور توجہ سے میری بات سنی اور ہمت افزائی کی، اس سے میرے جسم میں چلوؤں خون بڑھ گیا اور میں قصرِ گورنر جنرل سے ایک نیا عزم اور ارادہ لے کر واپس ہوا۔

اس کے بعد میں وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ایک دن قائداعظم نے مجھے خود طلب فرمایا اور اس ملاقات میں اپنے ذرائع سے حاصل کی ہوئی اطلاعات کی بنا پر مجھ سے حیدر آباد کے حالات کے بارے میں متعدد سوالات کرتے رہے۔ ان سوالات سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ہر معاملے کو کتنی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے مضمرات پر کتنے ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں۔ جب میں نے انھیں یقین دلایا کہ باوجود گوناگوں مشکلات کے حیدر آبادی عوام کے حوصلے بلند ہیں اور ان میں اپنی آزادی کے تحفظ کی اُمنگ ہے، تو انھوں نے فرمایا:

''استقامت اور ایثار کا جذبہ ہی ایک قوم کے موٴقف میں کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔'' اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ نظام نے اپنی دولت کے بارے میں بھی کچھ سوچا۔ میں نے امید ظاہر کی کہ ان شاء اللہ جلد ہی کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ اسی ضمن میں میں نے عرض کیا کہ منجملہ دوسرے ضروری مسائل کے یہ مسئلہ بھی فوری توجہ کا محتاج ہے، اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ خود حیدر آباد جا کر حضور نظام کو صورتِ حال سے واقف کراؤں اور جلد کوئی فیصلہ کرنے کے لیے توجہ دلاؤں۔ یہ سنتے ہی قائداعظم نے مجھ سے سوال کیا ''تم نظام کو کب سے جانتے ہو؟'' میرا جواب سننے پر فرمایا ''تم سے زیادہ عمر رسیدہ اور زیادہ تجربہ کار لوگ ان کو قائل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں، بہرحال میں تمھیں روکتا نہیں، اگر تم جانا چاہتے ہو، تو جاؤ، مگر ذرا احتیاط رکھنا، کیونکہ میری اطلاع ہے کہ بھارتی حکومت پہلے ہی سے تمھاری فکر میں ہے۔ واپسی پر مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا؟'' یہ میں کیسے پوچھتا کہ زیادہ عمر رسیدہ لوگ کون تھے جن کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ آج کی گفتگو کے انداز سے یہ صاف ظاہر تھا کہ انھیں ہمارے موٴقف سے ہمدردی ہی نہیں، بلکہ خاص دلچسپی ہے۔

چنانچہ میں چھپتے چھپاتے حیدر آباد گیا۔ بدقسمتی سے مجھے وہاں اپنے مشن میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی اور مسئلہ زیرِ بحث کی غیر یقینی حالت قائم رہی۔ واپسی پر جب میں قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا:

''تمھیں اپنے مشن میں کامیابی ہوئی؟''

میں ابھی اپنی ناکام کوشش کی ناخوشگوار حقیقت کا

انھوں نے مجھ سے پوچھا:
''تم 'نظام' کو کب سے جانتے ہو؟''

فوری انکشاف نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنے ذہن میں جواب دینے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ قائداعظم نے میرے تذبذب کو دیکھ کر اپنی فراست سے صورتِ حال کو خود ہی بھانپ لیا اور یہ کہہ کر میری مشکل حل کر دی:

''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمھیں کامیابی نہیں ہوئی۔''

مجھے لامحالہ اس حقیقت کو دبے الفاظ میں تسلیم کرنا پڑا۔ اس ناخوشگوار اعتراف کی شدت کو کم کرنے کے لیے میں نے عرض کیا:

''حضور نظام نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری عرضداشت پر جلد غور کریں گے۔''

قائداعظم نے بلاتوقف جواب دیا ''وہ تم کو ویسا ہی ٹال رہے ہیں جیسا کہ دوسروں کو ٹالتے رہے ہیں۔'' پھر ذرا رُک کر فرمایا:

''تم کو معلوم ہونا چاہیے جو لوگ زندگی کی حقیقتوں سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں تاریخ میں اُن کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

مسلمانوں کے مسلمہ قائد جن کی فراست کا زمانہ معترف ہے، کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک جملے میں ان کی دوررس نگاہوں نے حیدرآباد کے مستقبل کا خاکہ سمو دیا ہے۔ میں واپسی پر راستے میں دعا مانگ رہا تھا:

''بارالٰہا! میری دو پشتوں نے حضور نظام کا نمک کھایا ہے، انھیں بروقت اور صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق ارزانی فرما۔ ایسا نہ ہو ان معاملات میں اُن کی ضرورت سے زیادہ احتیاط اُمتِ مسلمہ پر اُن کے اَن گنت احسانات اور اُن کی ذاتی خوبیوں پر پانی پھیر دے۔''

تین چار دن کے بعد پھر میں جب قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میں جو کچھ انھیں بتانے آیا تھا، ان میں سے بیشتر باتیں انھیں پہلے سے معلوم تھیں بلکہ اُن کے بارے میں خود میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس سے واضح تھا کہ حیدرآباد کے حالات کے متعلق جتنی رپورٹیں آتی ہیں وہ نہ صرف انھیں غور سے پڑھتے ہیں بلکہ ان کے محرکات اور مضمرات کے بارے میں بھی سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔

حیدرآباد کی عام صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے ایک دم اپنی گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ ''بعض لوگ مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ میں حیدرآباد سے کشمیر تبادلہ کرلوں، اس تجویز کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟'' اس سوال کا جواب میرے لیے فی البدیہہ دینا آسان نہیں تھا، کیونکہ میں خاص موقف کی حمایت اور تشہیر کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس سے سرمو تجاوز کرنا یا اپنی رائے کے مطابق اس کی نوعیت کو بدل دینا میرے حیطۂ اختیار میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا بھی شدید احساس تھا کہ جو کچھ میں کہوں اُس کے اظہار میں ان آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو ایک سربراہِ مملکت کے سامنے جو قائداعظم بھی ہیں، لازم ہیں، میں نے جواب دینے میں ذرا توقف کیا۔ اتنے میں قائداعظم نے انگشتِ شہادت میری طرف اُٹھا کر اپنے ہی پوچھے سوال کا خود ہی جواب دے دیا:

''کیا تم بھیڑ بکریوں کا گلہ ہو جو میں ایک گلے کا دوسرے گلے سے تبادلہ کرلوں؟ یہ بتانا تمھارا کام ہے کہ تم اس قسم کے تبادلے کے لیے تیار ہو۔ اگر تم نہیں چاہتے، تو دنیا کی کوئی طاقت تمھیں اس پر مجبور نہیں کرسکتی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں مجبور کرنا تو درکنار، اس بارے میں دوستانہ ترغیب دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ تمھیں خود کسی شخصیت یا خارجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ میں نے اس تجویز کو پیش کرنے والوں پر یہ بات واضح کردی ہے۔''

مجھے یہ سن کر پریشانی بھی ہوئی اور یک گونہ اطمینان بھی۔ پریشانی اس لیے ہوئی کہ امت مسلمہ میں ذمہ دار افراد ایسے بھی ہیں (ظاہر ہے کہ ذمے دار اصحاب ہی نے قائداعظم سے یہ بات کہنے کی جسارت کی ہوگی) جو ہماری آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ یہ عظیم انسان جو ایک

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

غیور قوم کا قائد ہے، اس قسم کی سودا بازی کا روادار نہیں۔ جس طرح سے اُس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنے آہنی عزم اور ناقابلِ شکست ارادے سے خود ارادیت کا حق تسلیم کرا کے ایک نئی مملکت کی بنیاد ڈالی، اسی عزم اور ارادے سے وہ ہر قوم اور ملک کی خود ارادیت کے حق کا موید اور ضامن ہے اور گوشت پوست سے بنے ہوئے اور جذبات اور احساسات رکھنے والے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کا گلہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ آج اُن کی باتوں سے میرے دل میں اُن کی عظمت اور اصول پسندی کا پہلے سے بھی زیادہ احترام ہوگیا۔

ایک مرتبہ مجھے قائداعظم کی خدمت میں ایک اہم پیغام پہنچانے کی ہدایت ہوئی۔ اُن سے کئی بار ملاقاتوں میں مَیں بہت حد تک اُن کی طبیعت اور سوچ و فکر کے طریقے سے واقف ہوگیا تھا۔ اس لیے مجھے خیال تھا کہ معاملے کی نزاکت اور اہمیت کے پیشِ نظر وہ اُس پیغام کو تحریری شکل میں دیکھنا پسند کریں گے! چنانچہ میرا خدشہ سچ نکلا۔ میں نے جب تحریر کو حاصل کرنے میں دشواری کا ذکر کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ جس طرح سے بھی اپنی حکومت سے دوسری ہدایات حاصل کرتا ہوں انہی ذرائع سے یہ تحریر بھی حاصل کی جائے۔ کسی نہ کسی طریقے سے اُن کے حکم کی تعمیل ہوئی اور وہ تحریر لے کر میں ہوائی جہاز سے کوئٹہ گیا۔ وہاں ہوٹل میں اپنا سامان چھوڑ کر زیارت کے لیے روانہ ہوگیا جہاں وہ اس وقت مقیم تھے۔ دوپہر کو وہاں پہنچا، یہ قائداعظم کے آرام کا وقت تھا۔ انھیں میرے آنے کی اطلاع تھی، اس لیے وہ منتظر تھے۔ میں نے اُن کی خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ تحریر پیش کی۔ انھوں نے پہلے تو اُسے وصول کرنے کے طریقے کے بارے میں مجھ پر جرح کی، پھر اسے غور سے پڑھا۔ میں نے اتنی دیر میں اُن کے چہرے پر تھکان اور ضعف کے آثار دیکھے۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ قوم کے اس محسن کے آرام میں خلل انداز ہوا جس کی جان امت مسلمہ کے لیے اتنی قیمتی ہے۔ خط پڑھ کر انھوں نے دوسطری جواب لکھوایا:

''تم نے جو حکمتِ عملی اور طریق کار اختیار کیا ہے وہ یقیناً ایک باعزت راستہ ہے۔ مستقل مزاجی اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ میری ہر ممکنہ حمایت تمھارے ساتھ ہوگی۔''

یہ پرچہ میرے حوالے کرتے ہوئے قائداعظم نے مجھ سے پوچھا:

''تم ٹھہرو گے یا واپس جاؤ گے؟''

میں اتنے لمبے سفر کے بعد تھکا ہوا تھا اور چاہتا تو تھا کہ کچھ دیر آرام کروں، مگر ان کی طبیعت سے بخوبی واقف تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ کس طرح کا جواب چاہتے تھے، چنانچہ میں نے عرض کیا ''حالات کی نزاکت کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں واپس چلا جاؤں، بجز اس کے کہ وہ مجھے ٹھہرنے کا حکم دیں۔'' اُن کا جواب عین اُن کی فطرت اور طبیعت کے مطابق تھا:

''ٹھیک ہے، ہم سب کو بہت کام کرنا ہے۔ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

یقین ہے قائداعظم کے منہ سے ''واہ'' کہ مجھے حیدرآبادی دستار اور شیروانی پہنے دیکھ کر نکلا

چنانچہ میں فوراً ہی کوئٹہ واپس آگیا۔ ایک ایسا شخص جس کی صحت اچھی نہ ہو، اس حالت میں بھی کام کی وہی دھن ہو اور ایک صحت مند انسان کی طرح اسے وقت کی قیمت کا اتنی شدومد سے خیال ہو، میری دانست میں فرض شناسی کا شاہکار ہے۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ بطورِ خاص سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی رسم ادا کرنے کے لیے کوئٹہ تشریف لائے۔ ہوائی اڈے پر اُن کا بے مثال استقبال ہوا۔ غیرملکی سفرا کی صف میں مَیں بھی موجود تھا۔ حیدرآبادی روایات کا تقاضا تھا کہ سربراہِ مملکت کے سرکاری استقبال کے موقع پر میں درباری لباس پہنوں،

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

صبح سویرے قصرِ گورنر ہاؤس میں جا کر جو منظر دیکھا اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا

چنانچہ میں نے حیدر آبادی دستار اور شیروانی پہن رکھی تھی۔ قائداعظم دوسرے سُفرا سے ہاتھ ملاتے ہوئے جب میرے پاس آئے تو ہاتھ ملایا اور مسکرا کر ''Good'' کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کے مُنہ سے یہ کلمہ میرے لباس سے متعلق تھا۔ وہ خود بھی شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ یہ کلمہ کہتے ہوئے اُن کے ذہن میں کیا تھا، میں نہیں کہہ سکتا۔ شاید انھوں نے اس حیدر آبادی روایت کو پسند کیا۔

قائداعظم کو جس حالت میں مَیں نے زیارت میں دیکھا تھا اس موقع پر وہ مجھے اس سے بھی زیادہ کمزور اور نحیف دکھائی دیے۔ ایسی حالت میں غالباً مناسب ہوتا کہ انھیں خاص طور پر اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے تکلیف نہ دی جاتی لیکن اُن کی فرض شناسی کا جذبہ ایسا تھا کہ اگر انھیں منع بھی کیا جاتا، شاید وہ تب بھی آجاتے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ دولتِ پاکستان کی معیشت کو مستحکم کرنے والے ادارے کی افتتاحی رسم ہو اور اس موقع پر بانی پاکستان دعائے خیر کے لیے موجود نہ ہو!

یہ میری قائداعظم سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد ان کا قیام کوئٹہ اور زیارت میں ہی رہا اور اُن کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے میں نے بھی انھیں تکلیف نہیں دی۔ اُس کے بعد ۱۱ر ستمبر کو اُن کے جسدِ خاکی کو ہی دیکھا۔ مجھے رات ہی کو کسی وقت ٹیلی فون سے اطلاع مل گئی تھی کہ قوم کا عظیم باپ اُسے داغِ یتیمی دے کر رخصت ہو گیا ہے۔ صبح سویرے قصرِ گورنر جنرل میں جا کر جو سماں میں نے دیکھا اُسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ عوام کا ایک جمِ غفیر روتا، پیٹتا، دھاڑیں مارتا ہوا پروانہ وار آتا تھا اور رو پیٹ کر واپس چلا جاتا تھا۔ وہ پروانے کرتے بھی کیا، جب کہ وہ شمع ہی گل ہو گئی تھی جس کے گرد منڈلاتے تھے۔ یہ سماں اتنا اثر انگیز تھا کہ جذبات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اُس دن یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان کی صحیح عظمت اُس کے کردار کی بلندی پر مبنی ہوتی ہے اور عوام کی بے لوث خدمت کرنے ہی سے اُس کے دلوں میں لگاؤ اور محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد قائداعظم کا جنازہ اُٹھا اور کس شان سے اُٹھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ پیادہ پا قصرِ گورنر جنرل سے اُن کی آخری آرام گاہ تک آیا، سوگوار قوم کے افراد ہزاروں کی تعداد میں ماتمی جلوس کے دونوں جانب آنسو بہاتے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ ایسا منظر تھا کہ اس کو دیکھ کر پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ خوش قسمتی سے مجھے جائے تدفین پر ایسی جگہ ملی کہ قائد مرحوم کو سپردِ خاک کرنے کے سارے مراحل میری آنکھوں کے سامنے طے ہوئے۔ تدفین سے پہلے اور بعد مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی ولولہ انگیز تقریر سے بے قابو عوام کو صبر و شکر کی تلقین کرتے رہے۔ اس طرح مسلمان قوم کا وہ مہِ کامل کراچی کی خاک میں موت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں چھپ گیا۔ مشیتِ ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہے، لیکن جانے والے کی عظمت اور اس کی یاد بلند و بالا خوشنما مقبرے ہی میں نہیں، بلکہ مسلمانانِ پاکستان کے دلوں میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

آسمان اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

قائداعظم کی رحلت سے مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے جو نقصان پہنچا، وہ ناقابلِ تلافی تھا، لیکن حیدر آبادی مسلمان جو انتہائی خطرناک حالات سے دوچار تھے، بالکل بے سہارا ہو گئے۔ اس کمزور اور نحیف انسان کا وہ دبدبہ اور رُعب تھا کہ حیدر آباد پر حملے کی تیاری کرتے ہوئے بھی بھارت آخری قدم اُٹھانے میں ہچکچاتا تھا۔ جونہی قائداعظم کی آنکھ بند ہوئی، اُس نے سوگوار قوم کی بدحواسی سے فائدہ اُٹھا کر حیدر آباد پر بھرپور حملہ کر دیا اور قائداعظم کی رحلت کے چند روز بعد ہی ۸۰۰ برس پُرانی ایک اسلامی حکومت بھی ختم ہو گئی۔ رہے نام اللہ کا۔ ■

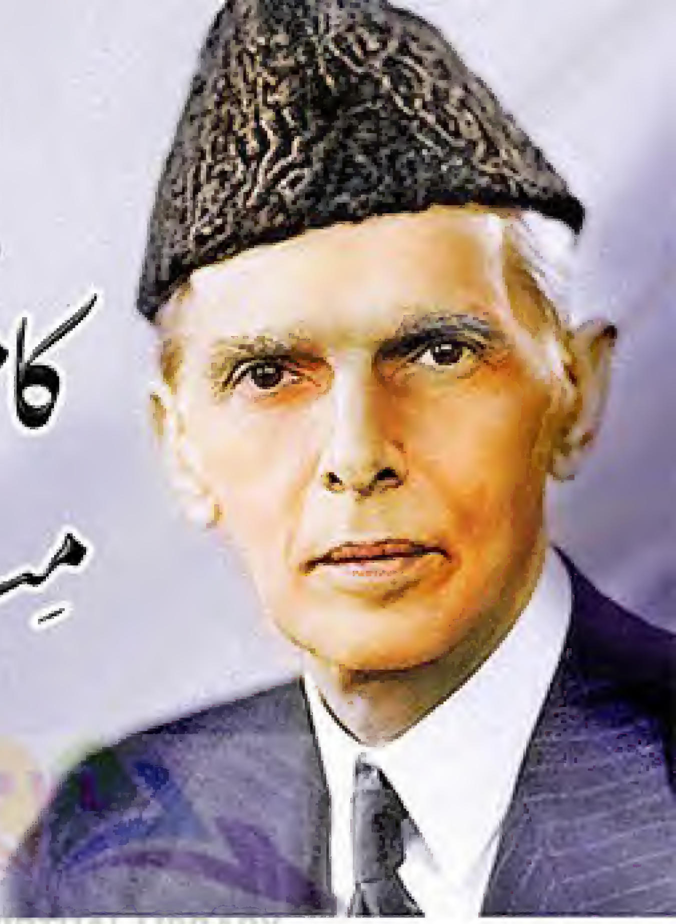

وہ دیکھنے کو اپنی نظر دے گیا ہمیں

کامیاب اور مثالی زندگی

گورنر جنرل بن کر انھوں نے مسلم لیگ کا صدر رہنے سے کیوں انکار کیا؟

محمد شہیر عادل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

زندہ قومیں ہمیشہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ قائداعظم نے ایک مثالی زندگی گزاری۔ آپ کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا کوئی شخص اتنا راست باز، اس قدر بے باک اور اتنا دیانت دار بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کی سیاسی بصیرت اور بے مثل فہم و تدبر پر بھروسہ کرتے ہوئے ۱۹ر جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبالؒ نے قائداعظمؒ کو لکھا "ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جو اپنی قوم کو اس طوفان سے، جو ہندوستان پر ٹوٹنے والا ہے، بچا سکتے ہیں اور اس لیے قوم کو حق ہے کہ وہ آپ سے راہنمائی کی امید رکھے"۔ قائداعظمؒ نے ایسی زندگی گزاری ہے کہ وہ اپنی زبانِ عمل سے یوں کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں:

یوں کی ہے زندگی، کہ ہوئے فخرِ زندگی
اے موت یوں مرے ہیں کہ بالکل امر ہیں ہم
ہر گام پر نقوش ہیں اپنے بہ راہِ یار
مر کر بھی رہرووں کو دلیلِ سفر ہیں ہم

قائداعظم دیکھنے میں دبلے پتلے اور نحیف و نزار تھے مگر جو شجاعت اور دلیری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جتنے بے باک اور نڈر وہ تھے کوئی دوسرا نہ تھا۔ ان کی ساری شخصیت ان کے اس زریں قول کی آئینہ دار تھی کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، کبھی سودے بازی نہ کی جائے۔ جتنے بے لوث، ہر طرح کے لالچ سے پاک اور ایثار پیشہ وہ تھے، غریب اور نادار عوام کا جتنا احساس اور ان سے جتنی ہمدردی انھیں تھی، نازک اور دل دہلا دینے والے حالات میں اپنے جذبات پر جتنا کنٹرول انھیں حاصل تھا، یقین محکم اور خود اعتمادی کی جو بے اندازہ دولت اللہ تعالیٰ

نے ان کو عطا کی ہوئی تھی، فراست و بصیرت کی جو نعمت ان کے حصے میں آئی تھی، حکمت و تدبر کے خیر کثیر سے جو وافر حصہ ان کو ملا تھا، ان کی تحریر و تقریر جتنی واضح، دوٹوک، موثر اور دلنشیں ہوتی تھی، ان کے خدوخال میں جو جاذبیت، ان کی آنکھوں میں جو چمک، ان کے لباس کی تراش خراش میں جو نفاست اور حسن تھا اور ان کی پوری شخصیت میں جو جلال و جمال تھا اس کی مثال دنیا کے کسی بڑے لیڈر میں نہیں ملتی۔ سچی بات یہ ہے سمندر چاہیے اس بحر بیکراں لیے۔ ہم نے یہاں اُن کی زندگی کے چند پہلو مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

پُرخلوص، معاملہ فہم اور باصلاحیت قائد

قیادت کے لیے جن اوصاف کی ضرورت اولین اور ناگزیر حیثیت رکھتی ہے ان میں خلوص، دیانت اور صداقت کے ساتھ فراست اور معاملہ فہمی، صلاحیت کار اور قوم و پارلیمنٹ کا اعتماد سب سے زیادہ اہم ہیں۔ قوت فیصلہ اور فیصلوں پر استقامت و جرأت سے کاربند ہونے کا وصف بھی قیادت کے لیے بدرجہ اتم مطلوب ہے۔ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں اس ضرورت کا اظہار کچھ اس طرح کیا تھا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پاکستان نہ ایک ناکام ریاست تھا اور نہ ان شاء اللہ کبھی ہوگا، لیکن ملک کی اجتماعی زندگی میں سارے بگاڑ، فساد اور افراتفری کی بنیادی وجہ قیادت کی ناکامی اور صحیح قیادت کا فقدان ہے۔ اس قوم کو جب بھی اچھی قیادت میسر آئی ہے اس نے تاریخ کو نئی بلندیوں سے روشناس کیا ہے اور زوال اور انتشار کے ہر دور اور ہر پہلو میں قیادت ہی کے فساد کا پرتو دیکھا جاسکتا ہے۔

تحریک پاکستان کو قائداعظم محمد علی جناحؒ جیسی قیادت میسر آئی تو ۷ سال کے مختصر عرصے میں ایک منتشر قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی صورت میں سینہ سپر ہوگئی اور انگریزی سامراج اور ہندو کانگریس کی منظم قوت کا مقابلہ کرکے آزادی کی جدوجہد کو اللہ کے فضل اور اپنی حکیمانہ مساعی کے ذریعے کامیاب و کامران کیا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خاں کی قیادت نے نوزائیدہ ملک کو تمام مصائب، مشکلات اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود مضبوط و مستحکم کیا۔ تباہ شدہ معیشت کو بحال کیا، ڈیڑھ کروڑ مہاجروں کو خوش اسلوبی کے ساتھ نئی ریاست میں بسایا اور دس سال کی مختصر مدت میں علاقے کی ایک اُبھرتی ہوئی قوت کی حیثیت حاصل کرلی۔ ملائیشیا، سنگاپور اور جنوبی کوریا جو آج معاشی ترقی کے باب میں نمونے کی ریاستیں قرار دی جاتی ہیں، ان کے پالیسی ساز اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے اُس دور کے پاکستان کے معاشی منصوبوں سے خوشہ چینی کی تھی، لیکن افسوس کہ جس قوم نے یہ چراغ جلائے تھے اور جس کے چراغوں سے دوسروں نے اپنے چراغ روشن کیے تھے، وہ مفاد پرست سیاست دانوں اور طالع آزما فوجی جرنیلوں کی ایسی گرفت میں آگئی:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک سچا، کھرا اور باعمل

آج کل باقاعدہ ایک مہم چلائی جارہی ہے کہ قائداعظم سیکولر مائنڈ رکھتے تھے، وہ پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے، پاکستان کوئی نظریاتی ریاست نہیں ہے، اس لیے نظریہ پاکستان کی اصطلاح کا تحریک پاکستان یا قائداعظم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ”پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ“ کے نعرے کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ یہ تو ایک نظم کا مصرع ہے اس کا قائداعظم سے بلاوجہ تعلق جوڑا جاتا ہے۔ یہاں مولانا مودودیؒ کے ایک انٹرویو کی اہم باتیں اور مختصر ذیل میں دیا جارہا ہے یہ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء کے ہفت روزہ ایشیا میں چھپا تھا:

قائداعظم کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا محترم نے فرمایا: ”مجھے اس بارے میں کبھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

معمولی سا بھی شک نہیں رہا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی مملکت بنانے کے خلوص دل سے آرزومند تھے۔ میں قائداعظم کو اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے والی ایک دیانتدار اور صاحبِ کردار شخصیت تصور کرتا ہوں کیونکہ جب سے میں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی، قائداعظم ان مسلمان قائدین میں سے ایک تھے جن کا میں بے حد احترام کرتا ہوں اور ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے ذہن و خیال میں بھی یہ بات نہیں رہی کہ قائداعظمؒ اپنے ضمیر اور اصولوں کے خلاف عمل کر سکتے۔"

ایک شخص عظیم ترین شخصیتوں کے ساتھ اختلاف بھی کر سکتا ہے خواہ یہ شخصیتیں زندہ ہوں یا ہم سے بچھڑ گئی ہوں اور میں بھی بعض اختلافات رکھتا ہوں۔ مگر میں نے اپنے اختلافات کا اظہار ہمیشہ شائستگی اور استدلال کے ساتھ کیا ہے۔ اختلاف رائے کو مخالفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہرحال مجھے اس کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظم پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ آیا یہ حقیقت ہے کہ پاکستان دوقومی نظریہ کی بدولت وجود میں آیا؟ مولانا مودودیؒ نے کہا کہ سچ بات یہ ہے کہ برصغیر میں جب سے اسلام آیا اور اب تک برصغیر کی غیر مسلم آبادی علٰحدہ اور منفرد حیثیت رکھتی تھی، صرف برصغیر کے مسلمان ہی نہیں پوری دنیا میں بسنے والے مسلمان خود کو غیر مسلمانوں سے قطعی مختلف تصور کرتے تھے اور مسلمانوں نے خود کو دوسری قوموں میں ضم کرنے کا تصور تک نہیں کیا۔

تحریک پاکستان کے دوران برصغیر کے مسلمانوں نے لفظ ملت کی جگہ قوم کا لفظ استعمال کیا اور یہ دونوں الفاظ بہرطور ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

ان علاقوں کے مسلمانوں نے جو بھارت میں ہیں، تحریک پاکستان میں پوری قوت سے حصہ لیا تھا حالانکہ انہوں نے کبھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ وہ پاکستان کا حصہ بن جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت کے مسلمانوں نے بحیثیت ایک قوم تحریک میں حصہ لیا تھا، مختلف قومیتوں کی حیثیت سے نہیں۔ یہ کہنا تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہوگا کہ مختلف قومیتوں نے اپنے طور پر برطانوی اقتدار کے خلاف جدوجہد کی تھی اور اسی جدوجہد کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔ اگر برصغیر کے مسلمانوں نے قومیتوں یا صوبائی یا علاقائی یا لسانی سطح پر یا ان صورتوں یا ان حیثیتوں میں جدوجہد کی ہوتی تو پاکستان ہرگز قائم نہ ہو پاتا۔

ایک دیہاتی کا جواب

آپ کے ناقدین کو یقین تھا کہ آپ کبھی بھی ایک پاپولر لیڈر نہیں بن سکتے، کیونکہ جب ایک لیڈر اپنی قوم کی زبان ہی روانی سے نہیں بول سکتا تو وہ کس طرح ان کے دل میں گھر کر سکتا ہے مگر انہوں نے جس یقین اور عزم کے ساتھ مسلمانوں کا مقدمہ لڑنا شروع کر دیا تھا اس کے باعث مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہیں گے، سچ کہیں گے وہ کبھی انہیں دھوکہ نہیں دیں گے، کبھی سیاست کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک دیہاتی جو ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کے لاہور کے جلسہ میں شریک تھا، کسی اخبار نویس نے اس سے پوچھا کہ قائداعظمؒ جو انگریزی بول رہے ہیں کیا وہ تم کو سمجھ آ رہی ہے جو تم اتنے خوش اور مطمئن نظر آ رہے ہو؟ دیہاتی نے کہا، مجھے ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا لیکن مجھے یقین کامل ہے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے میرے فائدے کے لیے کہہ رہا ہے۔ (تاریخ میں ایسے بہت کم لیڈر پائے جاتے ہیں جن پر ان کی قوم نے آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا ہو)

برطانوی وزیراعظم کی ترغیب

آج وطن عزیز میں وہ وقت آ گیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ یہاں ہر آدمی کو خریدا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں ناقابل بیان کہانیوں سے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ قائداعظم کی روشن مثال ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمارے دل خوشی سے باغ باغ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ہو جاتے ہیں کہ ہمارا رہبر و رہنما ایک ایسا انسان تھا جس کو انگریزوں اور ہندوؤں نے بڑی بڑی پیشکشیں کیں لیکن اُس نے اُن کی پیشکشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ تاریخ کی کتابوں میں بہت سے واقعات اُن کی عظمتِ کردار کے محفوظ ہیں، ہم یہاں صرف ایک واقعہ درج کر رہے ہیں:

برطانوی وزیراعظم لارڈ ایمز لے میکڈانلڈ کو قائداعظمؒ سے براہ راست معاملات کا سابقہ پڑا تو اسے ایک غیر متوقع تجربے سے گزرنا پڑا۔ پیش نظر واقعہ کچھ یوں ہے کہ لارڈ ایمز لے میکڈانلڈ سے قائد کی ملاقات جاری تھی۔ انگریز وزیراعظم نے قائداعظم کو سیاسی منصب کی ترغیب شروع کی، اس کے دلائل یہ تھے:

''اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو دوسرا کیوں نہیں بن سکتا؟ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو دوسرا کیوں حاصل نہیں کر سکتا۔'' (یہ پیشکش قائداعظمؒ کے لیے ۱۹۳۵ء کے فیڈریشن ایکٹ کے حوالے سے کی جا رہی تھی)

یہ گفتگو سن کر قائداعظمؒ بغیر کوئی رسمی جملہ کہے اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لارڈ ایمز لے میکڈانلڈ نے حیرت و استعجاب کے ساتھ انہیں الوداع کہنے کے لیے ہاتھ بھی نہیں بڑھایا۔ ان کے چہرے پر افسردگی کے آثار تھے جیسے انہوں نے کوئی ناپسندیدہ بات سنی ہو۔ بہر حال مسلمانانِ برصغیر کے پرعزم راہنما نے وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے انگریز وزیراعظم سے یہ فقرے کہے۔

''اب میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ آپ کے خیال میں، میں کوئی بکاؤ مال (Purchasable) ہوں۔''

یہ سبب تھا ان کی سرد مہری اور افسردگی کا۔ قائداعظمؒ نے سیاست کے میدان میں اپنی دیانتداری اور اصول پسندی کو ہمیشہ دوسری باتوں پر مقدم رکھا تھا اور ان کے بدترین سیاسی حریف بھی یہ حقیقت تسلیم کرتے تھے کہ محمد علی جناحؒ Un-Purchasable شخصیت ہیں۔

کام، کام اور صرف کام

قائداعظم سخت محنت کرتے تھے اور اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک بے وقت موت کی جانب دھکیل دیا۔ جب وہ کام میں مشغول ہوتے تو بھوک تک کی بھی پروا نہ کرتے اور نہ اس کا خیال کرتے کہ کچھ لوگ جنھیں ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا ہے، ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بے انتہا انہماک سے کام کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وقت بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔

فروری ۱۹۴۸ء میں گورنر جنرل ہاؤس منتقل ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد جو چیز ان کی خرابی صحت کا باعث بن گئی، وہ پریشانی اور سخت محنت کا زبردست بوجھ تھا۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں انھوں نے سٹیٹ بینک کا افتتاح کیا تو وہ بہت دبلے اور بیمار نظر آرہے تھے۔ اس روز سے ان کی صحت مسلسل بگڑتی چلی گئی۔ اگرچہ ان کی صحت تیزی سے روبہ انحطاط تھی، تاہم ان کا جذبۂ پیکار بھی اتنی بلندیوں تک پہنچا تھا۔

ہر سیاسی عہدے سے دست برداری

قائداعظم محمد علی جناحؒ، پاکستان بننے سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو آپ وطنِ عزیز کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ وہ بابائے قوم تھے، قوم اُن کی دیوانی تھی لیکن وہ قانون پر عمل کرنے والے انسان تھے۔ وہ اس بات کو غلط سمجھتے تھے کہ ایک آدمی کے پاس ۲؍ عہدے ہوں۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو جانے والے قیامت آفریں مسائل سے ذرا سا دم لیتے ہی، ۴؍ ماہ بعد قائد عملاً ہر سیاسی عہدے سے دست کش ہو گئے۔

۱۴؍ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالقدینا ہال کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کا بنیادی ایجنڈا یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ بھی ۲؍ حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔ ایک مسلم لیگ انڈیا اور ایک مسلم لیگ پاکستان۔ معروف

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

صحافی اور محقق عزیز بیگ، اپنی کتاب ''JINNAH AND HIS TIMES'' کے صفحہ ۸۲۴ پر لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ (پاکستان) کی تنظیم کے حوالے سے ایک کمیٹی کے قیام کی تجویز منظور ہوئی۔ سوال اٹھا کہ اس کی سربراہی کسے سونپی جائے؟ فطری طور پر سب نے قائد کا نام تجویز کیا۔ قائد نے ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر دبنگ آواز میں کہا ''As Governor General of Pakistan, I cannot become member of any political party''

(یعنی پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت میں، میں کسی بھی سیاسی جماعت کا رُکن نہیں بن سکتا) اس پر چوہدری خلیق الزماں اور ملک فیروز خان نون کے نام تجویز کیے گئے۔ قائداعظم کے تذبذب کو بھانپتے ہوئے کسی نے محترمہ فاطمہ جناح کا نام تجویز کر دیا۔ عزیز بیگ اس اجلاس میں شریک ایک شخصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قائداعظم قدرے غصے میں آ گئے۔ انھوں نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور کچھ کہتے ہوئے اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ سننے والوں کو البتہ جو لفظ واضح طور پر سنائی دیا وہ تھا ''FOOLS''۔ ۷ دسمبر کو آپ باضابطہ طور پر مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ چوہدری خلیق الزماں پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر بنے اور بعد ازاں قائد کی زندگی میں ہی فروری ۱۹۴۸ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔

قبائلی علاقے سے فوج کی واپسی

قائداعظمؒ کی پاکستان کی عمارت کے ہر پہلو پر، بالخصوص اس کے کمزور پہلوؤں پر نظر تھی۔ وہ پاکستان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے بے چین تھے، خواہ اس کی خاطر انھیں اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے۔ انھوں نے (موجودہ) صوبہ خیبر پختون خواہ اور بلوچستان کے دور دراز سفر کیے اور قبائلیوں سے براہِ راست رابطہ قائم کیا۔ وہ اس وقت تک ایک جاذبِ نظر فیصلہ کر چکے تھے جو سرحدی علاقوں کے لوگوں کو بہت پسند آیا تھا۔ انگریز شورش پسند

قائد نے لارڈ ایمز لے میکڈاللہ سے کہا

''میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ آپ کے خیال میں مَیں کوئی بکاؤ مال ہوں؟''

قبائلیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے سرحدی علاقوں میں مسلح فوجیں رکھا کرتے تھے۔ قائداعظمؒ نے ان علاقوں سے فوجیں بلانے کا حکم دیا اور قبائلیوں سے کہا ''انگریز چلے گئے اور اب یہ تمہارا اپنا ملک اور ریاست ہے۔'' قائداعظم کو قبائلیوں پر جو اعتماد تھا وہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انھیں اب فطری طور پر یہ احساس ہو گیا کہ پاکستان کی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھنا اب ان کی ذمے داری تھی۔ انھیں اس کے شہری ہونے پر فخر محسوس ہونے لگا۔

تاریخ کا رُخ موڑنے والی شخصیت

اپنی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ سے اور شبانہ روز کی جاں توڑ محنت کے طفیل قائداعظم نے وہ بے مثال کامیابی حاصل کی جو دنیا کے نقشے پر پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں قائم و دائم ہے۔ قائداعظم کا کارنامہ کیا تھا، ذرا پروفیسر سٹینلے والپرٹ (مصنف جناح آف پاکستان) کے ناقابلِ فراموش الفاظ میں دیکھیے:

''بہت کم شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ ان سے بھی کہیں کم تعداد میں ایسی شخصیات ہوں گی جو دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیں مگر ایک نئی قوم اور ایک نئے ملک کی تخلیق کا سہرا تو شاید ہی کسی کے سر ہو۔ قائداعظمؒ نے یہ تینوں کارنامے کر دکھائے۔''

جس کو چلیں اٹھا کے وہ سر دے گیا ہمیں
زنجیر کاٹنے کا ہنر دے گیا ہمیں
رہنے کے واسطے نہ زمیں تھی نہ آسماں
ہم جس میں سر چھپائیں وہ گھر دے گیا ہمیں
ہم دیکھتے نہیں تو ہمارا قصور ہے
وہ دیکھنے کو اپنی نظر دے گیا ہمیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.paksbooksfree.pk

آنکھیں توجہ چاہتی ہیں!

- ✓ کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
- ✓ شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟
- ✓ کالا موتیا کیا ہے اور کیا اس کا علاج ہو سکتا ہے؟
- ✓ بچوں کو عینک کیوں لگتی ہے؟
- ✓ کیا عینک اُتر سکتی ہے؟ لیزر سے عینک اُتارنے کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- ✓ آپ نے اپریشن کروا لیا اب آپ کو کیا احتیاطیں کرنی چاہئیں؟
- ✓ کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آرہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ لیزر نقصان دہ ہوتی ہے؟

اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے لئے مندرجہ ذیل Website کا مطالعہ کریں

www.drasifkhokhar.com

آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اُردو کی واحد ویب سائٹ

ڈاکٹر آصف کھوکھر

ایم بی بی ایس (پنجاب)، ایم سی پی ایس (آئی)، ایم اے (علوم اسلامیہ)

آئی سرجن ثریا عظیم ہسپتال لاہور

آئی سرجن لاہور میڈی کیئر ہسپتال لاہور

مگر تو مہنگائی کے اس دور میں بھی
بہترین علاج کے سستے پیکج ممکن ہیں رابطہ کیجئے
Cell: 0333-4102266
Email: drasifkhokhar@hotmail.com

آپریشن لاہور میڈی کیئر جیسے جدید ترین آئی ہسپتال میں کیے جاتے ہیں

Vitreoretinal Surgery

- ✓ آنکھ کے پردے کے اُکھڑ جانے (Retinal Detachment) کا آپریشن
- ✓ آنکھ کے اندر خون جمع ہو جانے (Vitreous Hemorrhage) کا آپریشن
- ✓ Macula کو پہنچنے والے نقصان کے علاج کیلئے ہونے والے آپریشن

Phaco Surgery

- ✓ بغیر ٹیکے اور بغیر ٹانکے سفید موتیا کا علاج
- ✓ قریب اور دور کی نظر بیک وقت ٹھیک کرنے والے Multifocal لینز

Laser Surgery

- ✓ ذیابیطس اور دیگر بیماریوں سے Retina کو پہنچنے والے نقصان کا بذریعہ لیزر علاج
- ✓ Excimer لیزر کے ذریعے Epi-LASIK آپریشن کی مدد سے عینک سے نجات
- ✓ کالا موتیا کا Argon، Yag اور Diode لیزر کی مدد سے علاج
- ✓ سفید موتیا کے آپریشن کے بعد بننے والی جھلی کا بذریعہ Yag لیزر علاج

Corneal grafting surgery

- ✓ سری لنکا سے عطیہ شدہ آنکھیں منگوا کر قرنیہ کی پیوند کاری

148- آصف بلاک، بالمقابل Cakes & Bakes مین بلیوارڈ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور فون 042-37814053

"مجھے ایسے پھول کے طور پر یاد رکھنا جسے تم نے شاخ سے توڑا ہے، ویسا نہیں جسے جوتے تلے کچل دیا جائے"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

فرانس سے لکھا گیا

رتی جناح

کا آخری یادگار خط

سید عاصم محمود

قائد دوبارہ کبھی بمبئی نہیں گئے مگر وہ اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہاں اک چھوٹی سی قبر میں ضرور چھوڑ آئے

رات کے ۱۲ بجے تھے۔ وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھیں۔ انھیں کسی پل قرار نہ تھا۔ پھر وہ اٹھیں اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے کاغذ قلم تھاما اور ہولے ہولے اپنے دلی جذبات صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے لگیں:

''پیارے!

تم نے (میرے لیے) جو کچھ کیا، اس کا شکریہ۔ ممکن ہے کہ کبھی آپ کی غیر معمولی حسوں نے میرے رویے میں اشتعال انگیزی یا بے رحمی پائی ہو۔ آپ یقین رکھیں کہ میرے دل میں صرف شدید محبت اور انتہائی درد ہی موجود ہے...... پیارے ایسا درد جو مجھے تکلیف نہیں دیتا۔

دراصل جب کوئی حقیقت زندگی کے قریب ہو (اور جو بہرحال موت ہے) جیسے کہ میں پہنچ چکی، تو تب انسان (اپنی زندگی) کے خوش کن اور مہربان لمحے ہی یاد رکھتا ہے، بقیہ لمحات موہومیت کی بچھی، ان چھپی دھند میں چھپ جاتے ہیں۔ کوشش کر کے مجھے ایسے پھول کی حیثیت سے یاد رکھنا جو تم نے شاخ سے توڑا، نہ کہ ایسا جسے جوتے تلے کچل دیا جائے۔

''پیارے! (شاید) میں نے زیادہ تکالیف اس لیے اٹھائیں کہ میں نے پیار بھی ٹوٹ کر کیا۔ میرے غم واندوہ کی پیمائش (اسی لیے) میرے پیار کی شدت کے حساب سے ہونی چاہیے۔

''پیارے! میں تم سے محبت کرتی ہوں...... مجھے تم سے پیار ہے...... اور اگر میں تم سے تھوڑا سا بھی کم پیار کرتی، تو شاید تمھارے ساتھ ہی رہتی...... جب کوئی خوبصورت شگوفہ تخلیق کرلے، تو وہ اسے کبھی دلدل میں نہیں پھینکتا۔ انسان اپنے آئیڈیل کا معیار جتنا بلند کرے، وہ اتنا ہی زوال پذیر ہوجاتا ہے۔

''میرے پیارے! میں نے اتنی شدت سے تم سے محبت کی ہے کہ کم ہی مردوں کو ایسا پیار ملا ہوگا۔ میری تم سے صرف یہی التجا ہے کہ (ہماری) محبت میں جس اَلم نے جنم لیا، وہ اسی کے ساتھ اختتام پذیر ہوجائے۔

''پیارے شب بخیر اور خدا حافظ۔

رتی

''میں نے پیرس میں تمھیں خط لکھا تھا۔ خیال تھا کہ یہاں سے سپرد ڈاک کروں گی لیکن یہاں پہنچ کر خیال آیا کہ میں تمھیں ایسا تازہ خط لکھوں کہ اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔''

☆☆

یہ وہ انتہائی جذباتی، محبت آمیز اور یادگار خط ہے جو قائداعظم کی دوسری زوجہ، مریم (رتی) جناح نے ۵ راکتوبر ۱۹۲۸ء کو مارسیلیز، فرانس سے لکھا۔ رتی جناح وہاں سرطان کا علاج کرانے گئی تھیں۔ اپنے محبوب (شوہر) کے نام یہ ان کا آخری خط ثابت ہوا۔ وہ صرف ۴ ماہ بعد اللّٰہ کو پیاری ہوگئیں۔

بھارتی اور مغربی مؤرخین اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قائداعظم نے رتی جناح کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا۔ وہ ان سے بے توجہی برتتے اور اپنی انا کے خول میں بند رہتے لیکن رتی جناح کا آخری خط بھی غیر مسلم مؤرخین کے دلائل رد کرنے کو کافی ہے۔ اگرچہ قائد اور رتی کی داستان نشیب وفراز سے ضرور پر ہے۔

☆☆

۱۹۱۶ء تک محمد علی جناح بمبئی میں بحیثیت مستند وکیل اور سیاست داں مشہور ہوچکے تھے۔ ان کے واقف کاروں میں اب معزز شخصیات شامل تھیں۔ چنانچہ اسی سال وہ پارسی صنعت کار، سرڈنشا پیٹٹ کے اہل خانہ کے ساتھ دارجلنگ بغرض تفریح گئے۔ یہ سرڈنشا پیٹٹ کے والد ہی ہیں جنھوں نے ہندوستان میں کاٹن کے اولین کارخانے لگائے۔ چنانچہ پیٹٹ خاندان بڑا امیر کبیر تھا۔

اس قافلے میں سرڈنشا کی ۱۶ سالہ دختر، رتی پیٹٹ بھی شامل تھیں۔ وہ بڑے نفیس ذوق کی مالک تھیں اور ادب، تاریخ، روحانیت وغیرہ ان کے مرغوب موضوع تھے۔

دوسری طرف ۳۹ رسالہ قائداعظم کی شخصیت بھی بڑی پُر اثر تھی۔ مردانہ وجاہت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

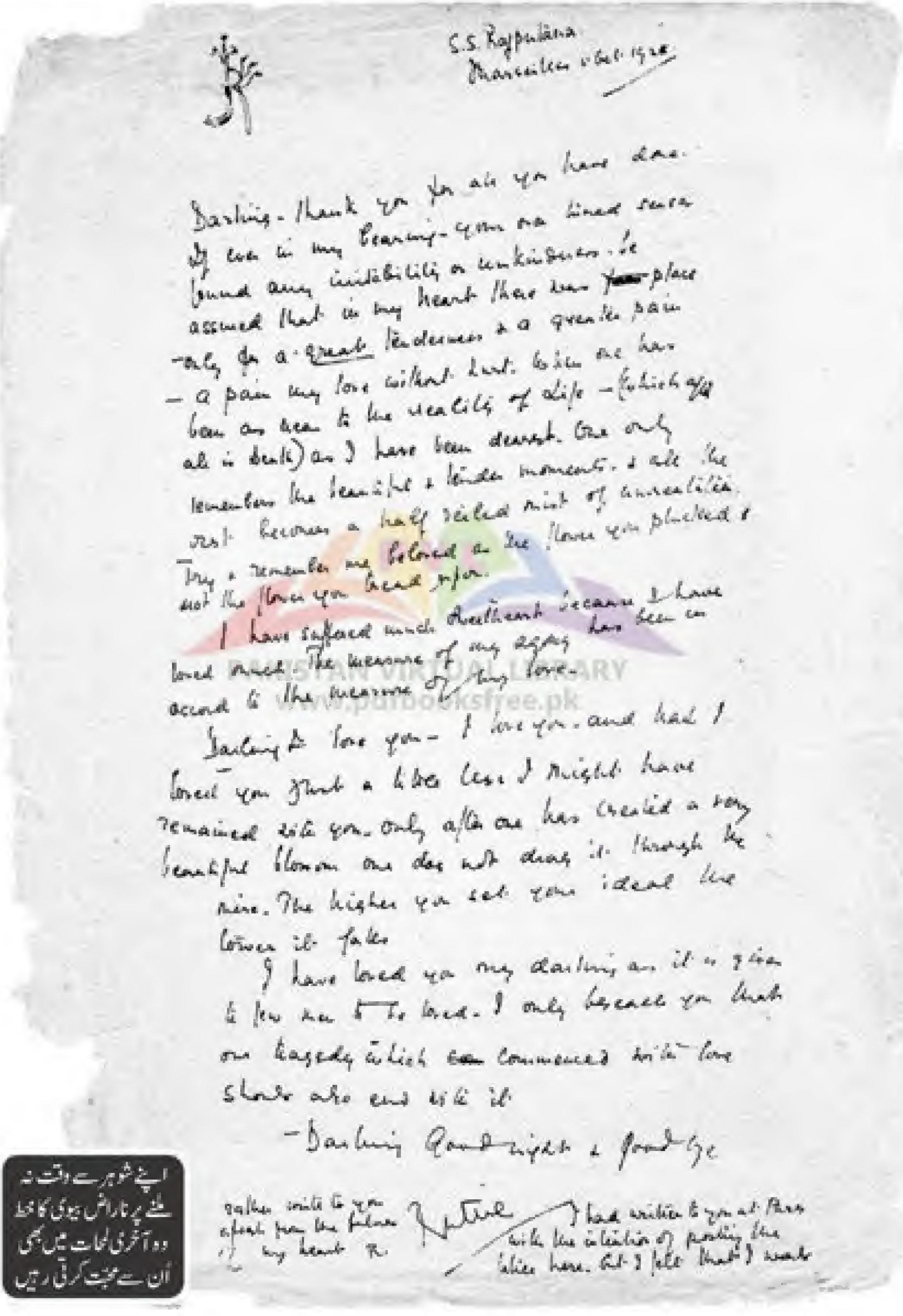

S.S. Rajputana
Marseilles 5 Oct 1928

Darling – Thank you for all you have done. If ever in my bearing you had sensed any irritability or unkindness – be assured that in my heart there was place only for a great tenderness & a greater pain – a pain my love without hurt. When one has been as near to the reality of life (which after all is death) as I have been dearest one only remembers the beautiful & tender moments & all the rest becomes a half veiled mist of unrealities. Try & remember me beloved as the flower you plucked & not the flower you tread upon.

I have suffered much sweetheart because I have loved much. The measure of my agony has been in accord to the measure of my love.

Darling I love you – I love you – and had I loved you just a little less I might have remained with you – only after one has created a very beautiful blossom one does not drag it through the mire. The higher you set your ideal the lower it falls.

I have loved you my darling as it is given to few men to be loved. I only beseech you that the tragedy which commenced with love should also end with it.

– Darling Goodnight & Goodbye

Ruttie

I had written to you at Paris with the intention of posting the letter here – but I felt that I would rather write to you afresh from the fullness of my heart. R.

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اپنے شوہر سے وقت نہ ملنے پر ناراض بیوی کا خط
وہ آخری لمحات میں بھی اُن سے محبت کرتی رہیں

"اپنی خوب صورتی اور نفاستِ طبع کے باعث اُنھیں "بمبئی کا پھول" کہا جاتا تھا"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ نیز وہ کسی بھی موضوع پر نہایت پُرمغز اور دلفریب گفتگو کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رتی پیٹٹ قائد سے بہت متاثر ہوئیں اور ان سے محبت کرنے لگیں۔ یہ پیار یک طرفہ نہیں تھا، قائد بھی رفتہ رفتہ رتی کو دل سے چاہنے لگے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ محبت اتنی پائیدار اور مستحکم ہوگئی کہ جب ۲ سال بعد رتی بالغ ہوئیں، تو انھوں نے اپنے گھر کو خیر باد کہا، اسلام قبول کیا اور قائد سے شادی کر لی۔ یہ ۱۸ اپریل ۱۹۱۸ء کو انجام پائی۔ یوں مالابار ہلز میں واقع قائد کا وسیع و عریض گھر اداسی و ویرانی سے نجات پا کر خوشیوں اور قہقہوں سے گونجنے لگا۔

نوبیاہتا جوڑے کے اولین ۱۰ برس خوشی و مسرت سے بھرپور تھے۔ انھوں نے ایک ساتھ ہندوستان بھر کے علاوہ یورپ و امریکا کے دورے کیے۔ پارلیمنٹ میں جب بھی قائد خطاب کرتے، تو رتی جناح انھیں سننے ضرور جاتی۔

اس زمانے میں قائد اور رتی کا جوڑا بہت مقبول تھا۔ دونوں خوبصورت اور پُرکشش تھے۔ پھر قیمتی کپڑے زیب تن کرتے، تو راہ چلتے لوگ انھیں دیکھنے کے لیے رک جاتے۔ غرض تب ان کی مسرت بے حساب تھی اور وہ سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔ بمبئی کے خاص و عام ان کی ازدواجی زندگی پر رشک کرتے۔

قائداعظم اور رتی کی خوشگوار زندگی میں طوفان کیونکر آیا، اس ضمن میں کوئی واضح وجہ بیان کرنا ممکن نہیں۔ شاید اس لیے کہ قائد اپنی نجی زندگی کے متعلق بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی ازدواجی زندگی کے متعلق معلومات بھی متفرق افراد کی لکھی کتب میں دستیاب ہیں۔

غالب امکان یہی ہے کہ قائداعظم کی بے پناہ

مصروفیت رتی کو کھلنے لگی۔ شاید بدخواہ انھیں قائد کے خلاف بھڑکانے اور رتی جناح میں یہ مصنوعی احساس پیدا کرنے میں کامیاب رہے کہ وہ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس کے بعد جب اَناؤں کا ٹکراؤ شروع ہوا، تو وہ بڑھا اور تمام حدیں پار کر گیا۔

قائداعظم بہرحال رتی سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ خرچ کے معاملے میں بڑے جزرس تھے۔ اُدھر رتی خاصی فضول خرچ واقع ہوئی تھیں۔ ایک بار دونوں کشمیر سیر کرنے گئے۔ وہاں صرف اپنے شکارے کی تزئین و آرائش پر رتی نے ۵۰/ہزار روپے خرچ کر ڈالے جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔ تاہم شوہر نے ماتھے پر شکن ڈالے بغیر رقم ادا کر دی۔ رتی نے کئی مواقع پر ایسی شاہ خرچیوں کا مظاہرہ کیا لیکن قائد خندہ پیشانی سے تمام بل ادا کر دیتے۔

اسی دوران ان کی بیٹی، دینا پیدا ہوئی۔ قائد اورینٹ کلب میں شطرنج اور بلیئرڈ کھیلا کرتے تھے۔ انھوں نے کلب چھوڑا اور تفریح کا اپنا وقت دفتر میں دینے لگے۔ قائد عدالتوں سے گھر آتے تو بیوی بچی پر بھرپور توجہ دیتے۔

رتی کی قبر پر مٹی ڈالنے کا کہا گیا تو قائد کے اندر کا دُکھ اور محبت آنسوؤں میں ڈھل گئے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

افسوس کہ یہ خوشگوار خاندانی زندگی چند برس ہی قائم رہی۔ قائد نے جب سیاسی سرگرمیوں کو زیادہ وقت دیا، تو رتی ناراض رہنے لگیں۔ ۱۹۲۲ء میں وہ دینا کو لے کر لندن چلی گئیں۔ تاہم وہاں بھی شوہر کی یاد انھیں رہ رہ کر ستاتی۔ دوارکاداس کانجی، قائد اور رتی کے دوستوں میں سے تھے۔ رتی جب بھی انھیں خط لکھتیں، تو یہ ضرور تاکید کرتیں کہ جناح صاحب کا خیال رکھیے گا۔ ایک خط میں لکھا:

”جناح سے جب بھی مل کر آئیے تو بذریعہ خط مجھے اطلاع دیجیے کہ وہ کیسے ہیں۔ وہ سخت محنت کے عادی ہیں۔ میں ادھر ہوتی تو انھیں تنگ کرتی اور (کام سے) روکتی تھی۔ میری عدم موجودگی میں تو وہ کام کرکرکے بے حال ہو جائیں گے“

رتی جب واپس آئیں، تو قائد نے انھیں یورپ اور شمالی امریکا کا دورہ کرایا۔ جوڑے نے وہاں خوب سیروتفریح کی اور عمدہ وقت گزارا۔ لیکن واپسی پر قائد پھر مصروف ہوئے، تو رتی جناح دوبارہ ناراض ہوگئیں۔ بدقسمتی سے اسی دوران انھیں سرطان چمٹ گیا۔ علاج ہوا مگر وہ جانبر نہ ہوسکیں اور ۱۸؍فروری ۱۹۲۹ء کو چل بسیں۔

۲۲؍فروری کو انھیں اسلامی رسوم کے مطابق بمبئی کے قبرستان میں دفنایا گیا۔ جنازے کے وقت قائداعظم انتہائی سنجیدہ رہے۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور بہت کم اپنے دلی جذبات ظاہر کرتے لیکن جب ان سے قبر پر مٹی ڈالنے کو کہا گیا، تو اندر کا لاوا اُبل پڑا اور قائد رو پڑے۔ اس وقت بھی لوگوں نے پہلی بار قائد کو آنسو بہاتے دیکھا۔

کم ہی لوگوں کو علم ہے کہ قائد نے دوسری مرتبہ بھی رتی کی آخری آرام گاہ کے سامنے ہی نیر بہائے۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب قائد نے آخری بار مرحومہ بیوی کی قبر کا دیدار کیا۔ تب بھی اُن کی آنکھوں کو اشکبار دیکھا گیا۔ قائداعظم پاکستان جانے کے بعد کبھی واپس بمبئی نہیں گئے، تاہم وہ اپنے دل کا ایک ٹکڑا ضرور وہاں کی چھوٹی سی قبر میں چھوڑ آئے تھے۔

رتی جناح کے خطوط کیا عیاں کرتے ہیں؟

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس میں شک نہیں کہ رتی اپنے شوہر سے ناراض تھیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آخری سانسوں تک وہ قائد سے محبت کرتی رہیں۔ اس سچائی کا سب سے بڑا ثبوت خود رتی کے خطوط ہی ہیں۔

قابلِ ذکر بات یہ کہ آخری خط سے انکشاف ہوتا ہے کہ رتی جناح وہ وجوہ سمجھ چکی تھیں جن کی بنا پر ان کا شوہر کے ساتھ رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود رتی کو قائد سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

خطوط سے عیاں ہونے والا تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ قائداعظم بتدریج اپنے نصب العین سے اس حد تک وابستہ ہوئے کہ انھوں نے اپنی تمام ذاتی خواہشات قربان کر دیں حتیٰ کہ ان کا گھر بکھر گیا مگر قائد نے مسلمانوں کو سیدھا راستہ دکھانے سے منہ نہیں موڑا۔ دراصل اعلیٰ مقاصد بڑی قربانیاں مانگتے ہیں، چنانچہ قائد نے بھی بہت کچھ قربان کیا مگر انھیں یہ عظیم کامیابی ضرور ملی کہ وہ مسلمانانِ ہند کو ایک آزاد وطن عطا کر گئے۔ پاکستانیوں کو آزادی جیسی عظیم الشان نعمت قائد کی قربانیوں کے باعث ہی حاصل ہوئی۔ ■

نیا سلسلہ

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

کہا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے

۱۔ ہم نے بزرگی کو تقویٰ، تونگری کو یقین اور عزت کو تواضع میں پایا۔
۲۔ اے لوگو! اللہ کے خوف سے رویا کرو۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی کوشش کر لیا کرو۔
۳۔ میرے حبیبؐ نے مجھے حکم دیا ہے کہ کسی انسان سے کچھ سوال نہ کروں۔
۴۔ جو شخص اللہ کی محبت چکھ لیتا ہے، پھر اسے طلب دنیا کی فرصت نہیں ملتی، انسانوں سے اس کو وحشت ہوتی ہے۔
۵۔ جب میں کسی شرابی کو گرفتار کرتا ہوں تو دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ اللہ اس کی پردہ پوشی کرے اور کسی چور کو گرفتار کرتا ہوں اس وقت بھی یہی خواہش دل میں ہوتی ہے۔

والد کا نام عثمان تھا کنیت ابو قحافہ تھی۔ والدہ کا نام سلمیٰ تھا۔ والدین نے آپؓ کا نام عبدالکعبہ رکھا۔ جوان ہونے پر ابو بکر کہلانے لگے۔ مسلمان ہوئے تو حضورؐ نے آپؓ کا نام عبداللہ رکھ دیا۔ آپ حضورؐ سے عمر میں ۲ برس چھوٹے تھے۔ سفر و حضر میں حضورؐ کے ساتھی اور رفیق تھے۔ سفر ہجرت میں حضورؐ کی رفاقت کی وجہ سے یار غار بھی کہا جاتا ہے۔ وفات کے بعد حضورؐ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ واقعہ معراج کے متعلق سنا تو بلا توقف یقین و تصدیق کرنے پر دربار رسالت سے صدیق کا خطاب پایا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد خلیفہ بنے۔ آپؓ کی مدت خلافت ۲ برس، ۳ ماہ اور ۱۰ دن تھی۔ آپ نے اپنی زندگی میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کیا۔ فرمایا میں نے اپنے کسی رشتہ دار کے بجائے تم میں سے بہترین شخص کو خلیفہ نامزد کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کو وصیت کی کہ "اللہ سے ڈرتے رہنا اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے کام کرنا۔ قرآن اور حق کو اپنا راہنما بنانا۔ قرآن پڑھو، جہنم کی آگ سے پناہ مانگو اور اہل جنت میں سے ہونے کی دعا مانگو۔"

کہا حکیم بزرجمہر نے

۱۔ دشمنوں نے مجھ سے دشمنی کی مگر میں نے جنگ میں جاہل ہوں اپنے نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہیں دیکھا۔
۲۔ میں گرم انگاروں پر چلا اور گرم ریت کو میں نے پامال کیا۔ مگر میں نے غصے سے جبکہ وہ مجھ پر قابو پا لے، کوئی آگ زیادہ گرم نہیں دیکھی۔
۳۔ میں لڑائیوں میں حاضر ہوا، لشکروں میں لڑا، تلواریں چلائیں اور ہمسروں کو پچھاڑا، مگر بری عورت سے زیادہ غالب کسی کو نہیں دیکھا۔
۴۔ میں نے جنگ کے اوزاروں کو استعمال کیا اور پتھروں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا، مگر قرض سے بوجھل میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا۔

خسرو نوشیرواں (۵۳۱۔۵۷۸) کے مشہور و معروف وزیر بزرجمہر کا تفصیلی ذکر ایرانی ادب میں بڑے احترام سے کیا گیا ہے۔ فردوسی نے بھی اپنے شاہنامے میں اس کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ نہ صرف ایران یا مشرق میں بلکہ مغرب میں بھی بزرجمہر کی شہرت بحیثیت ایک حکیم و دانا مسلمہ ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کہا حکیم کیخسرو نے

۱۔ اپنی تباہی پر کسی سے بیان نہ کر، کیونکہ اس کے اظہار میں دو نقصان ہیں: ملامتِ دوستاں اور مسرّتِ دشمناں۔ اور ہر دو خلاف مقصود ہیں۔

۲۔ پہلے دشمن کیساتھ صلح جوئی اختیار کر۔ اگر قبول نہ کرے تو مردانگی دکھلا۔

۳۔ جو کوئی یار بے عیب تلاش کرے، وہ ہمیشہ بے یار رہے گا۔

۴۔ ۴ر لوگوں کو بد خوئی سے معذور سمجھ: روزہ دار، مریض، مسافر، قرض دار تنگدست۔

پرشیا کے مشہور کیانی خاندان کے بادشاہ سیاوش کا بیٹا تھا۔ سیاوش کو اس کے باپ افراسیاب نے کیخسرو کی پیدائش سے قبل ہی قتل کرا دیا تھا۔ چنانچہ کیخسرو کے نانا افراسیاب نے اپنے دانا وزیر پیران کو کیخسرو کا اتالیق مقرر کیا۔ کیخسرو ایران کے مشہور ترین بادشاہوں میں سے ایک تھا۔ کیخسرو کے معنی ہیں "مشہور"۔ اور کیخسرو واقعی اپنی دانائی اور حکمت کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہوا۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں اس کا ذکر بڑے خوبصورت الفاظ میں کیا ہے۔

کہا مامون الرشید نے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

۱۔ گناہ اس قدر کم کر کہ ان کی عقوبت کی تاب لا سکے۔

۲۔ راستی جو فائدہ نہ پہنچائے اور لوگوں کا دل دکھائے، اس سے پرہیز کر۔

۳۔ کمینوں کو جواب کے واسطے علم ایک لشکر ہے۔

۴۔ خوشامدی شخص تمھاری برائیوں اور بھلائیوں دونوں کو پسندیدہ بتلائے گا۔

مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا جو ۱۳ ستمبر ۷۸۶ عیسوی کو اس کی ایک لونڈی مراجل کے بطن سے پیدا ہوا۔ نہایت ذہین و فطین، زبردست عالم اور علم دوست تھا۔ ہارون الرشید نے اسے جوان ہونے پر خراسان کا گورنر بنا دیا۔ ہارون کی وفات کے بعد مامون کی اپنے بھائی امین سے جنگ ہوئی۔ ۸۱۲ عیسوی میں امین کو شکست دے کر بغداد پر قابض ہوا اور ۸۱۳ء میں خلیفہ بنا۔ اس کے دربار میں مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے علماء کے درمیان مناظرے ہوتے تھے۔ اس نے بیت الحکمت بھی قائم کیا اور ان علما، اور دانشوروں کی سرپرستی کی جو خلق قرآن کے مسئلے پر اس کے ہم نوا تھے۔ اس نے زبردستی لوگوں سے اپنا یہ خیال منوانے کے لیے بہت ظلم اور زیادتیاں کیں۔ بدقسمتی سے وہ بھی اپنے باپ کی طرح معتزلہ کا پیرو تھا۔ چنانچہ بہت سے علما خصوصاً امام احمد بن حنبلؒ نے جب خلق قرآن کے مسئلے پر اس کی مخالفت کی تو انھیں ۲۰ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

یادوں کی سوغات

"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"

جن کی تحریریں اُردو ادب کا حسن ہی نہیں، دِلوں پہ برستی نرم پھوار جیسی تھیں

خالد سعید اختر

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"بجنگ آمد" اور "بزم آرائیاں" لکھنے والے کم گو اور کم سخن مصنف کرنل محمد خاں کا تذکرۂ دِل بہار

السّلام علیکم! مزاج گرامی؟ سب سے پہلے تو القاب کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ آپ نے ''اپنی کرنیلی'' کو ادب کے میدان سے عاق کر دینے کا اعلان فرمایا ہے۔ چونکہ میں نے دیگر قاریوں کی طرح آپ سے واقفیت ''بجنگ آمد'' سے بطور مصنف ''کرنل محمد خاں'' کے نام سے ہی پائی تھی اور اسی نام سے ایک طرح کی اُنسیت ہے جو کہ ایک قاری اور مصنف کے درمیان ہوتی ہے۔ اب آپ کے نام سے ''کرنل'' کا ''سابقہ'' الگ کرنا کچھ

عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ یہ آپ کے ادبی نام کا حصہ بن چکا تھا۔ شاید آپ کو ایسا محسوس نہ ہوا ہو۔ نام بدلنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ معاف کیجیے گا آدمی ''Duplicate'' سا لگتا ہے۔ جیسے سابقہ دور کے ایک مشہور رومانوی ناول نگار ''ایم اسلم'' صاحب اگر بعد میں محمد اسلم کے نام سے لکھنا شروع کر دیتے تو اُن کے قاری اس نئی صورت حال سے شاید ہی ''Reconcile'' کر پاتے اور شک ہی رہتا کہ وہ وہی ہیں یا کوئی اور۔ ویسے بھی میں نے کچھ عرصہ قبل ادب کے حوالے سے یا کسی عام حوالہ سے آپ کے نام کے ساتھ لفظ بریگیڈیئر پڑھا تھا۔ مگر اب آپ کی کتاب ''بزم آرائیاں'' (ایڈیشن نومبر ۱۹۸۷ء) جس کے حوالے سے میں آپ سے مخاطب ہونے کی جسارت بلکہ سعادت حاصل کر رہا ہوں، پڑھنے سے شک گزرا کہ شاید آپ بریگیڈیئر بننے کی حسرت لیے ہی ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ بریگیڈیئر بن گئے تھے یا نہیں بن سکے تھے ہر دو حال میں کسی ایک غلطی پر ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اپنی کم علمی اور کم واقفیت کا مجھے احساس ہے۔ اگر جنرل تاج ایسا ہی اچھا ہوتا تو اب تک کب کا ''نیلام گھر'' سے ایک آدھ کار ضرور جیت چکا ہوتا!

جناب محمد خاں صاحب اس بات کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں کہ ''بزم آرائیاں'' کے حوالہ سے اتنی دیر بعد آپ سے مخاطب ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور شاید آپ کو میری یہ جسارت ''باسی کڑھی میں اُبال'' محسوس ہو رہی ہو۔ اس میں میرا قصور ہے اور نہیں بھی! کیونکہ اس کتاب کو پڑھنے کی سعادت ہی اب نصیب ہوئی ہے۔

میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی!

سو عرض ہے کہ میں ادب کا ایک ''ہولا تماشبین'' ہوں۔ آپ ''پینڈو بھرا'' ہیں۔ میرے خیال میں مجھے اس ترکیب کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ مطلب سمجھ گئے ہوں گے، اگرچہ کسی زمانہ میں انگریزی ادب کا ایک ادنیٰ سا طالب علم رہا ہوں مگر مطالعہ کا شوق اور فرصت اب خال خال ہی میسر آتے ہیں۔ ادبی ذوق کے جراثیم بچپن سے لے کر آج تک دل و دماغ میں بدستور موجزن بلکہ غوطہ زن رہے ہیں۔ مگر صحیح سمت میں ان کو پروان چڑھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اب جبکہ تخلیقی اور ترتیبی قوتوں سے اپنے آپ کو محروم پاتا ہوں تو نقاد بن کر کسی کی دل آزاری کا باعث نہیں بننا چاہتا۔

آپ کی کتاب ''بجنگ آمد'' آج سے کوئی ۱۶/۱۷ برس پیشتر پڑھی تھی۔ اُس زمانے میں ''نکلے تیری تلاش میں'' پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ لڑکپن میں شفیق الرحمٰن صاحب سے کافی محظوظ بلکہ مرعوب ہوا تھا۔ خاص طور پر ''کرنیں'' اب بھی کبھی کبھی دل کے نہاں خانہ میں ضیا پاشی کر جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کی اور جناب تارڑ (جن کا پورا نام لکھنے کے لیے کافی تکلیف دہ مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے) کی تحریروں نے خوش کن ہوا کے لطیف اور عطر بیز جھونکوں کا کام کیا۔ محسوس ہوا

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم!

یہ دورِ جوانی بلکہ نام نہاد (So called) جوانی کا دور تھا۔ نام نہاد اس لیے کہ جوانی نام کی کوئی شے ہم پر وارد ہی نہیں ہوئی۔ بچپن سے ڈائریکٹ ہی بڑھاپے میں قدم رکھ دیا ہے۔ ہوش سنبھالنے پر بچپن میں جیسے اپنے آپ کو پایا تھا، ویسا ہی اب محسوس کرتا ہوں۔ شاید بچپن سے ہی اپنے پُرسوز و پُرہوش بلکہ زیادہ صحیح ''مدہوش'' ہونے کی بنا پر! تاہم اس کیفیت کے وارد ہونے میں غمِ جاناں کی نسبت غمِ دوراں کا دخل زیادہ تھا۔

غمِ زندگی کا حسرت سبب اور کیا بتائیں
میری ہمتوں کی پستی، میرے شوق کی بلندی!

ہاں تو کچھ زیادہ ہی کسرِ نفسی سے کام لے گیا ہوں۔ ابھی اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوا کہ مارکیٹ ویلیو (Value)

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بنانے کے لیے ''پرانی تصویر'' کا سہارا لینا پڑے۔ ابھی تازہ تصویر سے ہی کام چل جاتا ہے۔

میں باتوں باتوں میں دور نکل گیا۔ کرنل صاحب میں کہنا چاہ رہا تھا کہ ''بجنگ آمد'' کے بعد درمیان میں ''بسلامت روی'' پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ ''بزم آرائیاں'' میں اس کا چرچا پڑھ کر اس کی دید کا شوق بھی بڑھا ہے۔

محترم محمد خاں صاحب شاید اب تک آپ اس فکر میں ہوں کہ میں شاید ''بزم آرائیاں'' کے بارے میں تبصرہ کرنے کی جسارت اور کوشش کر رہا ہوں۔ میں ایسا کرنے کی جسارت اور کوشش ہرگز نہیں کرنا چاہتا نہ ہی اتنی اہلیت اپنے میں پاتا ہوں۔ ''بجنگ آمد'' سے کافی مرعوب ہوا تھا۔ ''بزم آرائیاں'' تمن تمن کی۔ تین چار کہانیاں بہت پسند آئیں۔ تاہم کئی جگہوں پر ''آمد'' کے بجائے ''آورد'' کا احساس ہوا۔ یہ بات پڑھ کر افسوس ہوا کہ آیندہ سے آپ نے لکھنے سے کنارہ کشی کر لی ہے۔ اب پتا نہیں موجودہ صورت حال کیا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

پہلی مرتبہ ''بزم آرائیاں'' دیکھی تو چند باذوق دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ''بزم آرائیاں'' والی پھبتی ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی اور خاصے محظوظ بھی ہوئے تھے۔ اگرچہ اس بارے میں جو واقعہ آپ نے تحریر کیا ہے، بعد میں پڑھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ بندہ خود بھی اسی ''بزم آرائیاں'' کا ایک فرد ہے۔ اب جس شوق نے مجھے آپ کو خط لکھنے پر اُبھارا ہے، وہ ہے انتساب میں ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں'' کے لیے! ہر چند کسی طور پر بھی میں اپنے آپ کو ''یارانِ نکتہ داں'' میں شامل نہیں سمجھتا تاہم دل کے کسی گوشۂ نہاں میں کسی ہلکے سے شوق نے انگڑائی لے کر آپ کی دعوت قبول کرنے پر اُکسایا ہے۔ بات اگرچہ اب پرانی لگتی ہے تاہم اپنے شوق کی تکمیل کے لیے طبع آزمائی کر رہا ہوں۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات!

میری طرف سے مجوزہ انتساب کچھ اس طرح سے ہے:

''اُن دوستوں کے نام
جن کے خلوص اور محبت نے مجھے زندگی کا شعور بخشا!''

یہاں لفظ شعور، اُن ساری کیفیات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جن کے اظہار کی آپ نے اور آپ کے محترم دوستوں نے کاوشیں کی تھیں۔ اپنی تائید میں سند کے طور پر عدم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

یہ مغنّی یہ خوشنوا شاعر
زندگی کے اصول کے ماہر

جو زندگی کو شعور دیتے ہیں
طور کو برق طور دیتے ہیں

جن کو [illegible] سلام کرتا ہے
جن سے یزداں کلام کرتا ہے

معافی چاہتا ہوں، آپ کا دیا ہوا انتساب پسند نہیں آیا۔ لفظ ''طبیعت'' میں ادبی چاشنی بالکل نہیں، بلکہ اس میں عمومیت پائی جاتی ہے اور دیگر الفاظ ''مزا پایا'' میں بھی عامیانہ پن سا جھلکتا ہے۔

اگر میرا مجوزہ انتساب آپ کے ذوقِ نظر پر پورا اُترے تو پسندیدگی کی سند (یعنی خط کے جواب) سے نواز دیں۔ میرے لیے باعث عزت افزائی ہوگا۔ اگر ذوقِ سلیم پر گراں گزرے تو میں ادب کا ''بھولا تماشبین'' ہونے کے ناتے اپنے آپ کو معافی کا حقدار سمجھتا ہوں۔

شکریہ!
والسلام
نیاز کیش
خالد سعید اختر
سول جج

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

محترم جج صاحب

السلام علیکم!

آپ کے مکتوب گرامی مورخہ ۸ جولائی کا شکریہ۔ خاصی دیر سے جواب دے رہا ہوں۔ باعثِ تاخیر معقول ہے لیکن شاید اس کی تفصیل آپ کی دلچسپی کا باعث نہ ہو۔ بہرحال تاخیر کے لیے معذرت چاہتا ہوں اور امید ہے آپ اسے قبول فرمائیں گے۔ آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ بڑا دلچسپ تھا۔

آپ نے بجا فرمایا کہ کرنل میرے نام کا حصہ بن چکا ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے، میں نے ''بزم آرائیاں'' کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ میں اس سے گلوخلاصی کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام ثابت ہوئی۔ چنانچہ اگلے ایڈیشن میں دیباچہ ثانی میں اس ناکامی کا اقرار کر لیا اور کرنیلی کو دوبارہ گلے لگا لیا۔ شاید یہ دوسرا دیباچہ آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔

جی ہاں، میں کرنیلی سے اوپر نہیں جا سکا۔ ''بزم آرائیاں'' میں بریگیڈیئر کا ذکر از راہِ تفنن تھا۔ بیان میں حسرت کا شائبہ بھی اسی تفنن کا حصہ تھا ورنہ بریگیڈیئر نہ بننے پر کبھی کڑھنے کی نوبت نہیں آئی.... میر معلوم ہے قلندر تھا! بہرحال میرے عہدے کے متعلق آپ کی معلومات بالکل صحیح ہیں اور آپ کا جنرل نالج سراسر بے عیب ہے۔ آپ نیلام گھر میں غالباً کبھی گئے ہی نہیں ورنہ وہاں بھی کار سمیت سارا میلہ لوٹ لاتے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو کچھ بُرا بھی نہیں ہوا۔ آپ پہلے ہی جج جیت چکے ہیں جو کار سے زیادہ پائیدار اور باوقار ہے۔

''بزم آرائیاں'' واقعی آپ تک دیر سے پہنچی ہے۔ اگرچہ آپ جیسے خوش ذوق قاری تک کسی وقت بھی پہنچ جانا اس کی خوش قسمتی ہے۔ کیا معلوم کتاب نے کسی بک شاپ میں آپ کو دیکھ کر کتنی بار شعرِ اقبال دہرایا ہوگا۔

الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے!
کلی سے رشکِ گلِ آفتاب مجھ کو کرے!

آپ ناحق اپنے آپ کو ادب کا ''ہولا تماشبین'' سمجھ رہے ہیں۔ اپنے اسلوبِ تحریر اور اندازِ فکر سے تو آپ خاصے ''پختہ تماشبین'' ہیں۔ بلکہ جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے، آپ کچھ زیادہ ہی کسرِ نفسی پر اُتر آئے ہیں۔ علم و ادب میں ہی نہیں، رخ و رنگ کے اعتبار سے بھی ماشاء اللہ آپ کا وجود باعثِ رشک ہے اور ہماری طرح پرانی تصاویر کے محتاج نہیں۔ میں نے آپ کی تصویر یا خود آپ کو نہیں دیکھا لیکن لگتا ہے کہ آپ اپنی تمام تر کسرِ نفسی کے بعد بھی جانِ محفل اور مرکزِ نگاہ ہوں گے۔

تخلیقی قوتوں سے محروم ہونے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس خط سے تو آپ یقیناً تخلیقی تجربات سے لدے پھندے لگتے ہیں۔ بلکہ اس قوت کے ہوتے ہوئے آپ کو نقاد بننے کی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ کا نام لے کر کوئی افسانہ، انشائیہ یا غزل لکھ دیں اور بالکل ممکن ہے لکھ چکے ہوں۔ اگر یوں ہے تو اپنی تخلیقات کی زیارت تو کرائیں۔

ع تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

آپ شفیق الرحمن اور مستنصر حسین تارڑ کے فین ہیں۔ آپ کے حسنِ مطالعہ کا یقین آیا۔ یہ دونوں حضرات اُردو کے چند بہترین لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی تحریروں کے تاثر کے متعلق آپ نے فیض کے مصرعے کا بالکل برمحل استعمال فرمایا ہے۔

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم

آپ نے فرمایا ہے کہ ''بجنگ آمد'' تو پڑھ لی ہے مگر ''بسلامت روی'' ابھی نہیں پڑھی۔ میرا خیال ہے اسے نہ ہی پڑھیں تو اچھا ہے۔ وہ ثقہ حضرات کو ایسی موافق نہیں۔ ''بزم آرائیاں'' کے متعلق آپ نے بالکل صحیح فرمایا کہ یہ ''تین تین کی'' یہ کتاب ہے ہی تین تین قسم کی اور ہم چینڈوؤں کے لیے یہ قسم بھی خاصی امتیازی ہے۔

آخر میں آپ نے میرے لکھنے سے کنارہ کشی پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی لکھا ہے کہ یہ بھی سُنا ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ جج صاحب!

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

آپ نے ٹھیک ہی سُنا ہے لیکن میرے منہ سے یہ کافرادا سی گی ہی نہ تھی۔ میں سپاہی ہوں، لکھنا میرا پیشہ نہیں۔ کتابیں محض تفریحاً لکھیں بلکہ ایک نہیں تین لکھ دیں۔ ۳ رکتابیں کافی تفریح ہے! اب لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں مزہ آتا ہے اور پڑھنے کو کیا کچھ نہیں؟ یہ سب کتب خانے دراصل ہیرے اور جواہر کے خزانے ہیں۔ میں حتی المقدور ان سے گوہر چنتا رہتا ہوں۔ فقط آشوب چشم مزید غواصی سے مانع ہے ورنہ ابھی

اس بحر کی تہ میں ہیں لاکھوں لولوئے لالہ

''بزم آرائیاں'' کے انتساب کے ضمن میں صلائے عام قبول فرمانے کا خاص شکریہ۔ آپ کی ترمیم بلاشبہ اچھی ہے، خصوصاً شاعر دلنواز عدمؔ کی شعری سند کے پیشِ نظر۔ لیکن آپ نے بڑی دیر سے بھیجی ہے۔ بہرحال کتاب کو اگلا ایڈیشن نصیب ہوا تو اس کا ذکر ضرور کروں گا۔ ویسے مجھے افسوس ہے کہ آپ کو موجودہ انتساب کے الفاظ ''طبیعت'' اور ''مزہ پایا'' پسند نہیں آئے کیونکہ آپ کو ان میں ادبی چاشنی کا فقدان اور عامیانہ پن نظر آیا ہے۔ دراصل میں بھی آپ کی طرح انتساب جیسے خصوصی جملوں کے لیے معروف ادبا یا شعرا کی تحریروں سے راہنمائی حاصل کرتا ہوں۔ شاید آپ کے ذہن میں نہیں آیا کہ موجودہ انتساب (پیار سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا) معمولی تصرف کے ساتھ غالب کا ایک مصرع ہے۔ غالبؔ کا پورا شعر یوں ہے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لادوا پایا

بہرحال آپ کو غالبؔ سے اختلاف کا پورا حق ہے لیکن میرے لیے اگر ایک طرف غالب کا فرمودہ ہو اور دوسری طرف جج کا حکم، تو کچھ کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کیا کہا ہے اقبال نے یہ معاملے ہیں نازک......

آخر میں آپ کی یاد آوری کا بہت شکریہ۔ آپ کا خط صحیح معنوں میں باعثِ مسرت ہوا۔

والسلام
خیر اندیش
محمد خاں

■

کرنل محمد خاں (قہقہوں کے جزیرے آباد کرنے والے مزاح نگار)

اردو مزاح کو ایک نرم و لطیف، چلبلا اور دل کو لبھانے والا انداز دینے والا یہ عظیم مزاح نگار ضلع چکوال کے قصبے بالکسر میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا اور ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

کرنل محمد خان نے ایک دیہاتی ماحول میں آنکھ کھولی اور لاہور کے اسلامیہ کالج سول لائنز سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے پہاڑی علاقے کی روایت کو نباہتے ہوئے انڈین آرمی میں کمیشن حاصل کیا۔ جنگِ عظیم دوم میں عراق، مصر، فلسطین اور لیبیا کے صحراؤں میں جرمنی اور اس کے اتحادیوں کے خلاف معروفِ جنگ رہے۔ اسی دوران کے اس مشغلِ حرب و ضرب کی کہانی ان کے نوکِ قلم سے جب قرطاس پر پھیلی تو لازوال شہرت کی حامل تصنیف ''بجنگ آمد'' کی شکل اختیار کر گئی۔ جو ان کی شہرت اور تعارف کی سب سے بڑی سند ثابت ہوئی۔

کرنل صاحب نے بجنگ آمد کے علاوہ چار اور کتب بسلامت روی، بزم آرائیاں، بدیسی مزاح (تصنیفات کرنل محمد خاں یادگار چھوڑی ہیں۔ اردو ادب کے تمام بڑے ادبا اور مصنفین نے خصوصاً مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا، سید عابد علی عابد، صفدر میر، مشفق خواجہ، صدیق سالک نے اپنے اپنے انداز میں کرنل محمد خان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

مشہور مزاحیہ شاعر اور نثر نگار سید ضمیر جعفری خود فوج میں رہے۔ وہ کرنل صاحب کے متعلق کہتے ہیں ''وہ قہقہوں کے ''جزیرے'' آباد کرتے ہیں۔ ان کی ظرافت کسی وادیٔ خیابان میں بہتی، مسکراتی، گنگناتی ہوئی ندی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے اور اپنے بہاؤ کے عظم میں کناروں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔''

میرے دل نے کہا

یہ کرنل محمد خاں نہیں ہو سکتے

چکلالہ کے ایک چھوٹے سے بنگلے کے بڑے مقیم
سے ایک یادگار ملاقات کا احوال

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ایک روز اُس بلند قامت درخت نے
جھک کر ننھے پودے سے پوچھ لیا تھا
”بُرا تو نہیں مانا...!“

اعتبار ساجد

فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد کرنل محمد خاں چکلالہ سکیم III راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے تھے۔ ان کی کتابوں پر ان کی جو تیکھی سی تصویر چھپتی تھی اور ان کتابوں میں مزاح کی جو شائستہ پھلجھڑیاں چھوٹتی تھیں، انہیں دیکھ کر میں نے اپنے تصور میں جس کرنل محمد خاں کو مسندِ عقیدت پر بٹھایا تھا، وہ گٹھے ہوئے سمارٹ جسم کا ایک ہنس مکھ کرنل تھا۔ جن دنوں میں گورنمنٹ کالج نوشکی (بلوچستان) کے طلبا کو پڑھایا کرتا تھا تو اُردو کے نصاب میں ایک کہانی

"قد رایاز" کرنل محمد خاں کی بھی تھی۔ یہ کہانی اتنی فکر انگیز اور دل سوز تھی کہ اس کے آخری پیراگراف تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، میرا گلا رندھ جاتا تھا اور میں اکثر حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ "بجنگ آمد" کا مصنف کیا ایسی کہانی بھی لکھ سکتا ہے جو ہنسانے کے بجائے رُلا دے۔ نوشکی میں بڑا سکون، بڑی شانتی تھی۔ لکھنے پڑھنے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ محبت کرنے والے سعادت مند بلوچ اور براہوی طالب علم تھے اور خوش دل شریک رزق لیکچرار تھے۔ چھڑوں کے میس میں بڑا غل غپاڑہ ہوتا۔ میں نے ان سے دور ایک الگ مکان لے لیا۔ اس میں پرائمری سکول کے ایک ہیڈ ماسٹر شریف صاحب کو پارٹنر بنا لیا۔ کم کرائے کا کچا لیکن کشادہ مکان تھا۔ میں کالج سے آ کر پڑھنے لکھنے کے لیے اپنے کمرے میں گھس جاتا۔

شریف صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے۔ کبھی کبھی ہانک لگاتے "اتنا نہ پڑھو برخوردار! آنکھیں کمزور ہو جائیں گی۔ ذرا گھوما پھرا بھی کرو۔" میں ہوں ہاں کر کے رہ جاتا اور اپنے لکھنے پڑھنے کی دنیا میں مگن رہتا۔ جب لاہور آتا تو مکتبہ القریش کے مالک حاجی عبدالحفیظ قریشی مرحوم کو کوئی نیا مسودہ دے جاتا۔ کتاب ایک دو ماہ میں چھپ کر مارکیٹ میں آ جاتی۔ اس طرح لکھنے کا خاصا کام میں نے یکسوئی سے نوشکی میں کیا۔ ایک روز کرنل صاحب کو دو کتابوں کے ساتھ ایک شگفتہ سا خط بھیجا۔ اول تو امید نہیں تھی کہ کتابیں کرنل صاحب تک پہنچیں گی کیونکہ پتا اندازے سے لکھا تھا۔ دوم یہ تو قطعاً امید نہیں تھی کہ ان کتابوں کی وصولی کی کوئی اطلاع مجھے ملے گی۔ ہر روز ڈاکیے کی راہ دیکھتا تھا تقریباً ہر روز میرے نام خاصی ڈاک آتی تھی لیکن وہ خط نہ آیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں دل ہی دل میں جھینپ بھی رہا تھا کہ خواہ مخواہ ایک بڑے قد آور ادیب کو اپنی فضول کتابیں بھیج دیں اور مزید حماقت یہ کی کہ بے تکلفانہ سا مزاحیہ خط بھی لکھ دیا۔ لیکن اس روز میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے کرنل محمد خاں کا انتہائی حوصلہ افزا طویل خط ملا۔ اس میں میری کاوشوں کے حوالے سے رائے بھی تھی، تحسین بھی اور اپنائیت بھی۔

ایک قد آور ادیب جو ملکی سطح پر ہی نہیں ادبی دنیا میں بھی چار دانگ عالم میں مشہور تھا۔ اس بڑے آدمی، بڑے ادیب نے سیکڑوں میل دور نوشکی کے دور افتادہ ضلع کے ایک معمولی لکھاری کو اپنی محبت اور تحسین سے نوازا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ کئی برس بعد جب میں نوشکی سے کوئٹہ ڈگری کالج اور پھر کوئٹہ سے فیڈرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد آیا تو کئی ماہ شہر کو سمجھنے میں گزر گئے۔ پھر دل میں تمنا جاگی کہ کرنل صاحب سے ملنا چاہیے۔ مگر ملنا کیسے ہوتا؟ نہ وہ کسی تقریب میں جاتے تھے نہ محفل آرائیوں کے شائق تھے۔ بس کچھ مخصوص دوست تھے جن کے ساتھ کبھی کبھار نشستیں ہو جاتی تھیں۔ اسی تگ و دو میں کئی برس بیت گئے۔ آخر چکوال کے ایک دوست نے یہ مشکل حل کی۔ کرنل صاحب کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ میں اس کے ساتھ اسکیم نمبر III چکلالہ گیا۔ کرنل صاحب چھوٹے سے بنگلے کے ٹیرس میں ملے۔ مگر یہ تو وہ کرنل محمد خاں نہیں تھے جو میرے تصور کی مسند پر براجمان رہتے تھے۔ میرے سامنے تو ایک چھریرے بلند قد کا دبلا پتلا، پختہ عمر کا شخص عام سی شلوار قمیص میں ملبوس کھڑا تھا۔

"یہ تو محمد خاں نہیں ہو سکتے۔" میرے دل نے کہا۔

"یہی کرنل محمد خاں ہیں۔" میرے ساتھی نے زور دے کر کہا۔ جیسے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔

تعارف کے بعد وہ ہمیں اپنے چھوٹے سے مگر نفیس ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ پھر چائے آئی اور گفتگو کا آغاز ہوا۔ آہستہ آہستہ جیسے چودھویں کا چاند درختوں کے جھنڈ سے فضا میں نمودار ہوتا ہے، اسی طرح دھیرے دھیرے کرنل صاحب روشن ہوتے گئے۔ معلوم ہوا کہ شرمیلے بہت ہیں۔ کسی تقریب میں چلے بھی جائیں تو تقریر سے معذرت کر لیتے ہیں۔ سادہ دل، درویش آدمی، نہ فوجیوں جیسے تیور، نہ بڑے ادیبوں جیسا رویہ، نہ تکبر، نہ غرور، نہ نخوت۔ چائے ہمارے لیے انہوں نے خود بنائی۔ باتوں ہی باتوں میں کئی مرتبہ ان کے چہرے کی شرمیلی من موہنی مسکراہٹ میں وہ کرنل محمد خاں نظر آیا جسے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم باتیں کر رہی

رہے تھے کہ دروازے کی چوکھٹ میں ایک چہرہ نمودار ہوا۔ فوجی انداز میں سلام کیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کرنل صاحب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے باہر لے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے۔ کہنے لگے "جب میں کیپٹن تھا تو یہ میرا اردلی تھا۔ اب میں ریٹائرڈ کرنل ہوں تو یہ میرا لنگوٹیا دوست ہے۔ مگر سلام اب بھی فوجی طریقے سے کرتا ہے۔ ہزار بار سمجھاتا ہوں کہ یار، اب ہم لوگ فوج سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ یہ تکلفات چھوڑ دو۔ کہتا ہے نہیں سر! فوجی ہمیشہ فوجی ہوتا ہے۔ چاہے ریٹائر ہو، چاہے بوڑھا ہو جائے۔"

کرنل صاحب کا رویہ ایسا مشفقانہ اور دل پذیر تھا کہ مہینے پندرہ دن بعد ان کی طرف جانا معمولات میں شامل ہو گیا۔ چکوال میں میرے فکاہیہ مضامین "جا بیل اسے مار" کی تقریب رونمائی "دھن دارا" نامی تنظیم نے منعقد کرنے کا اہتمام کیا۔ صدارت سید ضمیر جعفری صاحب کی تھی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ کسی طرح مہمان خصوصی کے طور پر کرنل صاحب شامل ہو جائیں۔ وہ میری درخواست پر آمادہ تو ہو گئے لیکن کہنے لگے "آپ کی خاطر چلا جاتا ہوں۔ ضمیر صاحب بھی زور دے رہے ہیں مگر بھئی تقریر وغیرہ سے مجھے معاف رکھنا۔"

ہم نے عین تقریب کے عروج پر کوشش کی کہ کسی طرح کرنل صاحب ڈائس پر آ جائیں مگر انہوں نے مسکرا کر انکار میں ہاتھ ہلا دیا۔ بعد میں ڈپٹی کمشنر کے ہاں کھانے پر مجھے الگ لے گئے۔ مرغ کی ایک ران اپنی پلیٹ سے نکال کر میری پلیٹ میں ڈالی۔ کہنے لگے۔ "بُرا تو نہیں مانا کہ میں نے تقریر نہیں کی؟ بھئی سچی بات یہ ہے کہ مجھے تقریر کرنی نہیں آتی، یہ بڑا الف جاب ہے۔"

اُردو کا ایک صاحب طرز ادیب اپنے جونیئر سے کہہ رہا تھا کہ بُرا مت ماننا۔ ایک بلند قامت درخت جھک کر ننھے پودے سے پوچھ رہا تھا "بُرا تو نہیں مانا؟"

کتنا خیال تھا اس شخص کو اپنے چھوٹوں کی عزت نفس کا۔ آج اردگرد دیکھتا ہوں تو نہ وہ بڑے لوگ نظر آتے ہیں نہ کردار اور عمل کے ایسے خوبصورت شہکار۔ ہم ایک ایسے عہدِ بے عمل سے گزر رہے ہیں جس کے بارے میں منیر نیازی نے کہا تھا،

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، بڑے لوگوں کی شخصیت کے بعض پوشیدہ گوشے اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں مثلاً جنرل شفیق الرحمن انگریزی ادب کے شیدائی تھے مگر لکھتے اردو تھے۔ آخری لمحوں تک ان کی چال ڈھال آرمی کے سینئر ترین افسروں جیسی رہی لیکن عملاً درویش منش، سادہ دل اور نرم خو انسان تھے۔ شاید ہی پاک و ہند میں کسی مزاح نگار کے پاس دنیا بھر کی مختلف زبانوں کے مزاحیہ لٹریچر کا اتنا بڑا ذخیرہ ہو جتنا جنرل صاحب کے پاس تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آرمی میں سروس کے دوران اپنے انگریزی خواں ساتھیوں کے ساتھ ان کا لہجہ کیا ہوتا تھا البتہ یہ جانتا ہوں کہ انگریزی بولنے اور لکھنے پر پوری دسترس رکھنے والے اس بڑے ادیب کے سامنے اگر کوئی انگریزی بگھارنے لگتا تھا تو یہ ایک لفظ بھی انگریزی کا نہیں بولتے تھے۔ نستعلیق اردو میں بات کرتے تھے۔ کرنل محمد خاں نے اپنی مٹی، اپنے لوگوں سے کبھی تعلق نہیں توڑا۔ فوج میں گئے، کمیشن ملا، لفٹین بنے، کپتان بنے، میجر بنے اور پھر کرنل لیکن ان کے اندر کی درویشی نے کبھی اپنے منصبی اعزازات کو کسی پر طاری نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ چکوال کے کتنے ہی غریب لوگ تھے جن کی دامے، درمے، قدمے، سخنے، غرض کہ ہر طرح کرنل صاحب مدد کرتے تھے۔ ہماری پہلی ملاقات میں ان کو اردلی ملنے آیا تھا۔ اسے کرنل صاحب ماہانہ وظیفہ دیتے تھے۔ ایسے کتنے ہی لوگ تھے جن سے زندگی بھر کرنل صاحب نے وضع داری نبھائی۔ مگر ان کی زبان سے کبھی کسی کی پردہ دری نہ ہوئی۔ یہ تو مجھے بعد میں میرے اس قریبی دوست اور فزکس کے پروفیسر نے بتایا کہ میری تعلیم کرنل صاحب کی مرہونِ منت ہے کیونکہ میرے ابا ان کی کپتانی کے دور میں ان کے اردلی تھے۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس فرق کو مٹنے نہ دیں

کوریا سے آ کر بزنس کرنے والوں کو ہمارے مذہب اور کلچر کی زیادہ فکر ہے
اگر بے ہودہ اور واہیات فلمیں ... دکھائی جاتی ہیں تو کیا ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کچھ عرصہ قبل مجھے لاہور سے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ بس میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور نے انڈین فلم کی کیسٹ لگا دی۔ بس میں کافی پڑھے لکھے لوگ بیٹھے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابھی کوئی بزرگ اٹھ کر کہے گا کہ ''بھائی اس گندی فلم کو بند کردو۔'' لیکن سب خاموش تھے۔ میں سفر میں ہمیشہ دعائیں پڑھتی ہوں۔ نبی کریمؐ کا فرمان ہے ''سفر میں دعائیں کیا کرو کہ مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے۔'' تھوڑی دیر میں نے برداشت کیا۔ چونکہ ذکر میں خلل پڑ رہا تھا، آخر مجھے بولنا پڑا۔ ''بھائی صاحب مہربانی سے اس فلم کو بند کر دیں۔'' ڈرائیور نے مجھے بہت حیرانی سے دیکھا اور بس میں بیٹھے لوگ مجھے ایسے دیکھنے لگے کہ جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

ڈرائیور صاحب کہنے لگے ''بی بی اگر ہم فلم نہ لگائیں تو لوگ ہماری بس میں نہیں بیٹھتے۔ کہتے ہیں کہ ہمارا سفر نہیں گزرتا۔'' میں نے کہا کہ ''بڑے افسوس کی بات ہے، ہم مسلمان ہیں ہمیں نہیں پتا کہ نبی کریمﷺ نے کیا فرمایا ہے۔ سفر میں دعا کیا کرو۔''

دوسری طرف کورین لوگ جو یہاں ہمارے ملک میں آ کر ڈائیوو ایکسپریس بس سروس چلا رہے ہیں وہ نہ تو بے ہودہ بھارتی فلمیں دکھاتے اور نہ ہی ناچ گانے لگاتے ہیں بلکہ سفر کے آغاز میں ہمارے نبی کریمﷺ نے جو دعا سفر میں پڑھنے کو کہا ہے اُس کی ٹیپ لگاتے ہیں۔ اُن کی بس ہوسٹس اس دعا کو اُردو اور انگریزی میں دہراتی ہے۔ شاید اسی سوچ اور اچھی سروس کی بدولت ہزاروں لوگ روزانہ ان کی بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ کیا اُن کو ہمارے مذہب اور کلچر کا ہم سے زیادہ احساس ہے؟

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا رزق مقرر کیا ہے اس سے نہ کم ہوسکتا ہے نہ زیادہ۔ پھر جو لوگ ان خرافات کو پسند کرتے ہیں اُن کی خاطر بسوں والے اپنی اور دوسرے لوگوں کی زندگی خطرے میں کیوں ڈال دیتے ہیں؟ یہ آئے دن بسوں کے حادثات کیا ہمیں احساس دلانے اور جگانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ صد شکر! کہ میری بات سُن کر ڈرائیور نے جو خود بھی شاید یہی چاہتا ہوگا ٹیپ بند کر دی۔ شکریہ کہہ کر میں بیٹھ گئی۔

میں نے سنا ہے اب ماحول بہت بدل گیا ہے۔ کسی کے کہنے پر بھی بسوں والے ٹیپ بند نہیں کرتے۔ تنگ آ کر تبلیغی جماعت والوں نے تو اپنی علیحدہ بسیں چلوالی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ عام لوگ کیا کریں۔ حکومت ہی انھیں پابند کرے اور فلمیں سنسر کرا کے گندے مندے مناظر اور بے ہودہ گانے کاٹ کر دکھانے کا اہتمام کرے۔ ورنہ قوم کا اخلاق روز بروز تباہ ہوتا جائے گا۔ ساتھ بچے ہوتے ہیں۔ وہ آنکھیں کھول کھول کر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کیا ان کی آنکھیں جبراً بند کر دیں؟

یہ فرق زندگی کی اچھائی برائی واضح کرتا ہے۔ یہی زندگی کو خوبصورت بناتا ہے۔ ڈائیوو بس کمپنی نے بہت اچھا کیا ہے کہ اپنی سنسر پالیسی بنائی ہے اور فلمیں خود ہی سنسر کر کے دوران سفر دکھاتے ہیں۔ باقی کمپنیاں اول تو اتنی سمجھ نہیں رکھتیں، دوسرا ان کی ترجیح بھی نہیں ورنہ یہ کام کوئی اتنا مشکل نہیں۔ ■

سُنو اے قائدؒ اعظمؒ....

سنو اے قائداعظم تمھیں ہم یاد کرتے ہیں
بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہنے سے ڈرتے ہیں

ہمیں دلوائی آزادی بصیرت سے تدبر سے
ملا کرتی ہے یہ نعمت نصیبوں سے مقدر سے
یہ نعمت چھن بھی سکتی ہے رویے جب بدلتے ہیں
سنو اے قائداعظم تمھیں ہم یاد کرتے ہیں

تمھاری پھر ضرورت ہے یہاں حالات ہیں ایسے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا چلے گا ملک یہ کیسے
پریشانی کا عالم ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
سنو اے قائداعظم تمھیں ہم یاد کرتے ہیں

ملک سے جو بھی ہو مخلص ہمیں وہ راہنما چاہیے
وطن کا درد ہو دل میں وہ مرد باوفا چاہیے
جنھیں ہم آگے لاتے ہیں وہ نمبر دو نکلتے ہیں
سنو اے قائداعظم تمھیں ہم یاد کرتے ہیں

ملک کو رکھ دیا گروی تمھارے جاں نشینوں نے
بھنور کے بیچ میں چھوڑا ہمیں اپنے سفینوں نے
نیا جب دن نکلتا ہے نئی سولی پہ چڑھتے ہیں
سنو اے قائداعظم تمھیں ہم یاد کرتے ہیں

چودھری عبدالخالق

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جائزہ

۱۱ ستمبر ۱۱ پہلو

- دُنیا وہ نہیں رہی جو ۱۱/۹ سے پہلے تھی
- عراق کی تباہی، اسرائیل کو تحفظ دینے کے لیے تھی؟
- کیا امریکا، اسلامی تہذیب سے ٹکراؤ کو فیصلہ کن بنانا چاہتا ہے؟
- افغانستان کو پتھر کے عہد میں پہنچانے کے بعد امریکا نے عراق کا رُخ کیا
- ۹/۱۱ کے بعد اسرائیل مشرق وسطیٰ میں پہلے سے کہیں زیادہ محفوظ ہو گیا ہے

ماہ نور فیصل

کہا جاتا ہے کہ نائن الیون کے بعد یہ وہ دنیا نہیں ہے جو نائن الیون سے پہلے تھی۔ ہم نے یہاں نائن الیون کے ۱۱ مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ پہلی بات

سوویت یونین کے زوال کے بعد امریکہ اپنے آپ کو دنیا کا شہنشاہِ اعظم سمجھتا ہے۔ پوری دنیا کی دولت پر قبضہ کرنا وہ اپنا حق گردانتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کا پیٹرول ہو یا وسطی ایشیا کے زیرِ زمین خزانے ہر چیز پر پورا کنٹرول چاہتا ہے۔ اپنی شہنشاہیت مستحکم کرنے کے لیے عالم اسلام کے خلاف اُس نے کھلم کھلا اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اسلامی ملک اُس کے ظلم کا نشانہ بن رہا ہے۔ دنیا بھر کے عیسائی ممالک اُس کے ساتھ مکمل تعاون کر رہے ہیں، یہود و ہنود اُس کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں اور

وہ شک کی بنیاد پر کسی ملک پر بھی حملہ کرنے کو اپنا حق سمجھ بیٹھا ہے۔

۲۔ نائن الیون کو کیا ہوا تھا

نائن الیون مخفف ہے ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کا۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو صبح مقامی وقت کے مطابق ۸ر بج کر ۱۵ر منٹ پر ایک امریکی طیارہ فلائٹ ۱۱ر جمبو جیٹ بوسٹن ہوائی اڈے سے لاس اینجلس کے لیے معمول کی پرواز پر روانہ ہوا۔ ۳۳ر منٹ بعد تقریباً ۸ر بج کر ۴۸ر منٹ پر نیویارک میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی جب یہ طیارہ امریکی معیشت کی عظیم ترین علامت ۱۱۰ر منزلہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جنوبی ٹاور کی ۳۰رویں منزل سے ٹکرا گیا۔ ایک دوسرا امریکی طیارہ فلائٹ ۷۷، بوئنگ ۷۵۷ جو ڈلاس سے لاس اینجلس کی طرف محوِ سفر تھا، ۱۸ر منٹ بعد شمالی ٹاور کی ۵۰رویں منزل سے جاٹکرایا۔ اس وقت صدر امریکا خاصی دور فلوریڈا میں ایک سکول کی تقریب میں مصروف تھے۔ جلد ہی ایف بی آئی نے یہ خبر ان تک پہنچادی۔ دہشت اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اُنھوں نے اعلان کیا ”یہ دہشت گردی کا جاہلانہ اقدام ہے اور امریکا اپنی پوری طاقت سے دہشت گردوں اور ان کے سرپرستوں کو جواب دے گا۔“ صدر امریکا کی تقریر کے ۱۵ر منٹ بعد، امریکی انٹیلی جنس کے اعصابی مرکز اور دفاعی ہیڈ کوارٹر پینٹاگان سے ایک اور طیارہ جاٹکرایا۔

نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکی صدر بش نے مسلمانوں کے خلاف ”صلیبی جنگ“ (crusade) شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ (کیونکہ مسلمان ممالک کو پڑوسی مسلمان ممالک کے تعاون سے نیست و نابود کرنا تھا اس لیے ظاہری طور پر صلیبی جنگ کے الفاظ واپس لے لیے گئے تھے) اپنی ۲ر عمارتوں کے بدلے میں ۲ر مسلم ریاستوں، عراق اور افغانستان کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا نے نہ صرف جنوبی ایشیا میں اپنا تسلط قائم کرلیا بلکہ عراقی تیل کے ذخائر پر بھی قابض ہوچکا ہے۔

ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سیموئیل پی ہنٹگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ پیش کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ امریکا اور اہلِ مغرب کا اسلامی تہذیب اور کنفیوشس تہذیب سے ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ افغانستان اور عراق پر قبضہ کے بعد جس طرح امریکا اپنے مغربی اتحادیوں کے ساتھ پاکستان، ایران، شام، یمن، صومالیہ، نائیجیریا اور سوڈان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے، اس سے سیموئیل کے تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔ گویا امریکا اسلامی تہذیب سے ٹکراؤ کو فیصلہ کن مرحلے میں داخل کرنا چاہتا ہے۔

۳۔ نائن الیون اور القاعدہ

امریکا نے بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے القاعدہ کے سربراہ اُسامہ بن لادن کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اُسامہ بن لادن اُن دنوں افغانستان میں طالبان حکومت کے پاس مہمان کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ امریکا نے طالبان حکومت کے سربراہ ملا عمر سے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کیا جائے یا افغانستان سے نکال دیا جائے۔ اس کے لیے امریکا نے ۷ر اکتوبر ۲۰۰۱ء کی ڈیڈ لائن مقرر کی لیکن ملا عمر نے امریکا کا یہ مطالبہ مسترد کردیا، جس کے بعد امریکا نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی شروع کردی۔ چند ماہ کی مزاحمت کے بعد طالبان حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور امریکی فوج نے کابل پر قبضہ کرلیا۔

۴۔ نائن الیون اور عراق

۱۹۹۰ء میں امریکا کی شہ پر کویت پر عراقی جارحیت صدام حسین کی ایک انتہائی خطرناک اور دور رس اثرات مرتب کرنے والی غلطی تھی۔ اسلامی ممالک کو صدام حسین متواتر دھمکیاں دے رہا تھا کہ تیار ہوجاؤ میں تم کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ عرب ممالک کو امریکا کو مدد کے لیے بلانا پڑا۔ وہ تو پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ اُس نے تمام عرب ممالک میں اپنی فوجیں لاکر بٹھا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دیں۔ عرب ممالک سے کہا گیا کہ امریکن فوجوں کے اخراجات وہ برداشت کریں ۔ ۱۹۹۰ء سے عرب ممالک امریکن فوجوں کو مہمان بنا کر اپنے گھر میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام عرب ممالک پر امریکا نے لڑے بغیر قبضہ کر رکھا ہے۔

نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان کو پتھر کے زمانے میں پہنچانے کے بعد عراق کی طرف رخ موڑ لیا۔ امریکا نے عراق پر ایک جھوٹا الزام لگایا کہ اس کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے جوہری ہتھیار ہیں۔ اس جھوٹے الزام کو بنیاد بنا کر امریکا اور دوسرے اتحادیوں نے ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کر دیا۔ ۱۰ر اپریل ۲۰۰۳ء کو امریکی اور اتحادی افواج بغداد میں داخل ہوگئیں۔ امریکا نے صدام حسین کو گرفتار کرنے کے بعد عراق کی کینگرو کورٹ میں ان پر مقدمہ چلایا۔ انصاف کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، کرو جج نے امریکی خواہش کے مطابق صدام حسین کو سزائے موت سنا دی۔ ۳۰ر دسمبر ۲۰۰۶ء کو سزا پر عمل درآمد ہوا اور اس طرح عراقی صدر صدام حسین اپنی غلطیوں، بداعمالیوں اور امریکی وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

۵۔ نائن الیون کے ڈرامے کا مقصد؟

نائن الیون کے واقعہ کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کے بارے میں میڈیا کے ذریعے اب تک دو آرا سامنے آچکی ہیں۔ ایک رائے تو امریکا اور اہلِ مغرب کی ہے کہ القاعدہ کا سربراہ اسامہ بن لادن ان حملوں کا ذمہ دار ہے۔ دوسری رائے مسلمانوں کی ہے کہ یہ صیہونی یہودیوں اور عیسائیوں کی کارستانی ہے۔ ان میں سے کسی ایک رائے کو تسلیم کرنے کے لیے ہمیں نائن الیون کے نتائج پر غور کرنا ہوگا۔ اگر ان حملوں کی ذمہ دار القاعدہ ہے تو القاعدہ نے یہ حملے کیوں کیے؟ سوائے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے، وہ امریکا کو اور کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔ اس کے بدلے میں اسے کیا حاصل ہوا؟ افغانستان اور عراق کی تباہی، جنوبی ایشیا میں امریکی تسلط، اسلامی ایٹمی طاقت پاکستان میں داخلی انتشار، جہاد جیسے مقدس فریضہ پر دہشت گردی کا لیبل، کشمیر اور فلسطین کی تحاریک آزادی کا نقصان،...... جس سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے کہ نائن الیون کا واقعہ اسرائیلیوں اور امریکیوں کی مسلمانوں کے خلاف سوچی سمجھی سازش تھی، ممکن ہے اس میں سی آئی اے اور موساد نے کچھ مسلمانوں کو بھی استعمال کیا ہو۔

نائن الیون کے بعد اسرائیل مشرق وسطیٰ میں پہلے سے کہیں زیادہ محفوظ ہوگیا ہے۔ عراق کی تباہی، اسرائیل کو تحفظ دینے کے لیے ہی تھی ۔ اہم عرب ممالک سعودی عرب، شام، لبنان اور مصر اسرائیلی جارحیت کے نشانے پر ہیں۔ امریکا جو حیثیت مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو دلوا چکا ہے، وہی حیثیت جنوبی ایشیا میں بھارت کو دلانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ بھارت سے سول ایٹمی ٹیکنالوجی کا معاہدہ بھی کر چکا ہے۔ طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد افغانستان میں بھارت نواز شمالی اتحاد کی حکومت قائم ہوچکی ہے۔ پاک افغان سرحد کے ساتھ ساتھ بھارتی قونصل خانے پاکستان مخالف سرگرمیوں کے اڈے بن چکے ہیں۔ ان قونصل خانوں سے پاکستان دشمن عناصر کو جدید اسلحہ فراہم کیا جا رہا ہے۔

نائن الیون کے بعد مسلمانوں کی تحاریک آزادی کو دہشت گردی کا نام دے کر بے دردی سے کچلا جا رہا ہے۔

۶۔ نائن الیون کی آڑ میں افغانستان پر حملہ

افغانستان وہ ستم رسیدہ ملک ہے جس پر ۱۹۷۹ء میں اس وقت کی سپر پاور سوویت یونین نے فوج کشی کی۔ بالآخر ۱۰ر سال بعد روس کو افغانستان سے ناکام و نامراد واپس جانا پڑا۔ روسیوں کے جانے کے بعد افغانستان کی مزاحمت کار تنظیموں کے درمیان بالادستی کی جنگ چھڑ گئی جو تقریباً ۵ر سال جاری رہی اور اس کا خاتمہ تحریک طالبان کے ہاتھوں ہوا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

طالبان حکومت نے ۹۵ فیصد افغانستان میں مکمل امن قائم کردیا اور حالات میں بہتری کا عمل شروع ہوگیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ افغان حکومت نے القاعدہ کی قیادت کو بھی اپنے ملک میں پناہ دے دی۔ بظاہر اس بنا پر امریکا کا مطالبہ تھا کہ طالبان حکومت القاعدہ کے خلاف کارروائی کرے اور اسے اپنے ملک سے بے دخل کرے۔ صدر کلنٹن کے دور میں میزائل حملوں کے ذریعے القاعدہ قیادت کو نشانہ بنانے کی ایک براہ راست کوشش بھی کی گئی۔ اسی دوران ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیو یارک کے ٹوئن ٹاورز کی تباہی کا واقعہ رونما ہوگیا۔ امریکا نے اس کا الزام القاعدہ پر لگادیا اور اس کی آڑ میں افغانستان پر حملہ کردیا۔ یہ جنگ بھی ۱۰ سال سے جاری ہے اور اس کے نتیجے میں نہ صرف افغانستان مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہے بلکہ خطے کے کئی ممالک بھی اس کے منفی اثرات کا شکار ہیں۔

بے پناہ قتل و غارت کے باوجود امریکی و نیٹو افواج افغانستان میں ۱۱ سال گزرنے کے باوجود اپنے پاؤں نہ جماسکیں۔ چند ہزار مسلمان مجاہدین نے ایک لاکھ سے زائد امریکی فوج کو تمام تر جدید اسلحہ کے باوجود ذلیل و رسوا کرکے رکھ دیا۔

۷۔ امریکا کی مجروح شدہ ساکھ

امریکا اور اس کے اتحادی نیٹو ممالک کو اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ اب پچھلی صدیوں کی طرح طاقت کے بل پر چھوٹے ملکوں پر تسلط قائم کرنے کا سامراجی دور نہیں رہا۔ روس کے بعد امریکا اور اس کے اتحادی ملکوں کی افواج کے سامنے بھی افغانستان سے واپسی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ویتنام میں بھی امریکا کو ایسا ہی تجربہ ہوچکا ہے۔ امریکا کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں اکثر اس بارے میں تشویش کا اظہار ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے خلاف طاقت کے استعمال سے دل نہیں جیتے جاسکتے۔ امریکا سپر پاور ہے اور اس کے لیے دوسری قوموں کے خلاف فوج کشی کرنا ممکن ہے لیکن اس کے نتیجے میں وہ انسانی اور جمہوری حقوق کی علمبردار مملکت کی حیثیت سے اپنی ساکھ کو بری طرح مجروح کر رہا ہے۔ امریکی قیادت اگر اس کے برعکس دنیا کے ایک ایسے قائد کا کردار اپنالے جو اقوام عالم کے ساتھ مخلصانہ دوستی اور تعاون کے ذریعے انسانی برادری کی ترقی اور خوشحالی کا نصب العین رکھتی ہو تو یقینی طور پر پوری دنیا میں اس کے لیے خیر سگالی اور احترام کے جذبات فروغ پائیں گے۔ اور جن مفادات کو جنگ اور دوسرے ملکوں میں فوجی اڈوں کی تعمیر کے ذریعے محفوظ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ بغیر تکلیف اسے حاصل ہوجائیں گے۔

۸۔ نائن الیون اور بے چارہ پاکستان

پاکستان کا مسئلہ وطن عزیز پر مسلط نام نہاد اشرافیہ کی وہ سوچ (mindset) ہے جو امریکا کو خدا مانتی ہے۔ اس سوچ کا اللہ تعالیٰ پر کم اور امریکا پر زیادہ ایمان ہے۔ یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ جو فیصلہ جنرل مشرف نے ایک فون کال پر ۹/۱۱ کے فوری بعد کیا، وہی فیصلہ جمہوریت کے نام پر ہم پر مسلط امریکی غلاموں نے کئی ماہ سوچ بچار اور پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد کیا۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو حکم دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مشرکوں کی مدد نہ کرو اور یہ کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے بدترین دشمن ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ امریکا کے خوف کی وجہ سے اللہ رب العزت کے حکم سے کھلی روگردانی کر رہے ہیں۔ ہم نے پہلے امریکا کی مدد کرکے افغانستان کی اسلامی حکومت کو ختم کرایا اور پھر وہاں یہود و نصاریٰ کا قبضہ کرایا۔

جولائی ۲۰۱۲ء میں پاکستان پر مسلط غلامان امریکا نیٹو سپلائی لائن کھول کر ایک بار پھر افغانستان پر قابض مشرکوں کی اس فوج کی مدد کر رہے ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین اور افغان طالبان کو کچلنے میں مصروف ہیں۔ نیٹو سپلائی لائن کھول کر ہم ان طاغوتی قوتوں

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کی مدد کر رہے ہیں، جنھوں نے افغانستان میں حال ہی میں قرآن کریم کی بے حرمتی کی اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ ہمارے جیسوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا ''اُنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعہ قوت ہوں (یا ان کی حمایت میں آکر وہ محفوظ رہیں)'' اسی طرح سورۂ یٰسین میں کہا گیا ہے ''اور اُنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا لیے ہیں اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائے گی۔''

پاکستان پر مسلط غلامانِ امریکا کی سوچ نے امریکا کو اپنا الٰہ بنا لیا مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب اس کے فیصلے کا وقت آگیا تو اللہ کے سوا دوسروں کو الٰہ ماننے والوں کے الٰہ اُن کے کسی کام نہیں آسکیں گے اور وہ (دُنیاوی خدا) اُن کے لیے تباہی اور ہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بن سکیں گے۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ امریکا کے خوف سے ۱۱/۹ کے بعد اُس کی مدد کرنے پر پاکستان غیر محفوظ، کمزور اور تقسیم ہو کر تباہی و بربادی کے دہانے تک پہنچ گیا۔ ہم تو امریکا کی مدد کر کے محفوظ ہونا چاہتے تھے، خوشحالی کے متمنی تھے مگر ہمیں ماسوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ نہ ملا۔ افسوس کہ اس سب کو دیکھنے کے باوجود ہماری سوچ نہ بدلی اور ہم نے اُسی رستہ پر ہی چلنے کا ارادہ کیا جو یقیناً تباہی اور بربادی کا رستہ ہے۔ یہاں بہت سے ایسے مسلمان ''فلاسفر'' اور ''دانشور'' موجود ہیں جو اپنی دانش کے کمال پر پاکستان کے مسلمانوں کے خلاف کفر کی جنگ میں امریکا کا ساتھ دینے کے حق میں مختلف جواز پیش کرتے ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی اللہ کی بات کو نہیں مانیں گے بلکہ اُس کے برخلاف کام کریں گے تو پھر رسوائی ہمارا مقدر کیونکر نہ ہوگی۔ ذرا ہماری حالت دیکھیں ہم نے اللہ کی ناراضی کا خیال کیے بغیر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں امریکا کا ساتھ دیا مگر امریکا نے ہم پر ہی ڈرون حملے اور سلالہ اٹیک کیے اور پاکستان کو دنیا بھر کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا کر پیش کیا۔ پاکستان امریکا کی مسلم کش جنگ کا سپورٹر بنا مگر امریکا نے اس جنگ کو پاکستان کے اندر ہی دھکیل دیا۔ ہم نے امریکا کا ساتھ اس لیے دیا کہ ہم بچ جائیں، ہمارا مال اور جانیں بچ جائیں مگر ہمارے ۴۰ ہزار سے زیادہ افراد اس جنگ کا ایندھن بن چکے۔ ہم کفر کی اس جنگ کا حصہ بننے کے نتیجے میں پیسا بٹورنا چاہتے تھے مگر آج ہماری معیشت کو روزانہ ۳ ارب روپے کا نقصان محض اس امریکی جنگ کا حصہ بننے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اب تک پاکستان کو نام نہاد دہشت گردی کی جنگ کی وجہ سے ۶۵۰۰ ارب روپے سے زیادہ نقصان ہو چکا ہے۔ اس سب کے باوجود ہم نے نیٹو سپلائی لائن کھول دی تاکہ امریکا خوش ہو جائے۔ مگر یہ بھی میرے اللہ کا وعدہ ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے اور اُس وقت تک اُن (مسلمانوں) سے خوش نہیں ہو سکتے جب تک وہ دینِ اسلام کو چھوڑ کر ان کا مذہب اپنا نہیں لیتے۔

(امریکا کو الٰہ ماننے والوں کا انجام: انصار عباسی روزنامہ جنگ ۹ جولائی ۲۰۱۲ء)

۱۱/۹ نائن الیون کے بعد امریکی قوم کی اصل حقیقت پوری دنیا نے جان لی

ایک قوم کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اُس کے اندر احترامِ آدمیت ہے یا نہیں، انسانی جان کی اُس کی نظر میں کیا اہمیت ہے، قیدیوں، عورتوں، بچوں، بیماروں کے ساتھ اُس کا رویہ کیسا ہے۔ دوسروں کے مذاہب اور ان کی مذہبی کتب کے بارے میں اُن کے کیا خیالات ہیں۔

امریکن ایک وحشی قوم ہے جس نے اپنے چہرے پر شرافت، انسانیت اور اخلاق کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ جنگ عظیم دوم میں یہ امریکا ہی تھا جس نے جاپان کے ۲ شہروں پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں معصوم بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو ہلاک کیا تھا۔

عراقی قیدیوں کے ساتھ ابوغریب جیل میں جو سلوک

روا رکھا گیا، اُنھیں ننگا کر کے انسانیت کی تذلیل کی گئی۔ جنسی تشدد، نقلی پھانسی، بھوکا پیاسا رکھنے، بجلی کے جھٹکے دینے اور تشدد کے مختلف طریقے استعمال کرنے کی رپورٹس اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

کیوبا کے ایک حصے پر امریکا نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ مسلمان قیدیوں کو انھوں نے امریکا میں رکھنے کی بجائے گوانتاناموبے میں رکھا۔ یہاں القاعدہ اور طالبان قیدیوں کو ایک اعشاریہ آٹھ میٹر چوڑے اور دو اعشاریہ چار میٹر لمبے پنجروں میں رکھا گیا۔ امریکی حکومت ان سے غیر انسانی سلوک کرنے کے لیے دلیل یہ دیتی رہی کہ یہ جنگی قیدی نہیں بلکہ ''غیر قانونی لڑاکا'' افراد تھے۔ ان قیدیوں کو امریکی سرکار انسانوں کے زمرے ہی میں شامل کرنے کے لیے تیار نہ تھی بلکہ اُنھیں جانوروں سے بدتر سمجھتے ہوئے اُن کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جو دنیا کا کوئی اجڈ ترین انسان ہی روا رکھ سکتا ہے۔

عورتوں کے ساتھ سلوک کی وہ شرمناک مثال ہمارے سامنے ہے جس کی توقع دنیا کی کسی جاہل قوم سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ ظالمانہ سلوک امریکا کے غیر منصفانہ عدالتی نظام کا بھانڈا پھوڑنے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ عدالتی فیصلے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ملک کس پستی میں گر چکا ہے۔ ایک مظلوم عورت پاکستان سے اغوا کی جاتی ہے اور امریکا میں لے جا کر اُس کو ۸۵ سال قید کی سزا سنا دی جاتی ہے۔

۱۰۔ ڈالر! میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا

درج ذیل نظم نعیم صدیقی نے ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء کو اُس وقت تحریر کی تھی جب پہلی دفعہ یہ خبر آئی تھی کہ امریکا نے پاکستان کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس ڈالر کو لینے کے لیے ہمارا ایک ڈکٹیٹر اپنی کتاب میں فخر سے لکھتا ہے کہ ہم نے اپنے وطن کے شہری امریکا کے ہاتھ بیچ کر ڈالر لیے۔ آج بے حساب لوگ پاکستان میں مختلف شعبہ جات میں بیٹھے امریکا کے مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں اور امریکن ڈالر وصول کر رہے ہیں۔

ڈالر! میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!
تو ظلم کا حاصل!
تو سحر ملوکانہ کا ایک شعبدۂ خاص!
سرمائے کی اولاد!
تو جیب تراشوں کے کمالات کا اک کھیل!
تو سود کا فرزند!
افلاس کی رگ رگ سے تو نچڑا ہوا خوں ہے!
بیواؤں کی فریاد!
ہے کتنے یتیموں کی فغانِ خاموش!
تو ضعف کی ایک چیخ!
تو کتنے شبابوں کا ہے اک نوحۂ دلگیر!
تو کتنی تمناؤں کی ایک قبر سنہری!
تاریخ کا ایک اشک!
تو جنگ کی پرہول نفیروں کا تجسم!
تو موت کی پریوں کا فسوں کار ترنم!
تو برق جہاں سوز کا خونخوار تکلم!
لاشوں سے کمائی ہوئی دولت!
تہذیب کو تو زخم لگانے کی ہے اجرت!
اف کتنی ہی اقوام کے نیلام کی قیمت!
بچھو کا تو ڈنک!
سانپوں کا تو زہر!
انگاروں کا ہے سوز
ہے سونے کے لفظوں میں لکھی تلخ حقیقت!
ڈالر! میرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

☆☆

اے سونے کے ڈالر!
اس فاقہ و افلاس پہ تو رحم نہ فرما!
بھوکے ہیں یہاں پیٹ!
ننگے ہیں یہاں جسم!
پھر روگ ہیں، اور درد......

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جو چارہ گری کے نہیں شرمندۂ احساں!
یہ ٹھیک! ''چچا سام'' کے اے راج دلارے!
لیکن مری اس بات سے ناراض نہ ہونا!
بھوکے ہیں اگر پیٹ، تو ہم بھوکے ہی اچھے!
ننگے ہیں اگر جسم، تو ہم ننگے ہی اچھے!
ڈالر مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

☆☆

تو آئے تو ڈالر!
سو عیش تو ہوں گے
سکھ چین اڑیں گے!
زرخیز ہیں گو کھیت
پر قحط آئیں گے
کھاتے تو بھریں گے
ہم فاقے کریں گے
جامے تو سلیں گے
تن کم ہی ڈھکیں گے
آمد تو کرے گی
اور بھاؤ چڑھیں گے
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

☆☆

اس دیس میں تو آئے تو اے سونے کے ڈالر!
آئے گا ربو بھی!
رچھائے گا زنا بھی!
پھیلے گا جوا بھی!
اڑ جائے گا ہر پھول سے پھر رنگ حیا بھی
اخلاق پہ منڈلائے گی ہر گندی وبا بھی
تو آئے تو اے ڈالر!
یاں لائے گا اک اور ہی افتاد! یقیناً!
یاں پھیلے گا نظریہ الحاد یقیناً!
ہو جائیں گے ایمان تو برباد یقیناً!
انسان کو بنا دے گا تو جلاد یقیناً!
بس جائے گی یہ ملتِ آزاد! یقیناً!
عبرت کا بنا نقش ترے فیض سے ہی چین
ترکی ہے تو مظلوم!
برباد فلسطین!
ڈالر اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

☆☆

تو آئے تو پھر ہم میں حمیت نہ رہے گی!
اس قوم میں، اس دیس میں غیرت نہ رہے گی!
اشراف میں کچھ بوئے شرافت نہ رہے گی!
رشتوں میں کہیں روحِ اخوت نہ رہے گی!
ڈرتا ہوں میں اسلام کی عزت نہ رہے گی!
تو آئے تو ڈالر!
تسلیم کی خو آکے رہے گی!
تقلید کی بو آکے رہے گی!
احساس کی آواز رکے گی!
افکار کی پرواز رکے گی!
تو آئے تو ڈالر!
کچھ اور عنایات بھی ساتھ آتی رہیں گی!
کچھ خفیہ ہدایات بھی ساتھ آتی رہیں گی!
مغرب کی روایات بھی ساتھ آتی رہیں گی!
اغیار کی عادات بھی ساتھ آتی رہیں گی!
ادبار کی آیات بھی ساتھ آتی رہیں گی!
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا

☆☆

یہ خاکِ مقدس!
اک قوم کا گھر ہی تو نہیں!
اسلام کا گھر ہے!
یہ حق کے لیے وقف ہے مسجد کی طرح!
اک تجربہ گاہ!
مخصوص جو قرآن کے اصولوں کے لیے ہے!
اللہ کے لیے، اس کے رسولوں کے لیے ہے!
کانٹوں کے لیے کب ہے؟ یہ پھولوں کے لیے ہے!
اس دیس میں اب بزمِ نئی ایک سجے گی

اس دیس سے تہذیب نئی ایک اٹھے گی
یہ تجربہ گاہ ایک نیا دور جنے گی
انساں کو نئی روشنی اب یاں سے ملے گی
پھر مطلعِ خورشید ہے شعلہ بداماں!
رنگوں کے یہ گرداب!
کرنوں کے یہ طوفان!
......اک صبح کے سامان!
یہ آدمِ خاکی کے لیے آخری امید!
یہ جنتِ اخلاق کی تاسیس، یہ تمہید!
مستقبلِ انسان کی تاریخ کی تسوید
یہ آخری امید!
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

☆☆

۱۱۔نائن الیون کے بعد امریکا میں قبول اسلام

علامہ اقبالؔ نے بہت پہلے فرمایا تھا
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

جب دشمنانِ اسلام نے پوری دنیا میں اسلام کی اشاعت کی رفتار دیکھی تو انہیں بے حد تشویش ہوئی اور ان کی رگِ سازش پھر پھڑک اٹھی۔ یہ سازش پہلی بار نہیں کی گئی بلکہ سازشوں کا مستقل اور مسلسل عمل صدیوں سے جاری ہے۔ ۲۰۰۱ء میں ہونے والا نائن الیون کا واقعہ اس سازشی سلسلے کی ہلاکت آفرین کڑی تھی۔ اسلام دشمن چلے تھے مسلمانوں اور اسلام کو نفرت کی علامت بنانے مگر دینِ حق پوری دنیا کے لیے پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرکشش ثابت ہوگیا۔ خود امریکا میں نائن الیون کے بعد اسلام کی اشاعت کی رفتار مقابلتاً بڑھ گئی۔ نائن الیون کے بعد صرف امریکا میں ۱۵ لاکھ غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ سازشوں اور ذیلی سازشوں کا سلسلہ ابھی جاری و ساری ہے جبکہ اشاعت اسلام (بالخصوص امریکا میں) کی رفتار میں روز افزوں اضافہ دنیا بھر کے لیے حیرت انگیز حقیقت بن کر اُبھرا ہے۔

آج امریکا میں اسلام سب سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ فروغ پانے والا دین ہے، حالانکہ دوسرے مذاہب کو نسبتاً زیادہ وسائل اور سہولیات حاصل ہیں۔ چند سال قبل امریکی محکمہ دفاع کی رپورٹس کے مطابق امریکی مسلح افواج میں ۹ہزار سے زائد مسلمان شامل تھے۔ خلیج کی جنگ کے دوران میں ۳ہزار سے زائد امریکیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ امریکی جیلوں میں ۳ لاکھ سے زائد غیر مسلم مسلمان ہو چکے ہیں اور قیدیوں کے قبول اسلام کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

جنوری ۲۰۰۱ء میں امریکا میں مسلمانوں کی تعداد اور اشاعت اسلام کی شرح و رفتار کا جائزہ لینے کے لیے سب سے پہلے جو جامع ترین سروے ہوا، اس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کی تعداد ۶۰ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے اور نماز پنجگانہ ادا کرنے کے لیے ۱۲۰۰ مساجد قائم کی جا چکی ہیں۔ کونسل آف امریکن اسلامک ریلیشنز کی تحقیق کے مطابق امریکا میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح مسلمانوں میں نسلی اور فرقہ وارانہ امتیازات پائے جاتے تھے مگر الحمدللہ نائن الیون کے بعد اس بیماری میں معتدبہ کمی رونما ہوگئی۔

۲۰۱۰ء میں محکمۂ خارجہ نے امریکا میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں حقائق جاننے کے لیے جو رپورٹ مرتب کرنے کا اہتمام کیا تھا اس کے مطابق امریکا میں اسلام تمام دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اشاعت پذیر مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۲۰۱۰ء کے آخر میں مسلمان آبادی یہودیوں سے بڑھ جائے گی اور اسلام امریکا کا دوسرا بڑا مذہب بن جائے گا۔

اس وقت پورے ملک میں مساجد کی تعداد ڈھائی سے تین ہزار کے درمیان ہے۔ اسلامک ڈے اسکولز اور سنڈے اور ویک اینڈ اسکولز کی تعداد میں بھی برق رفتاری کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ہم کسی سے کم نہیں

ماہِ رفتہ میں رونما ہونے والے اہم واقعات اور اُن سے وابستہ شخصیات کا اجمالی تذکرہ جو ملک کا وقار بڑھنے کا باعث ہیں

اُن کے لیے خاص جنھیں پاکستان اور پاکستان کی عزت بے حد عزیز ہے

تحریم حنا صدیقی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ہم آپ کی ۳ر پاکستانیوں سے ملاقات کرا رہے ہیں۔ سب سے پہلے حمزہ اعجاز عباسی کا قصہ پڑھیں یہ ذہین و فطین نوجوان دین و دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔ علیم ڈار نے ملک کا نام روشن کرنے کا سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ ان کی تازہ کامیابیوں کے بارے میں تفصیلات پڑھیں۔ اشیہ کامران نے SLOW LEARNERS بچوں کے لیے پاکستان میں پہلا ادارہ قائم کیا ہے۔ ان کی ہمت اور محنت کی داستان پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔

قابلِ فخر مثال

حمزہ اعجاز عباسی ۱۹۹۰ء میں امریکہ میں پیدا ہوا اور پاکستان اور سعودی عرب میں پلا بڑھا اور تعلیم حاصل کی۔ ۲۱ر سال کے اس نوجوان نے او لیول اور پھر اے لیول میں اعلیٰ ترین گریڈز (straight As) حاصل کیے اور پھر شاہ فہد یونیورسٹی دہران (King Fahd University) سے کمپیوٹر انجینئرنگ میں امتیازی حیثیت کے ساتھ گریجویشن مکمل کی۔ اب اس نوجوان کو میرٹ پر امریکا کی بہترین درس گاہوں میں شامل جارجیا ٹیک (Georgia Tech) یونیورسٹی میں ماسٹر پی ایچ ڈی (Masters leading to Phd) کا اسکالرشپ مل چکا ہے اور ان شاء اللہ وہ ایک ماہ میں تعلیم کی غرض سے وہ امریکا روانہ ہوجائے گا۔ ابھی تک جو میں نے حمزہ کے بارے میں لکھا، اس میں کوئی خاص بات نہیں کیونکہ ماشاء اللہ ہمارے نوجوانوں میں ٹیلنٹ اور قابلیت کی کوئی کمی نہیں۔ اب جو مزید میں لکھنے جا رہا ہوں وہ بھی ہمارے بہت سے بچوں کی خاصیت ہے جو یقیناً قابلِ ستائش بات ہے مگر حمزہ کس طرح دوسروں سے مختلف اور قابلِ فخر ہے، اس کا ذکر آگے چل کر اس مضمون میں ہوگا جس کے لیے اس تمہید کا باندھنا میں نے ضروری سمجھا۔ اپنے اللہ کے کرم

مجھ میں کوئی خاص ٹیلنٹ نہیں۔ میں محض چیزوں کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش میں رہتا ہوں
(آئن سٹائن)

ہے حمزہ پانچ وقت کا نمازی اور انتہائی نیک بچہ ہے۔ قرآن کا فہم رکھتا ہے اور اپنے شوق سے اللہ کی اس کتاب کو لفظ بہ لفظ سمجھ کر پڑھتا ہے اور عمل میں ماشاء اللہ ایسا کہ اس عمر کے بچوں سے کم توقع کی جا سکتی ہے۔ اپنی گریجویشن مکمل کرنے پر بجائے اس کے کہ سیر سپاٹے پر نکل جاتا، حمزہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ۴ ماہ تبلیغی جماعت کے ساتھ گزارے گا تاکہ امریکا جانے سے پہلے تبلیغ اسلام کے کام کو سمجھ سکے۔ آج کل حمزہ نجانے پاکستان کے کس کونے میں تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت لگا رہا ہے، مجھے علم نہیں۔ مگر اسی دوران ایک دن میری حمزہ کے والد محترم اعجاز عباسی صاحب سے بات ہو رہی تھی کہ باتوں باتوں میں اُنھوں نے ایک ایسا انکشاف کیا جس سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اعجاز بھائی کا کہنا تھا کہ حمزہ کے پاکستان آنے کے بعد وہ اس بچے کی کتابوں اور دوسری اشیا کی صفائی ستھرائی کر رہے تھے کہ ان کے ہاتھ ایک محفوظ انداز میں رکھا گیا کاغذ کا ٹکڑا لگا، اس کو جب کھولا گیا تو وہ حمزہ کا وصیت نامہ نکلا۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حمزہ کو شاہ فہد یونیورسٹی میں اپنی قابلیت اور بہترین کارکردگی کی وجہ سے شروع دن سے ہی اسکالرشپ ملتا رہا جس کی وجہ سے اس کے پاس بینک میں لاکھوں روپے موجود ہیں۔ باوجود ایک ایسے ماحول اور ایسے معاشرے سے تعلق رکھنے کے، جہاں دوسرے کے حقوق کو چھیننا ایک رواج ہے، جہاں عورتوں کو وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے، جہاں پیسہ بٹورنا، چاہے حرام طریقے سے ہی کیوں نہ ہو، ایک کاروبار بن جائے، جہاں دین کو بھی اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا جاتا ہو، جہاں نوجوان مغربی کلچر سے اس قدر متاثر ہوں کہ اپنی پسند ناپسند اور فائدہ نقصان کے لیے اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے کھیلا جاتا ہو اور جہاں پیسہ ایمان بن جائے اور موت کے بارے میں سوچا ہی نہ جا رہا ہو، ایک ۲۱ سالہ نوجوان باقاعدہ وصیت نامہ لکھ رہا ہے۔ اپنی وصیت میں کیا لکھتا ہے، اسے خود پڑھ لیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تحریر میرا وصیت نامہ ہے جس کو میرے اس عارضی دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قرآن اور سنت کے مطابق استعمال کیا جائے۔ وصیت لکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

نوٹ: اگر مندرجہ ذیل باتوں میں کوئی بات قرآن اور سنت سے ہٹ کر ہے تو اُسے چھوڑ اور پھینک دیا جائے۔

۱۔ سب سے پہلے اگر میرے ذمے خدانخواستہ کسی کا کوئی قرضہ رہ گیا ہو تو اس کی پوری رقم میرے پیسوں سے ادا کر دی جائے۔

۲۔ میرے باقی پیسے اور سامان میرے ماں باپ، بہن بھائی اور رشتہ داروں وغیرہ میں قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق تقسیم کر دیے جائیں۔ بروز اتوار، ۵ مئی ۲۰۱۱ء

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

حمزہ کی اس تحریر کا اختتام درود شریف سے ہوتا ہے۔ مجھے حمزہ کی اس وصیت نے اس قدر متاثر کیا کہ اعجاز بھائی کے اصرار کے باوجود کہ اگر حمزہ کو معلوم ہو گیا کہ دوسروں کو اس کی وصیت کی خبر مل گئی تو وہ بُرا مان سکتا ہے، میں نے فیصلہ کیا کہ اس کو شائع ہونا چاہیے تاکہ ہم بڑوں کو کچھ شرم آئے اور ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو آج کے دور کے ایسے گم نام رول ماڈل سے متعارف کرایا جائے جس کا فلموں، گانوں، ڈراموں اور لغو کاموں سے تعلق نہیں، جو اس دنیا کو اپنی آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے، جس کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور جو اسلام سے شرمانے والا نہیں۔ (انصار عباسی)

پاکستانی جس نے اپنے کیریئر کا ایک اور اہم سنگ میل عبور کرلیا

سپورٹس سے وابستہ جن افراد نے پاکستان کا نام دنیا بھر میں روشن کیا، ان میں علیم ڈار سرفہرست ہیں۔ باوقار اور حلیم طبع علیم ڈار کا شمار کرکٹ کے ممتاز امپائروں میں ہوتا ہے۔ ماضی کے مایہ ناز امپائر ڈکی برڈ بھی علیم ڈار کو عصر حاضر کا بہترین امپائر قرار دیتے ہیں۔

گزرتے وقت کے ساتھ امپائرنگ میں ان کے کارناموں کی فہرست طویل ہوتی جارہی ہے۔ ان کا سفر ابھی جاری ہے اور امید ہے کہ وہ مستقبل میں امپائرنگ کے شعبے میں اور بھی زیادہ رفعتوں سے ہمکنار ہوں گے۔

آپ نے اپنے کیریئر کا ایک اور اہم سنگ میل عبور کرکے وطن عزیز کا نام روشن کیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق علیم ڈار امپائرنگ کے میدان میں کامیابیوں کی سیڑھی تیزی سے چڑھ رہے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے سب سے زیادہ میچز میں امپائرنگ کرنے والے ایشیائی کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اب ۱۵۰ ون ڈے میچز میں ذمہ داری انجام دینے والے امپائرز کے خصوصی کلب میں شامل ہوگئے ہیں۔ وہ یہ کلب جوائن کرنے والے تاریخ کے ساتویں امپائر ہیں۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا کے درمیان لارڈز میں کھیلے گئے پہلے ون ڈے میں امپائرنگ کرکے وہ اس سنگ میل پر پہنچے۔ تقریب تقسیم انعامات کے موقع پر میچ ریفری جواگل سری ناتھ نے انھیں شیلڈ پیش کی۔ ۱۵۰ ون ڈے میچوں کی تکمیل پر علیم ڈار کا کہنا تھا "میں اس مخصوص کلب کا رکن بن کر بہت خوش ہوں۔ اس فہرست میں اس معزز پیشے کے سب سے قابل احترام نام شامل ہیں۔ میں خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اتنے مواقع ملے اور پی سی بی اور آئی سی سی کی حمایت حاصل رہی۔" یہاں ہم آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ آئی سی سی کی تاریخ میں سب سے زیادہ ایک روزہ میچ سپروائز کرنے کا اعزاز نیوزی لینڈ کے روڈی کوئرٹزن کو حاصل ہے جنھوں نے ۲۰۱۰ء تک ۱۸؍سالہ کیریئر میں ۲۰۹؍میچوں میں امپائرنگ کی۔ آج کل ایلیٹ پینل میں شامل امپائرز میں سب سے زیادہ ایک روزہ میچ کھلانے کا ریکارڈ نیوزی لینڈ کے ہی سائمن ٹوفل کے پاس ہے جنھوں نے اب تک ۱۷۲ میچ سپروائز کیے ہیں۔

۴۴؍سالہ علیم ڈار پہلے ہی مسلسل ۳؍مرتبہ آئی سی سی امپائر آف دی ایئر ایوارڈ جیت کر ڈیوڈ شیفرڈ ٹرافی اپنے نام کرچکے ہیں، انھوں نے فروری ۲۰۰۰ء میں گوجرانوالہ میں پاکستان اور سری لنکا کے درمیان میچ میں ذمہ داری سے امپائرنگ کرکے اپنے عالمی امپائرنگ کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

انھیں ۲۰۰۲ء میں ایلیٹ پینل میں شامل کیا گیا جبکہ اکتوبر ۲۰۰۳ء میں ڈھاکہ میں بنگلہ دیش اور انگلینڈ کے مابین ٹیسٹ میچ ان کے امپائرنگ کیریئر کا پہلا ٹیسٹ تھا اور اب تک وہ ۷۴؍ٹیسٹ میچ سپروائز کرچکے ہیں۔ علیم ڈار ۲۰۰۷ء اور ۲۰۱۱ء میں آئی سی سی ورلڈ کپ کے فائنلز میں بھی امپائرنگ کرچکے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ذیل میں ہم علیم ڈار صاحب کے بیان کردہ وہ واقعات درج کر رہے ہیں۔ یہاں ان واقعات کو لکھنے کا مقصد نئی نسل کو یہ بتانا ہے کہ ابتدائی عمر میں بڑے لوگ بھی ہمارے جیسے عام انسان ہوتے ہیں لیکن پھر وہ زبردست محنت اور سنجیدگی سے اپنی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں اور دنیا میں ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ کوئی مافوق الفطرت مخلوق معلوم ہونے لگتے ہیں۔

علیم ڈار بتاتے ہیں کہ بچپن میں مجھے پتنگیں اڑانے کا تو نہیں البتہ لوٹنے کا بہت شوق رہا۔ میرے بھائی پتنگیں اڑاتے اور میں انہیں لوٹ لوٹ کر پتنگیں لا کر دیتا۔ عام طور پر پتنگ لوٹنے والوں کی نگاہ پتنگ پر ہی رہتی ہے، لیکن میں ہوا کے رخ کا اندازہ لگاتا اور ڈور پر بھی نظر رکھتا۔ اس سے میرے لیے پتنگ کی آخری منزل کا پتا چلانا آسان ہوجاتا۔ میں موسم کی شدت سے بے نیاز سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں پتنگیں لوٹنے میں لگا رہتا۔ دوبار ایسا بھی ہوا کہ اس شوق کے باعث میں کسی بڑے حادثے سے دو چار ہوسکتا تھا، لیکن قدرت نے مجھے بال بال بچالیا۔ مجھے یاد ہے، گوجرانوالہ میں ایک روز میں پتنگ لوٹنے کی تگ و دو میں اس درجہ کھویا ہوا تھا کہ اردگرد کا ہوش نہ رہا اور اپنی طرف تیزی سے آتی گاڑی بھی نہ دیکھ سکا، جو مجھے بچاتے بچاتے خود دیوار سے جاٹکرائی۔ میں اس ساری صورت حال سے گھبرا گیا اور اس خوف سے کہ اب گاڑی والے میری مرمت کریں گے، بھاگ نکلا اور گھر پہنچ کر سکون کا سانس لیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ پتنگ لوٹنے کی کوشش میں پُل کے کنارے کے قریب پہنچ گیا اور یقیناً نہر میں گر جاتا، اگر عین اس موقع پر میرے ہاتھ میں پل کا جنگلہ نہ آجاتا۔ اس شوق کے باعث اور بھی کئی دفعہ مشکلات نے گھیرا، لیکن یہ دونوں واقعات ایسے تھے جن سے میری جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔

ایک اور دلچسپ قصہ علیم ڈار نے یہ سنایا کہ جب ہم چشتیاں میں رہتے تھے، تو فورٹ عباس سے گزرنے والی نہر میں بڑے شوق سے نہانے جایا کرتا تھا۔ یہیں سے میں نے سوئمنگ سیکھی۔ ایک مرتبہ میں اودھر نہا رہا تھا، تو ایک بھینس میرے پیچھے پڑ گئی اور میرے لیے اس سے بچنا مشکل ہوگیا۔ وہ میرے اس قدر قریب آگئی کہ دو تین بار اس کے سینگ بھی مجھے لگے۔ بہر حال میں نے ہمت نہیں ہاری اور کسی نہ کسی طرح اس سے پیچھا چھڑایا اور نہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

جس معاشرہ اور ملک میں بالغوں اور بچوں کے حقوق بھی روندے جا رہے ہوں وہاں ایسے بچوں کے ''حقوق'' کا کیا ذکر جنھیں SLOW LEARNERS کہا جاتا ہے اور وہ پیدائشی طور پر LEARNING DIFFICULTIES کا شکار ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے بچے جن کے سیکھنے کی رفتار بہت سست ہوتی ہے اور ایسے بچوں کے لیے پاکستان جیسے ملکوں میں REMEDIAL ایجوکیشن کا کوئی تصور بھی موجود نہ ہو۔ میں یہ جان کر کانپ اٹھتا ہوں کہ ایسے بچوں کے متمول اور پڑھے لکھے والدین بھی انہیں ''اثاثہ'' نہیں ''بوجھ'' سمجھتے ہیں اور عملاً انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جبکہ مناسب توجہ، محنت، محبت، یکسوئی اور حکمت عملی سے ان SLOW LEARNER بچوں کو بھی کار آمد شہری بنایا جاسکتا ہے۔ ایک قابل فخر ماں پاکستان میں یہ معجزہ دکھا چکی ہے کہ جب اَشوا کامران کی اپنی گود میں ایک ایسا ہی تارا قدرت نے کئی سال پہلے اتارا تو اس عظیم ماں کو جب چند برسوں میں اصل مسئلہ اور المیہ کی سمجھ آئی تو اس کے سامنے صرف ۲ ہی آپشنز، صرف ۲ ہی راستے تھے۔ پہلا وہی کہ بچے کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور دوسرا...... کٹھن راستہ یہ تھا کہ حالات کا رخ موڑ دے ...... پھر اَشوا کامران نے عظیم جہاد کا آغاز کیا، ممتا اپنے بیٹے کو ٹریک پر لے آئی۔ پھر اس کے بعد اس نے اپنی زندگی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اس مقدس مشن کے لیے وقف کردی اور یوں وہ پاکستان کے ہر SLOW LEARNER بچوں کے لیے روحانی ماں کا روپ دھار گئی اور آج اس کے بہت سے ''بچے'' مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں میں کام کر رہے ہیں، اپنے پیروں پر کھڑے اور معاشرہ پر بوجھ بننے کے بجائے اس کا بوجھ بانٹ رہے ہیں۔

مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کیا آپ نے انڈین فلم ''تارے زمین پر'' دیکھی ہے؟ نہیں دیکھی تو ضرور دیکھیں کہ میں کس قسم کے بچوں کی بات کر رہا ہوں اور عبدالستار ایدھی کا زنانہ روپ آشوا کامران ...... ہماری یہ مقامی مدر ٹریسا کس قسم کے بچوں کے لیے اپنا تن من دھن لٹانے کو مقصدِ حیات بنا چکی۔

آشوا نے اس موضوع پر......اس گمنام موضوع پر شعور کی بیداری کے لیے ایک نیا فورم، ایک نیا پلیٹ فارم بھی متعارف کرایا ہے PAKISTAN ASSOCIATION FOR DIFFICULTIES IN LEARNING جس کا مخفف ہے ''پیدل'' جو میرے نزدیک جنت تک جانے کا ''پیدل'' راستہ ہے۔

۱۳ر جولائی ۲۰۱۲ء کو الحمراء میں ''پیدل'' نے اپنا ۱۰۰ واں دن سیلی بریٹ کیا جس میں بچوں اور بالغوں نے بھرپور شرکت کی اور ان SLOW LEARNERS کی پرفارمنس نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہ بچے SLOW ہیں تو پھر FAST کیسے ہوتے ہیں؟ آشوا کا کہنا ہے SLOW LEARNERS ARE NOT A WASTE میرے لیے یہ اطلاع حیران کن تھی کہ بجلی کے باپ ایڈیسن اور آئن سٹائن سے لے کر ابھیشک بچن تک سب کا تعلق اسی SLOW LEARNER قبیلے سے تھا اور ابھیشک کو چھوڑ کر باقی وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کا چہرہ، رخ، روح، سمت، ترجیحات، بود و باش غرضیکہ سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دیا۔

کیا ہم اپنے آئن سٹائن اور ایڈیسن لاوارث چھوڑ دیں؟ کبھی آشوا اور ان کے میاں اپنے بچے کے لیے سکول ڈھونڈتے پھرتے تھے لیکن ہر دروازہ بند تھا۔ تھک ہار کر آشوا نے اپنے شریک حیات کامران کی محبت اور مدد سے اپنے بیٹے کے لیے ایک ایسا سکول شروع کیا جہاں ان کے بیٹے جیسا ہر بچہ داخل ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ آج ان کا اپنا بیٹا اے لیولز اور بیچلر کرنے کے بعد خود کفیل و کامران نہیں بلکہ بہت سے دوسرے بچے بھی آشوا اور ان کے شریک حیات کے زیر سایہ خود کفالت اور خود مختاری کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

اگر آپ اپنے کسی بچے میں Learning Difficulties محسوس کرتے ہیں تو فون نمبر 042-35960106 یا ای میل paidal2012@imail.com پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

آشوا نے اپنے اور پھر غیروں کے بچوں کی بہتری، بھلائی اور بہبود کے لیے لمبی تپسیا کی۔ مغربی ممالک بالخصوص امریکا میں تربیت حاصل کی کہ کس طرح ان بچوں کے لیے خصوصی ماحول، تعلیم اور تربیت کا نظام وضع کرنا ہے۔ اس نظام کی روح یہ تھی کہ کس طرح ایسے بچوں سے نہ زبردستی کچھ کرایا جائے گا نہ ہی انہیں بچوں کی بھیڑ میں رکھا جائے گا کیونکہ یہ بچے عموماً DYSLEXIA کا شکار ہوتے ہیں۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اولمپکس میلہ لوٹنے والے امریکی، چینی اور برطانوی کھلاڑی کیا کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں؟

•

ہمارے کھلاڑیوں کی شرمناک کارکردگی نے پوری قوم کے سر جھکا دیے

کلیم اللہ فاروقی

خیر سے بدھو لوٹ کر گھر آ چکے ہیں۔ ان کو اولمپکس میں بھجوانے والے، ان کی تربیت کا بندوبست کرنے والے، ان کی سرپرستی کرنے والے، قومی اسپورٹس ادارے، اولمپکس ایسوسی ایشن، پاکستان اسپورٹس بورڈ، نیشنل اسپورٹس ٹریننگ اینڈ کوچنگ سنٹر، صوبائی ڈائریکٹوریٹس، وفاقی اور صوبائی وزرائے کھیل، مختلف کھیلوں کی فیڈریشنیں اوران کی ذیلی ایسوسی ایشنیں، یہ سب کے سب ادارے عالمی سطح پر ہماری جگ ہنسائی اور تذلیل کا باعث بنے ہیں۔ ان اداروں میں اکثر وزراء، ریٹائرڈ یا ان سروس فوجی و سول افسران اور سیاستدان وغیرہ براجمان ہیں۔ اکثر حضرات نے دوسرے لیول پر اپنے جونیئر افسران، یا ناڈوں کو منتخب کرا کے بٹھا رکھا ہے۔ پہلے سے طے ہوتا ہے کہ کس ملک کے بیرونی دورے پر کون سا بندہ بطور مینیجر، کوچ یا کسی اور حیثیت میں جائے گا۔ چند سال قبل ہمارے اتھلیٹکس فیڈریشن کے انتہائی نااہل جنرل سیکرٹری کا بیان آیا تھا کہ ہمارے سپر فٹ اتھلیٹس ایشیائی گیمز میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے اور ہمارے سب اتھلیٹس خالی ہاتھ لوٹ آئے تھے۔

پاکستان جتنی آبادی والا کوئی دوسرا ملک نہیں جس نے کوئی تمغا نہیں جیتا۔ کیا اتنی شرمناک کارکردگی پر ہماری کسی بھی اسپورٹس تنظیم کے کسی ذمہ دار عہدیدار نے استعفا دیا یا غلطی قبول کی؟

حکومت اب کیا کرے گی! قومی اسمبلی میں جب کبھی اس خراب کارکردگی کا ذکر ہو گا، چند لوگوں کے بیانات آئیں گے، پھر قومی کمیشن بنے گا، جو کارکردگی پر اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ لیکن جب وہ رپورٹ آئے گی، تب تک ہم پاکستانی سب کچھ بھول چکے ہوں گے کہ اولمپکس میں ہم کس طرح خالی ہاتھ واپس آئے تھے۔

اولمپکس ایسوسی ایشن کے صدر کی ''کامیاب پالیسیوں'' پر، جن کی بنا پر وہ کچھ کیے بغیر ہی پچھلے کئی سال سے سب سے بڑے اور اہم قومی اسپورٹس ادارے کی سربراہی فرما رہے ہیں، تحسین کی جانی چاہیے۔

ہماری قیادت پر فائز لوگ اسی قدر غیر متوازن ہیں کہ ایک ہی میچ جیتنے پر مبارک بادیں اور انعام دے ڈالتے ہیں۔ ہارنے پر نہ کوئی احتساب نہ احساس، بس چپ سادھ لیتے ہیں۔ اولمپکس مقابلوں میں برسوں سے ہمارے کھلاڑی ایک تمغا بھی جیتنے میں ناکام رہے ہیں۔ امریکا، چین، برطانیہ پورا میلہ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ کیا وہ کسی

اور سیارے کی مخلوق ہیں۔

اولمپکس اور ایشیائی کھیلوں میں کھلاڑیوں کو بھیجتے وقت ہماری اسپورٹس فیڈریشنز کے اعلیٰ عہدیداروں کا بیان آتا ہے کہ ہم اپنے کھلاڑیوں کو تجربہ حاصل کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ بدقسمتی سے اگلے ایشیائی یا عالمی مقابلوں سے قبل یہ تجربہ کار کھلاڑی بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور نئے کھلاڑیوں کو بھیجتے وقت پھر وہی بیان دہرایا جاتا ہے۔ ایسا ہی بیان ہمارے قومی کوچز کا بھی اخبارات میں شائع ہو جاتا ہے۔ گویا کہ قوم کو پہلے ہی متوقع نتائج کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جاتا ہے کہ "ساڈے تے نہ رہنا۔"

لوگوں کو شاید پتا ہی نہیں کہ وہ جو ہمارے 'ماہرین' بین الاقوامی اسپورٹس تنظیموں کے رکن بن جاتے ہیں اس کے لیے کھیلوں میں مہارت کی نہیں "اسپورٹس سیاست" میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بین الاقوامی اسپورٹس تنظیموں میں بڑے بڑے جغادری اسپورٹس سیاستدان براجمان ہیں اور "من ترا ملا بگویم، تو مرا حاجی بگو" کے مصداق Co-existence کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ذاتی مفادات حاصل کرتے ہیں۔

دنیا بھر میں عموماً قومی یا عالمی سطح کے کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ ماہرین تعلیم جسمانی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو کھلاڑیوں کی مدد کرتے ہیں۔ کھیلوں کی ترقی کے لیے مربوط پروگرام بنایا جاتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں ایک باقاعدہ منصوبے کے مطابق کھیلوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ ٹیلنٹ ہنٹنگ ہوتی اور کھلاڑیوں کو سائنٹیفک انداز میں تربیت دی جاتی ہے۔ ان کے بار بار فزیکل فٹنس ٹسٹس ہوتے ہیں۔ جن سے ان کارکردگی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف تعلقات، سفارش، رشوت کے بل بوتے پر کوچز اور آفیشلز کا چناؤ ہوتا ہے اور انھیں قومی پیسے پر بیرون ملک بطور رشوت سیر کرائی جاتی ہے۔ بدلے میں وہ لوگ اپنے ان "گاڈ فادرز" کو کھیلوں کی تنظیموں کی سربراہی کے لیے ووٹ دیتے ہیں۔

بہت سی خانہ ساز ایسوسی ایشنیں ہیں جن کا وجود صرف کاغذ پر ہوتا ہے۔ وہ محض کاغذی کارروائی ڈال کر قومی فیڈریشنوں کی ممبر بن جاتی اور ووٹ کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ پھر اس ووٹ کی پوری پوری قیمت وصول ہوتی ہے۔

بڑے بڑے قومی اداروں کے سالانہ کھیلوں کے مقابلوں میں کرائے کے یا مفت کے کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ اور متعلقہ اداروں کے عہدیدار اخراجات کی مد میں لاکھوں روپے کھا جاتے ہیں۔ پاکستان ریلوے، واپڈا اور بعض دیگر اداروں کی طرف سے قومی کھیلوں میں نمائندگی کرنے والے عموماً ان اداروں کے باقاعدہ ملازم نہیں ہوتے۔

پاکستان میں اکثر قومی سطح کے اسپورٹس سیمینار منعقد ہوتے ہیں۔ جن میں ایسے ایسے لوگ شریک ہوتے ہیں جو کسی بھی کھیل کی ابجد سے واقف نہیں ہوتے اور ان کی بہت واہ واہ ہوتی ہے۔ راقم الحروف کا کئی ایسے ماہرین کھیل سے واسطہ پڑا ہے جو کھیلوں کی الف بے نہیں جانتے لیکن دعوے بڑے بڑے کرتے ہیں۔

چند سال قبل اولمپک ایسوسی ایشن کے سیکرٹری نے ایک تیراک کو امریکا سے بلوا کر اولمپکس میں نمائندگی کے لیے بھیجا۔ اور یہ تیراک کل ۵۵ تیراکوں میں ۵۳ ویں نمبر پر آئے تھے۔ ہمارے موجودہ تیراکوں اور شوٹرز کی کارکردگی سب کے سامنے ہے۔ اس بار بھی ہمارے اکثر کھلاڑی آخری نمبر پر آنے میں کامیاب رہے ہیں۔

جن ایتھلیٹس کو اولمپکس میں شرکت کے لیے بھیجا گیا ان کی کارکردگی کے متعلق مختلف اخبارات میں مختلف باتیں آتی رہیں۔ ان کے مطابق لیاقت کا ۱۰۰ میٹرز کا وقت ۱۰ء۲ تھا جبکہ اولمپکس میں موصوف یہ فاصلہ ۱۰ء۹ میں طے کر سکے۔ اسی طرح رابعہ کا وقت بھی ۲:۱۰:۶۵ منٹ بتایا گیا تھا جب کہ موصوفہ ۸۰۰ میٹرز کا فاصلہ ۲:۱۷.۶ منٹ میں طے کر سکیں۔ خدا جانے سچ کیا ہے۔ لیکن اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ماضی میں منصفین، خصوصاً

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اتھلیٹکس میں محض اس لیے کھلاڑیوں کی کارکردگی بہتر بتاتے تھے کہ کوئی نہ کوئی کھلاڑی اولمپکس کے لیے کوالیفائی کر لے تاکہ کسی نہ کسی آفیشل کا مفتا لگ جائے اور حکومتی خرچ پر اولمپکس بھی دیکھ لے اور سیر سپاٹا بھی کر لے۔ اس کے بدلے میں وہ اپنے مہربانوں کا ہمیشہ کے لیے ممنون ہوتا اور ووٹ پکا ہو جاتا ہے۔

کئی سال قبل اتھلیٹکس کے ۳۰ کوچز کو طویل عرصے کے لیے جرمنی بھیجا گیا۔ انھوں نے واپس آکر کون سا تیر مار لیا۔ اس وقت کے سیکرٹری اتھلیٹکس نے سرِ عام کہا تھا کہ ہم نے تو صرف اس لیے ان کو بھیجا تھا کہ ذرا انگریزی بول لیتے تھے۔ یہ ہے سلیکشن کا معیار۔ ویسے ہمیں ان کوچ صاحبان کی انگریزی دانی کا بھی اندازہ ہے۔ میں نے بہت سے بیرونی ممالک کے کوچز دیکھے ہیں۔ انھیں سرخاب کے پر نہیں لگے ہوتے۔ لیکن ان ممالک میں نظام ہے۔ لوگ سنجیدہ، محب وطن، اور محنتی ہیں۔ ان کی اپروچ سائنٹیفک ہے۔ وہ لانگ ٹرم پروگرام بناتے ہیں جبکہ ہم وقتی پروگرام بنا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ فرق ہے ہم میں اور اُن میں، ورنہ ہمارے ہاں بھی ٹیلنٹ ہے۔

ہمارے ہاں ایک اور بُری روایت ہے کہ اَن پڑھ قومی چیمپئنز کو کوچ بنا دیا جاتا ہے جبکہ کسی بھی کھیل کے کوچ کے لیے فی زمانہ پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ نئی سے نئی تحقیقات سے استفادے کے لیے تعلیم لازمی عنصر ہے۔ اور کھیل نے سائنس کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ جسے پڑھنا ہی نہیں آتا وہ جدید تکنیک سے کیسے آگاہی حاصل کرے گا۔

لندن اولمپکس میں ایک واحد امید ہاکی ٹیم سے تھی کہ وہ شاید وکٹری اسٹینڈ پر پہنچ جائے لیکن وہ بھی آسٹریلیا سے ۷ گول کھا کر بے نیل مرام واپس آ گئی۔ ہمارے ہاکی کے کھلاڑی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی طور پر یورپی کھلاڑیوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ ان کا فٹنس کا معیار بھی کم ہے۔ ان کے جسموں میں لچک کی کمی، عضلات کمزور، رفتار بھی کم ہے۔ جدید تکنیک سے آگاہی نہیں۔ ہم سیدھی سیدھی پنالٹی پریکٹس کرتے جبکہ یورپی کھلاڑی دکھاتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں۔ ان کے کھیل کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ عام طور پر وہ کھلاڑی جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ گیند گول میں پھینکے گا، وہ عین وقت پر دفاعی کھلاڑیوں کی طرف پیٹھ کر کے انھیں روک لیتا ہے اور گول میں گیند کوئی دوسرا کھلاڑی پھینکتا ہے۔

دنیا بھر میں جمناسٹک کو کھیلوں کی ماں سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے کھلاڑیوں کو جمناسٹک سے کوئی تعلق نہیں۔ تعلیمی اداروں میں بچوں کے لیے جمناسٹک سیکھنا لازمی قرار دیا جائے۔ اس سے جسم پر کنٹرول، لچک اور پھرتی پیدا ہو۔

کھلاڑیوں کو نفسیاتی طور پر مضبوط بنانے کیلئے تربیت اہم ہے۔ دنیا بھر میں کھلاڑیوں کے ساتھ ماہر ہپناٹسٹ منسلک ہیں۔ ہمارے ہاں کھلاڑیوں کو نہ تو لیکچرز دلوائے جاتے ہیں نہ ہی ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ چودھری اختر رسول جو خود جسمانی طور پر فٹ نہیں وہ ہمارے چیف کوچ ہیں۔ کیا یہ بوالعجبی ہے!

ہمیں ٹیم گیمز کے بجائے انفرادی کھیلوں پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ صرف کرکٹ ہی کھیل نہیں۔ تیر اندازی، تلوار بازی، کشتی رانی، سائیکلنگ، کشتی، جوڈو اور دوسرے کھیلوں پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

ہر تعلیمی ادارے کو کھیل کود کی طرف خصوصی توجہ دینے اور ہر سطح پر مقابلوں میں حصہ لینے کا پابند کیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔ کھیل کے میدان اور پبلک جمنازیم تعمیر کیے جائیں جہاں لوگ ورزش کر سکیں۔ اس سے جہاں قومی معیار صحت بلند ہوگا، وہاں اچھے کھلاڑی پیدا ہوں گے۔ ہاں کمپی ٹیشن کا کلچر اپنانا چاہیے۔ یہ نسخہ ضرور آزما کر دیکھیے۔ امید ہے کہ ذمہ دار حضرات اپنے رویوں میں مثبت تبدیلیاں لائیں گے۔

صرف ہاکی پریکٹس کر کے اولمپک میں جانے سے کبھی سرخروئی نہیں ملے گی۔ انفرادی کھیلوں کو فوکس کر کے جو منصوبہ بندی کی جائے گی، وہی فائدہ پہنچائے گی۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ریٹائرمنٹ کی بابونگری

ریٹائرمنٹ کی زندگی باعزت طریقے سے گزارنے میں کئی مشکل مقام آتے ہیں

نہ سیکھنے والوں کے لیے یہ دلچسپ مضمون بڑا کارگر ہوگا

حسین احمد شیرازی

ریٹائرمنٹ ایک نئی دنیا کے سفر کی تیاری کا دوسرا نام ہے اور یہ فلسفہ صرف پاکستان تک محدود نہیں بلکہ عالمی سچائی کا حامل ہے۔ امریکی صدر کیلون کولج اپنی صدارت کے اختتام پر ''ہیپی ماؤتھ'' منتقل ہو گئے جہاں وہ اکثر اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھتے تھے۔ ایک اخباری نمائندہ ان سے ملنے گیا تو اس نے تعریف کرتے ہوئے کہا ''جناب عوام کو اب بھی آپ سے بڑی عقیدت ہے۔ کتنے لوگ صرف آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ دیکھیے تو سہی اس وقت گھر کے سامنے کتنی کاریں کھڑی ہیں۔'' صدر کولج نے جواب دیا ''اتنی نہیں جتنی کل تھیں۔ گزشتہ روز اس وقت ایک سو تریسٹھ تھیں!''

کہاں گئے میری مصروف ساعتوں کے رفیق
پکارتی ہیں انھیں اب فراغتیں میری

اسی طرح صدر آئزن ہاور سے کسی نے پوچھا کہ وائٹ ہاؤس چھوڑنے کے بعد انھوں نے زندگی میں کیا تبدیلی محسوس کی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ اگرچہ اب میں پہلے سے بہتر گولف کھیلتا ہوں لیکن پھر بھی آج کل بہت زیادہ لوگوں سے ہارنے لگا ہوں۔ یاد آیا کہ ہمارے ایک ساتھی ٹینس کھیلتے ہوئے جب بھی اپنے باس سے کوئی پوائنٹ جیتتے تھے تو ''سوری سر'' ضرور کہتے تھے۔

اس نئی زندگی کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ بڑے صاحب کو اپنا بریف کیس اٹھا کر گاڑی میں لے جانے اور واپس لانے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی چنانچہ اگر اب ڈرائیور کی سہولت میسر نہ ہو تو یہ اپنا بریف کیس گاڑی میں بھول جاتے ہیں اور پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کی صورت میں اپنی عینک، بیگ اور موبائل فون اکثر گم کرتے رہتے ہیں بلکہ کئی احباب کو تو ہفتہ کی صبح اخبار پڑھ کر جب یہ پتا

بعض لوگ ان کی ریٹائرمنٹ کو جتلا کر یہ کہتے ہوئے ان پر احسان فرماتے ہیں کہ اگرچہ لوگ ریٹائرڈ بابو کو نظر انداز کرتے ہیں لیکن ہم اب بھی آپ کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں...... اس پر ریٹائرڈ بابو کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بھی کوئی یتیم، مسکین، بیوہ اور مستحق زکوٰۃ و خیرات قسم کی چیز ہے جس کے بارے میں تمام مذاہب حتیٰ کہ یہودیت میں بھی حسنِ سلوک کا حکم آیا ہوا ہے۔

چلتا ہے کہ آج ہفتہ ہے، تو انھیں افسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ کل جمعہ کی نماز نہیں پڑھی گئی۔

ہمارا دوست جلیس ریٹائر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس طرح لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ تو سٹھیا گیا ہے اور یہ ہندسہ اس کی صنف نازک سے تعلق رکھنے والی مداحین کے گروہ میں بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب!

ریٹائرمنٹ کے بعد القاب میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ ہمارے دوست صولت سناتے ہیں کہ ان کے ایک شناسا پہلے انھیں ''پیارے صولت بھائی''، پھر تبادلے کے بعد ''صولت بھائی''، ملازمت میں پھڈا پڑنے پر ''صولت صاحب'' اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد صرف ''صولت'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ انھیں پورا یقین ہے کہ ابتدا میں تو ''پیارے'' کے پانچوں حروف پر الگ الگ زور دیا جاتا تھا۔

اس طرح کا ایک تجربہ ہماری ذات پر بھی گزرا ہے۔ کوئی بیس سال پہلے ہمارے ایک کاروباری دوست اعلان کرتے تھے کہ وفاقی حکومت میں ہم ان کے واحد دوست ہیں اور گفتگو کے دوران ہمارے بارے میں اچھے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ پھر ان کا کسی مالیاتی ادارے کی ملکیت کا خوفناک جھگڑا شروع ہو گیا اور وہ گھنٹوں ہمارے سامنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہتے تھے بلکہ ایک مرحلہ پر تو انھوں نے یہ وعدہ بھی لیا کہ اگر ان کو کچھ ہو گیا تو ہم ان کے اہلِ خانہ کا ضرور خیال رکھیں گے۔ وفاقی حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہمارے ایک دفتری دوست نے ہمیں کئی بار منع کیا کہ یہ شخص حکومت کی اچھی کتابوں میں نہیں ہے، اس سے مت ملا کریں۔ ہم نے اپنے دوست کو جواب دیا کہ پاکستان میں حکومت دو ڈھائی برس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور تم سے ہماری دوستی کوئی بیس برس پرانی ہے، پھر تمھارے اصول کے مطابق تو ہمارے تعلقات چھ دفعہ ختم ہو گئے ہوتے۔ انھوں نے ہماری دلیل سے اتفاق تو کیا لیکن میکاولی کے کامیابی کے اصولوں پر تفصیلی لیکچر بھی دے دیا کہ بالآخر وہ ہمارے گرائیں تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد ہمیں مشورہ دینے والے دوست ابتلا کا شکار ہو کر پاکستان سے مفرور ہو گئے اور ایک دن ان کا فون ہم نے اس طرح سنا ''شیرازی بھائی، پلیز فون بند نہ کرنا۔ میں...... بول رہا ہوں'' خدا گواہ ہے کہ ہم نے ان کا فون بھی سنا، بہت سی تسلی تشفی دی اور ان کے ارشاد کی تعمیل بھی کی۔ ویسے کئی سال بعد ہمارے یہ دفتری دوست پھر پاکستان کو چلانے والے اہم افراد میں شامل تھے!...... اس دوران ہمارے کاروباری دوست بھی پاکستان سے چلے گئے لیکن جب لوٹے تو انھوں نے ہماری ملازمت کے جھگڑوں کے بعد ''واحد دوست'' کو ''ایک دوست'' میں تبدیل کر دیا کہ ان کا اصل منشا تو ہمارا عہدہ تھا، اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد...

حسابِ دوستاں دل ہی میں رہنے دو تو بہتر ہے
زباں پر آ گیا جس دم تو ہنگامہ بہت ہو گا

ایک دفعہ ہم اپنے دوست صولت سے ملنے گئے تو بڑے دل گرفتہ بیٹھے تھے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے ''میری

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ایک بہن نے کئی ماہ سے فون نہیں کیا تھا، آج اس سے اس بابت گلہ کیا تو بولی کہ اب آپ ریٹائر ہو گئے ہیں تو ہم سوچتے ہیں کہ زندگی کے اس مرحلے پر آپ کو آرام اور سکون ملنا چاہیے، اس لیے ہم تو آپ کی بھلائی کے لیے آپ کی راحت اور سکھ میں خلل انداز نہیں ہوتے!"

بہت سے لوگ کارل مارکس سے متفق ہیں کہ انسانی رشتے ضرورتوں، احتیاجوں اور مفادات سے ہی وابستہ ہیں اور سب سے اچھا تعلق وہ ہے جو باہمی مفاد پر استوار ہو چنانچہ جیسے ہی کوئی انسان مکمل غیر مفید ہو جائے یعنی سانس لینا بند کر دے تو اسے مٹی میں دبا دیا جاتا ہے یا آگ میں جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ اس زندگی میں آپ کے لیے لوگوں کی چاہت خدا کا سب سے بڑا انعام ہے۔ تقاضائے بشریت کے تحت کچھ انسانوں کی نفرت بھی ناگزیر ہونے کے سبب قابل برداشت ہے لیکن اپنے جاننے والوں کی اجنبیت، نفرت سے بہت زیادہ تلخ ہے کیونکہ اجنبیت میں آپ کی ذات کا انکار ہے جسے آپ موت کی ایک قسم بھی کہہ سکتے ہیں۔ غیر متعلق ہونا اور نظر انداز کیا جانا ایک ایسا محلول ہے جس میں بوڑھے بابو تیزی سے گھل گھل کر اپنا وجود ختم کر لیتے ہیں۔ ایک اور نقطہ نظر سے دیکھیے تو پہلے لوگ ان کو فالتو سمجھنا شروع کر دیتے ہیں پھر آہستہ آہستہ وہ خود بھی اپنے آپ کو فالتو سمجھ کر قطرہ قطرہ پگھلتے اور ریزہ ریزہ بکھرتے جاتے ہیں۔ نیند کے لیے کھائی جانے والی گولی ایک دن پستول کی گولی کا کام دکھا جاتی ہے۔ اس طریق عمل کا انجام اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ یہ قیام نہیں بلکہ کوچ کا مرحلہ ہے۔ ایک منظر ملاحظہ کریں۔

الف: "آپ کل کیا کر رہے ہیں؟"

ب (ریٹائرڈ بابو): "فارغ ہوں۔"

الف: "پرسوں؟"

ب: "فارغ۔"

الف: "تین دن بعد؟"

ب: "کوئی خاص کام نہیں۔"

الف: "اتوار کے دن؟"

ب: "اس دن میں شاید اپنے ایک دوست سے ملنے شہر کے دوسرے کونے جاؤں۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

الف: "دراصل میں نے آپ کو اتوار کو لنچ پر بلانا تھا لیکن آپ مصروف ہیں تو میری کم نصیبی۔"

ب (خود کلامی): "جس لہجے اور انداز سے آپ نے یہ مکالمہ ادا کیا ہے، یہ آپ کی کم نصیبی نہیں بلکہ خوش نصیبی ہے کیونکہ آپ چاہتے ہی یہی تھے!"

کبھی سوچا نہ تھا کہ اس طرح دنیا بدلتی ہے
جو پہلے ڈھونڈتے پھرتے تھے اب وہ چھپتے پھرتے ہیں

☆☆

ایک دن ہم ایک بڑے بابو کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ ہمارا پرانا دوست یوسف کیک کھا رہا ہے۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ چلیں...... ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں...... کہ ریٹائرڈ لوگوں کو بھی کیک کھلایا جاتا ہے۔ ہم نے بڑے بابو سے کیک کی وجہ تسمیہ پوچھی تو بولے کہ یہ یوسف صاحب ہی لائے ہیں! پنجابی محاورہ یاد آ گیا۔ "آپے بالو تے آپے سیکو" (خود اپنی ذات جلاؤ اور اپنے ہاتھ سینکو۔) بعد ازاں یوسف سے پوچھا تو اس کے جواب کی تفصیل اس شعر سے عیاں ہوتی ہے۔

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ آئے موت تو بوڑھے بھی کیا کریں

ریٹائرڈ بابو اگر کسی بڑے بابو کو کھانے پر بلائے تو دیگر مدعوئین کی مکمل تفصیلات پوچھ کر معذرت کر دی جاتی ہے کہ شیر کی کسی ایسی دعوت میں شرکت جہاں گیدڑ، لومڑی بھی مدعو ہوں، اس کے شایان شان نہیں۔

ہم اسلام آباد کلب میں اپنے دوست کے عشائیے پر مدعو تھے۔ ان کے محکمے کے ریٹائرڈ سربراہ بھی ستون کے پیچھے اکیلے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ ہمارے دوست ان کو سلام کرنے گئے تو انھوں نے فوراً

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

نماز سے یاد آیا کہ ہم نے صدر ضیاء کے دفتر میں لوگوں کو غسل خانے سے خشک ہاتھوں کے ساتھ باہر آ کر ان کے ساتھ نماز میں شمولیت کرتے دیکھا تھا اور ایک بے تکلف دوست فیت یہ بتاتے تھے ''ہر رکعت نماز جبر، بحکم جنرل ضیاء کے، منہ طرف جی ایچ کیو شریف کے، مارشل لا اکبر!'' اس ضمن میں ہمارے پولیس سروس کے ایک دوست کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ وہ وزیراعلیٰ کے ساتھ ڈیوٹی کے دوران اکثر نماز جنازہ میں شمولیت کے لیے وضو کرتے ہوئے لمبے بوٹ، جرابیں اتارنے اور پہننے کے عمل سے کافی پریشان تھے تو انھیں ایک تجربہ کار بوڑھے ماتحت نے مشورہ دیا ''سر! یہ سرکاری نماز جنازہ ہے، اس میں وضو نہیں ہوتا۔''

ہمارے دوست کے لیے بھی کھانے کا آرڈر دے دیا لیکن جتنی دیر میں کھانا آیا، ہمارے دوست واپس آ چکے تھے۔ ریٹائرڈ بابو نے افراتفری میں کھانا ختم کیا اور دوسری پلیٹوں میں پڑی اشیائے خورد و نوش جوں کی توں چھوڑ کر چلے گئے۔

روندے ہے نقش پا کی طرح، خلق یاں مجھے
اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

ہمارے ایک دوست اپنے دفتر کے بعض ساتھیوں کے اس رویے کے بارے میں بہت پریشان تھے کہ یہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد بھی دفتر میں خواہ مخواہ کیوں بیٹھے رہتے ہیں۔ بہت دنوں بعد انھیں پتا چلا کہ وہ اپنے باس کے پیچھے نماز میں حاضری لگوانے کے لیے یہ کشٹ اٹھاتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ چھٹی کے بعد بھی جس باس کی نماز میں شمولیت کے لیے لوگ گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے، جب وہ اس دفتر سے فارغ ہوا تو وہ پورچ میں اکیلا ہی کھڑا تھا، کوئی خدا حافظ کہنے والا بھی نہ تھا۔ اتنی بلندی سے گرنا خاصا مہلک ہوتا ہے چنانچہ دفتر چھوڑنے کے بعد یہ باس گھر میں کئی کئی گھنٹے روتا رہتا تھا اور پھر اس کو ماہر نفسیات سے علاج کروانا پڑا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار،

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

ریٹائرڈ بابو شادی بیاہ اور دوسری دعوتوں میں کم نظر آتے ہیں کیونکہ ان میں شمولیت کے لیے مدعو کیا جانا ضروری ہے۔ دنیا کا اصول ہے کہ مہمان اور دسترخوان میں مطابقت کا پلڑا ذاتی مفاد کی طرف جھکا ہوا ہونا چاہیے کیونکہ بیشتر مدعوین دعوت میں کھانے کے لیے نہیں بلکہ دسترخوان پر سجانے کے لیے بلائے جاتے ہیں اور پھر جیسے جیسے کسی شخص کی اہمیت گھٹتی جاتی ہے، وہ یا تو بلایا نہیں جاتا یا کسی کونے کھدرے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہاں ریٹائرڈ بابو وفات، سوگ، قل، چالیسواں، برسی قبیل کی تقریبات میں ضرور نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے لیے بذریعہ اخباری اشتہار شرکت کی خصوصی درخواست کی گئی ہوتی ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

ایک ریٹائرڈ بابو سے ہم نے سنا کہ وقت کتنا بدل گیا ہے، مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے اب بیرون ملک سے آنے والے لوگ تحائف لانے کی استطاعت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس پر ہمیں اس خاتون کا قصہ یاد آ گیا جو تیس برس بعد اپنے پرانے محلے میں گئی تو گلی کے لڑکوں کا رویہ دیکھ کر بولی: اس گلی کے لڑکے تو بہت شریف ہو گئے ہیں، تیس سال پہلے تو ان میں سے کچھ ہمیں دیکھ کر سیٹیاں بجاتے اور گھورتے تھے!..... ہمارے دوست اعظم کے مطابق ریٹائرڈ بابو بوڑھی فلمی ہیروئن کی طرح ہوتا ہے جسے جوانی میں سبزی والا پوری دوکان پیش کرنے کے لیے تیار

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ہوتا تھا لیکن بڑھاپے میں اس سے دھیلے کے پیسے بھی الگ سے مانگتا ہے۔ اعظم کو اس کا ایک دوست جن مانگے، رنگ برنگے وٹامن لا کر دیتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بڑے اصرار کے بعد اس نے وٹامن کا کیٹیلاگ لا دیا کہ خود ہی انتخاب کر کے منگوا لیں اور اگر سودمند پائیں تو مجھے بھی بھجوا دیں!

اس مرحلے پر ریٹائرڈ بابو اپنے پرانے ماتحتوں کو بھی نہیں پہچان سکتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسے نہیں پہچانتے۔ ملازمت کے دوران میں ''والد'' کا درجہ دینے والوں کی اجنبیت کی وجہ یہ ہے کہ اب انھوں نے نئے ''حاضر سروس والد'' ڈھونڈ لیے ہوتے ہیں۔

بعض بابو ریٹائرمنٹ کے بعد کسی سیٹھ کی نوکری کر بیٹھتے ہیں جو اپنی مٹی خراب کرنے کے مترادف ہے۔ اس نوع کے ہمارے ایک دوست نے اپنی ملازمت کا ذکر کیے بغیر ہمیں کوئی کام بتایا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے سیٹھ بھی ہمارے دفتر میں تھے اور ہمارے دوست کو ملازمت دینے کا فخریہ اظہار کر رہے تھے۔ ہم نے اس آجر اور اجیر کے رشتے سے لاعلمی کا اظہار کیا تو سیٹھ بولا کہ ابھی تک افسری کا خناس اس کے دماغ سے نہیں نکلا، ایک ٹھیکیدار کا ملازم بتاتے ہوئے اس کی شان گھٹتی ہے۔ پھر سیٹھ نے اسی وقت ان کو فون کیا اور تمام کام چھوڑ کر پانچ منٹ میں ہمارے دفتر پہنچنے کا حکم دے کر فون بند کر دیا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

انسان کی ذات میں ایک جسمانی وجود اور دوسرا اس کا ہمزاد (جسے روح بھی کہہ سکتے ہیں) ہوتا ہے۔ یہ دونوں آپس میں گفتگو بھی کرتے ہیں، جسے ہم خود کلامی کہتے ہیں۔ ان میں جنگ بھی ہو سکتی ہے اور ایک دوسرے کو قتل کر دے تو دنیا اسے خودکشی کا نام دیتی ہے۔ دنیا سے کٹ کر ریٹائرڈ بابو خود اپنے آپ سے بھی دور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب وہ ''موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہوگا'' قبیل کی کتابیں پڑھتے، وحدت کا فلسفہ سمجھتے، میر تقی میر کے اشعار سناتے اور کبھی راگ دیپک کا الاپ کرتے پائے جاتے ہیں۔ نئے دوست بنتے نہیں اور پرانے آشنا ایک ایک کر کے بچھڑتے جاتے ہیں ؂

نہ اجنبی ہے کوئی اور نہ آشنا کوئی
اکیلے پن کی بھی ہوتی ہے انتہا کوئی

دنیا والوں کے دور ہٹنے کے بعد ماضی اور بچھڑنے والے بہت یاد آنے لگتے ہیں ؂

میرے قابو میں نہ پہروں دل ناشاد آیا
وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا

پھر کسی دن اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا ہے کہ کواڑ کھولو، دیکھو! تمھارے بچھڑنے والے تمھیں ملنے آئے ہیں...... پھر جیسے ہوا کے مدہم جھونکے سے کھڑکی خود بخود وا ہو جاتی ہے......اب وہ جہانوں کی سرحد پر کھڑا بابو عالمِ استعجاب میں مبہوت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ایک ریٹائرڈ بابو نے کسی پرانے شناسا کو ائیر کنڈیشنر کی خرید کا عندیہ دیا اور رعایتی قیمت بھی پوچھی تو ان صاحب نے ترت جواب دیا کہ بھائی جان میں ادھر کوئی دوکان کھول کر نہیں بیٹھا، فون نمبر دے دیں، میرے دفتر کا متعلقہ آدمی آپ کو ریٹ بتا دے گا۔ اب ان ریٹائرڈ بابو کو اسی شخص کا وہ واقعہ یاد آ رہا تھا جب انہوں نے اُس کی موجودگی میں دفتر والوں کو ائیر کنڈیشنر کی جالی تبدیل کرنے کا کہا تو شناسا بولا ''سر جالی مت بدلیں، بھائی کی فیکٹری ہو اور آپ کے دفتر میں پرانی ٹیکنالوجی کا ائیر کنڈیشنر چل رہا ہو، میرے لیے بڑی ندامت کی بات ہے! ابھی آدھ گھنٹہ میں نیا ائیر کنڈیشنر پہنچ جائے گا۔''

ایک بڑے بابو کی والدہ کی وفات پر ۵۰۰ سوگوار آئے جبکہ چند ہفتوں بعد ان کی اپنی رسمِ قل میں صرف ۴۰ افراد شامل تھے۔ ویسے کسی حاضر سروس بابو کی وفات پر بھی جو چند لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ان کا سب سے اہم زیرِبحث موضوع مرحوم کی وفات سے پیدا ہونے والی اسامی پر تعیناتی اور مرحوم کے سرکاری گھر کی الاٹمنٹ ہوتا ہے۔

ہے...... لیکن یہ بچھڑنے والے ملتے نہیں، لینے آئے ہوتے ہیں......! پھر کھلی کھڑکی سے پنچھی اُڑ جاتا ہے، پنجرہ خالی رہ جاتا ہے، ماضی بعید میں رہنے والا شخص ماضی قریب کا حصہ بن جاتا ہے اور ایک بند کی ہوئی فائل تلف کیے جانے والے ریکارڈ کے ڈھیر میں پھینک دی جاتی ہے۔

وہ گل رخ باغ میں جن کے کبھی بلبل چہکتے تھے
اب ان کی قبر کا سبزہ گدھے اور بیل چرتے ہیں

کُل جہاں معشوق جو تھے، سونے ہیں پڑے مرقد ان کے
یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں

نظیر اکبر آبادی نے لکھا ہے۔

آگے تو پری زاد یہ کہتے تھے ہمیں گھر
آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آ کے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر
جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ان اشعار میں ''بڑھاپے'' کو ''ریٹائرمنٹ'' اور ''عاشق'' کو ''سرکاری ملازم'' سے تبدیل کر لیں تو مضمون روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

پٹواری کی بھینس مرگئی تو سارا گاؤں تعزیت کے لیے آیا۔ پٹواری خود مر گیا تو تعزیت کے لیے صرف دس لوگ آئے اور وہ بھی اس لیے آئے کہ ان کے کاغذات پٹواری کے پاس پڑے تھے۔

سیانے لوگ اپنی ذات کو ریٹائرمنٹ کی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اپنی آخری تعیناتی کے بہت سے ملاقاتی کارڈ چھپوا کر انھیں کئی سال تک استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنی ریٹائرمنٹ کلب میں ہی گھومتے پھرتے ہیں اور سفر کی پابندیوں سے اس آزادی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ زندگی کی سرگرمیوں میں مشغول رہنے کے لیے کوئی واجبی سی مصروفیت والا کام شروع کر دیتے ہیں کہ اس مرحلے پر دنیا سے بالکل کٹ جانا بھی مناسب نہیں۔ ہمارے ایک ایسے دوست نے ریٹائرمنٹ کے بعد گھر میں ہی ایک کمرے میں بڑی میز، کرسیاں، فائلیں رکھنے والے ریک خرید کر سجا لیے۔ میز کے ساتھ گھنٹی کا بٹن لگایا اور ملازم کو ہدایت کی کہ گھنٹی کی آواز سن کر فوراً حاضر ہو۔ پھر انھوں نے بجلی، فون، پانی، سوئی گیس کے بل، گاڑی کا ٹوکن، انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، جائیداد کے کاغذات، بینک اکاؤنٹ، کرایہ نامہ، علاج کی تفصیلات کی فائلیں بنائیں۔ فائل رجسٹر کھول کر ان فائلوں کو نمبر لگائے۔ پرانے کاغذات کو استری کی مدد سے سیدھا کر کے رکھا اور پھر نوٹ شیٹ پر ان بلوں سے متعلق کارروائی کا اندراج شروع کر دیا۔ ان کی کارکردگی سے متاثر ہو کر کئی دوسرے افراد نے بھی اس طرزِ عمل کو اپنایا بلکہ ایک صاحب نے تو کرایہ پر جگہ لے کر وہاں یہ کام شروع کر دیا کہ گھر میں دفتر کا صحیح ماحول بن ہی نہیں سکتا۔ باعزت ریٹائرڈ زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ بن بلائے اپنے پرانے دفتروں میں کبھی نہ جائیں خواہ وقت کاٹنے کے لیے آپ کو اپنا اخبار ''فلاں فلاں نے فلاں پریس سے چھپوا کر فلاں جگہ سے شائع کیا ہے'' تک پڑھنا پڑے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

مستقبل دِکھانے والی 10 فلمیں

ان انگریزی فلموں کا دلچسپ تذکرہ جن میں پیش کردہ خیالات نے مستقبل میں حقیقت کا روپ دھار لیا

شہزاد حسین علوی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وہ دیکھیے، نیویارک کی سڑکوں پر ایک دیوہیکل ڈائنوسار رواں دواں ہے۔ اس کی راہ میں آنے والی ہر چھوٹی بڑی شے تباہ ہو رہی ہے۔ ارے وہ حیوان تو باتیں بھی کر رہا ہے۔ پریشان مت ہوں، یہ ایک فلم کا سین ہے اور ہالی وڈ والے اس قسم کی فلمیں عام بناتے ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ بچوں اور بڑوں میں وہ فلمیں زیادہ مقبول ہوتی ہیں جو انھیں تصور ہی تصور میں حقیقت سے دور پرستانوں اور سرسبز میدانوں میں لے جائیں۔ ان کے پلاٹ عقل سے ماورا ہوں اور وہ تمام سائنسی اصول و قوانین جھٹلا کر رکھ دیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات کوئی فلم ایسی چیز دکھاتی ہے جو مستقبل میں واقعی تخلیق ہو جاتی ہے۔ گویا فلم جو منظر دکھائے، وہ کئی برس بعد آنے والے جدید دور کا عکس بن جاتا ہے۔ فلموں میں دکھائی جانے والی اشیا یا تصورات عموماً ٹیکنالوجی، سیاست، سائنس اور روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ذیل میں ایسی دس ہالی وڈ کی فلموں کا تذکرہ پیش ہے جن میں ایسے تصورات یا اشیا دکھائی گئیں جنھوں نے مستقبل میں حقیقت کا چولا پہن لیا۔

فرینکنسٹائن (۱۹۳۱ء)

1 سائنس دانوں نے اب تک ''آب حیات'' دریافت نہیں کیا اور نہ ہی وہ کسی مردے کو زندہ کر سکے۔ یہی مشہور فلم، فرینکنسٹائن (Frankenstein) کا موضوع ہے۔ یہ فلم اسی نام کے ایک ناول پر مبنی ہے۔

فلم کا ہیرو ایک انسانی بلا ہے جسے ایک سائنس دان مختلف انسانوں کے جسمانی اعضا ملا کر تیار کرتا ہے۔ اسی تصور کے بطن سے اعضا کا عمل منتقلی (Organ Transplant) پھوٹا اور عام ہوا۔ آج دنیا کے تمام ہسپتالوں میں اعضا کی منتقلی کے ہزارہا آپریشن روزانہ انجام پاتے ہیں۔

حقیقتاً سائنس و ٹیکنالوجی محض عمل منتقلی سے کہیں آگے بڑھ چکی۔ اسی لیے ماہرین مصنوعی اعضا تخلیق کر کے ہزاروں انسانوں کو نئی زندگی بخش رہے ہیں۔ اس شعبے میں تحقیق کرنے والا ایک اہم امریکی ادارہ ''میکگوان انسٹی ٹیوٹ فار ری جینریٹیو میڈیسن سنٹر'' ہے۔

سنٹر میں ماہرین انسانی اعضا کے نمونوں اور ساق (Stem) خلیوں سے مکمل طور پر کام کرنے والے جسمانی عضو تخلیق کر رہے ہیں۔ اب تک وہ لیبارٹری میں انسانی خلیوں کی مدد سے نرخرہ، دل کی شریانیں، جگر اور دیگر اعضا بنا چکے۔ یہ امر دنیائے طب میں انقلاب لے آیا ہے۔

اب سنٹر کے ماہرین نے ۳۵ ملین ڈالر (تقریباً تین ارب روپے سے زائد) کی لاگت سے ایک نیا منصوبہ شروع کیا ہے۔ اس کے تحت وہ ایسا مصنوعی بازو بنانے کی سعی کر رہے ہیں جو حقیقی کے مانند خیال کی طاقت سے کام کرے گا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

فاربڈن پلینٹ (۱۹۵۶ء)

2 یہ ان اولین امریکی فلموں میں سے ایک ہے جن میں روبوٹ دکھائے گئے۔ ان روبوٹوں میں سے ایک، روبی (Robbie) نامی روبوٹ انسانوں کے مختلف کام کاج کرتا تھا۔ یہ تب بڑا انوکھا تصور تھا لیکن آج ایسے روبوٹ عام ہو چکے۔

مثلاً جاپان میں آدم نما روبوٹ، واکامارو دستیاب ہے۔ یہ روبوٹ متفرق گھریلو کام کرتا ہے.....گھر کی چوکیداری، بچوں کی دیکھ بھال، دوست بن جانا وغیرہ۔ اسی طرح ''رومبا'' نامی روبوٹ فرشوں پر جھاڑو لگاتا اور ناکی پھیرتا ہے۔ غرض فاربڈن پلینٹ (Forbidden Planet) میں دکھائے جانے والے روبوٹ نے نصف صدی بعد حقیقت کا روپ دھار لیا۔

۲۰۰۱: اے سپیس اوڈیسی (۱۹۶۸ء)

3

مشہور سائنس فکشن فلم جس کی کہانی سائنسی ادیب، آرتھر سی کلارک کی تحریر کردہ تھی۔ اس فلم میں مستند سائنسی اصول بھی برتے گئے۔ تاہم فلم کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار ہال (HAL) ۹۰۰۰ نامی سپر کمپیوٹر متعارف کرایا گیا۔ یہی سپرکمپیوٹر ایک خلائی جہاز چلاتا اور دیگر متعلقہ کام انجام دیتا ہے۔

گو سائنس دان اب تک ہال ۹۰۰۰ جیسا باشعور سپرکمپیوٹر نہیں بنا سکے، لیکن انتہائی ذہین کمپیوٹر ضرور تخلیق کرنے میں کامیاب رہے۔ مثلاً آئی بی ایم نے ''ڈیپ بلیو'' نامی سپرکمپیوٹر بنایا جس نے ۱۹۹۶ء میں شطرنج کے عالمی چیمپئن گیری کاسپروف کو کھیل میں شکست دے کر تہلکہ مچا دیا تھا۔

اسی طرح جنوری ۲۰۱۲ء میں واٹسن نامی سپرکمپیوٹر نے ذہنی آزمائش کے مشہور انگریزی پروگرام ''جیوپرڈی'' میں حصہ لیا۔ وہ یہ پروگرام جیتنے میں کامیاب رہا اور تمام ذہین و فطین انسانوں کو شکست دی۔

ادھر جاپانی گھریلو کاموں میں مدد دینے والے روبوٹ ایجاد کر رہے ہیں۔ یہ روبوٹ برتن دھوتے، مہمانوں کو پانی پیش کرتے اور کپڑے دھوتے ہیں۔ گویا کمپیوٹر ہماری طرح باشعور نہیں ہوئے لیکن وہ مختلف انداز سے انسانوں کے کام آ کر بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ویسے کمپیوٹروں کو زیادہ سے زیادہ ذہین بنانے کے سلسلے میں تحقیق جاری ہے۔

ریئل لائف (۱۹۷۹ء)

4

پاکستان تو نہیں، بھارت، امریکا اور یورپ میں آج کل ریئلٹی شوز (Reality Shows) بہت مقبول ہیں۔ ان شوز میں مختلف جوڑوں یا خاندانوں کی حقیقی روزمرہ زندگی فلما کر ٹی وی پر دکھائی جاتی ہے۔ چاہے جھگڑے ہوں یا محبت کی باتیں، ناظرین کے سامنے ان خاندانوں کی ساری زندگی عیاں ہوتی ہے۔ امریکی فلم، ریئل لائف (Real Life) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ پہلی بار اس میں ریئلٹی شو کا تصور پیش کیا گیا۔

مزاحیہ اداکار البرٹ بروکس نے فلم میں ایسا خاندان دکھایا جو نت نئے تنازعات کا شکار رہتا ہے۔ آج ریئلٹی شوز کی بنیاد یہی ہے کہ نئے تنازعات کھڑے کیے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لیں۔

سٹار ٹریک: دی موشن پکچر (۱۹۷۹ء)

5

سٹار ٹریک امریکی سائنس فکشن فلموں کا مشہور سلسلہ ہے۔ ان فلموں میں یہ دکھانے کی سعی ہوئی ہے کہ مستقبل کا انسان کیونکر زندگی بسر کرے گا؟ خاص بات یہ کہ ان فلموں میں پہلے پہل سمارٹ فون، ٹیبلٹ اور دستی کمپیوٹر دکھائے گئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سیلولر فون بھی عام نہیں ہوئے تھے۔ یوں فلم کی پیشین گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

امریکاتھون (۱۹۷۹ء)

6

یہ ایک غیر معروف مزاحیہ فلم ہے، لیکن اس میں امریکا کے معاشی مستقبل کے متعلق اچھی خاصی پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ امریکا میں قرضوں کا بحران جنم لے گا اور یہ کہ اس کے بانڈ کی درجہ بندی (ریٹنگ) کم ہو جائے گی۔ امریکا تھون (Americathon) کی دیگر پیشین گوئیاں درج ذیل ہیں:

☆ امریکا دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ جائے گا کیونکہ ڈالر کی قدر گر جائے گی۔ اس پر کئی ممالک کا قرضہ چڑھ جائے گا۔ (فی الوقت امریکا کی یہی حالت ہے)

☆ امریکا میں تیل کی پیداوار کم ہو جائے گی۔

☆ سرمایہ دارانہ پالیسیاں بنانے کے ذریعے چین عالمی معاشی قوت بن جائے گا اور سویت یونین نہیں رہے گا۔
☆ جرمنی کی ایک چھوٹی سی کمپنی، نائیک (Nike) بین الاقوامی کمپنی بن جائے گی۔

بیک ٹو دی فیوچر، حصہ دوم (۱۹۸۹ء)

7

یہ بھی سائنسی فلموں کا مقبول سلسلہ ہے۔ اس حصہ دوم میں ہیرو اڑن تختوں پر سواری کرتا ہے۔ کریڈٹ کارڈ چپوں کو انگوٹھوں میں نصب دکھایا گیا اور فیشن ایبل نوجوان اڑتی جتیں لیے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔ فلم کی کہانی ۲۰۱۵ء پر مبنی ہے اور ابھی درج بالا تینوں پیشین گوئیاں پوری نہیں ہوئیں۔

لیکن فلم میں بیان کردہ تین اور پیشین گوئیوں نے ضرور عملی جامہ پہن لیا۔ پہلی یہ کہ ریاست میامی کی بھی بیس بال ٹیم وجود میں آ گئی۔ دوم ویت نام امریکی سیاحوں کا مرغوب سیاحتی مقام بن چکا۔ سوم یہ کہ وڈیو گیمز بے تار (وائرلیس) کنٹرولر سے کھیلی جاتی ہیں۔ بلکہ اب تو مائیکروسافٹ کارپوریشن ایسی اسکرین ایجاد کر رہی ہے جن پر ہاتھوں کے اشاروں کے ذریعے کھیل کھیلے جا سکیں گے۔

ٹوٹل ریکال (۱۹۹۰ء)

8

مار دھاڑ سے بھرپور فلموں میں کام کرنے والے امریکی اداکار، آرنلڈ شوارزنیگر کی سائنس فکشن فلم جو خاصی مشہور ہوئی۔ فلم کے ایک اہم موڑ میں ہیرو مار کٹائی کا منصوبہ بناتا ہے۔ لیکن جب وہ ایک سے دوسرے سیارے تک جانے کے لیے خلائی جہاز میں سوار ہونے لگا تو اڈے پر نصب ایکس رے مشین نے اس کے کپڑوں میں چھپی گن دیکھ لی۔ چنانچہ اسے وہیں دبوچ لیا گیا۔

آج امریکا کے کئی ہوائی اڈوں میں ایکس رے مشینیں نصب ہیں اور ''مشکوک'' مسافروں کو ہر حال میں ان کے سامنے سے گزرنا پڑتا ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑبڑائیں اور غصہ دکھائیں۔

فیس آف (۱۹۹۷ء)

9

جان ٹریولٹا اور نکولاس کیج کی مشہور فلم جس کی ہدایات ہانگ کانگ کے مشہور ہدایت کار جان وو نے دیں۔ فلم میں ایک آپریشن کے ذریعے جان اور نکولاس کے چہرے بدل دیے جاتے ہیں۔ تب عجیب و غریب واقعات جنم لیتے ہیں۔

اس وقت کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ کبھی حقیقی زندگی میں چہرے کے آپریشن (Face Transplant) ہوں گے۔ ۲۰۱۰ء کے اوائل میں ایک ہسپانوی اداکارہ شوٹنگ کے دوران آگ کی لپیٹ میں آئی اور اس کا چہرہ بُری طرح متاثر ہوا۔ چنانچہ ماہ مارچ میں تیس ہسپانوی ڈاکٹروں کی ٹیم نے اداکارہ کے چہرے کا آپریشن کیا۔ یوں اس کا چہرہ خاصی حد تک ٹھیک ہو گیا۔

آج امریکا اور یورپ میں طبی ماہرین چہرے کے آپریشن کی تکنیک بہتر سے بہترین بنانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ مستقبل میں بدصورت مرد و خواتین کو خوبصورت چہرے عطا کرنے کا انوکھا عمل شروع ہو جائے۔

مائنوریٹی رپورٹ (۲۰۰۲ء)

10

اداکار ٹام کروز کی ایک فلم جس میں خاصی پیشین گوئیاں کی گئیں مثلاً مائنوریٹی رپورٹ (Minority Report) میں بغیر ڈرائیور کے کاریں چلتی ہیں۔ آج کل گوگل کمپنی ایسی ہی خودکار کاریں چلانے کی کوشش کر رہی ہے جو مختلف کام انجام دیں گی۔

صحت مند رہنے کے ۲۰ طریقے

زندگی کو توانا بنائیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پچھلے چند برس میں جدید طبی تحقیق کے ذریعے بعض ایسے طریقے سامنے آئے ہیں جنھیں اپنا کر انسان اپنی صحت بہتر بنا سکتا ہے۔ یہ طریقے روزانہ اپنائے جائیں تو مرد و زن بیماریوں سے دور اور خوش باش رہتے ہیں۔ ان کا تعارف درج ذیل ہے

عاصم محمود

1 کافی سے فائدہ اٹھائیے

اگر آپ ناشتے میں کافی پیتے ہیں، تو خوش ہو جائیے۔ جدید تحقیق نے انکشاف کیا ہے کہ کافی ایک کرشماتی مشروب ہے۔ گو ابھی اس مشروب پر تحقیق جاری ہے، تاہم طبی تجربات سے کافی کے درج ذیل فوائد نمایاں ہوئے ہیں:

☆ اگر خاتون روزانہ ۳ر پیالی کافی پیئے، تو وہ جلد کے سرطان سے محفوظ رہتی ہے۔

☆ مرد وزن کم از کم ایک پیالی کافی روزانہ نوش کریں، تو انھیں فالج چمٹنے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

☆ اسی طرح ۲ر پیالی پینے سے انسان ڈیپریشن کا شکار کم ہی ہوتا ہے۔

☆ اگر مرد روزانہ ۶ر پیالی نوش کرے، تو پروسٹیٹ سرطان کے خطرے سے ۶۰ر فیصد تک بچ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ دنیا میں کئی مرد اسی مرض کے ہاتھوں چل بستے ہیں۔

2 ناشتے میں پروٹین لیجیے

پروٹین کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہمارے دماغ اور شکم کو بتاتے ہیں کہ انسان کھا پی کر سیر ہو چکا اور اُسے مزید کھانے کی ضرورت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جس کی غذا سے پروٹین عنقا ہو، اُسے مسلسل بھوک لگتی رہتی ہے۔ وہ پھر صحت کو نقصان پہنچانے والی غذائیں کھانے سے بھی نہیں چوکتا۔

ایک بالغ انسان کو روزانہ اتنی غذا کھانی چاہیے کہ اُسے مطلوبہ مقدار میں پروٹین مل جائیں۔ ماہرین غذائیات کا کہنا ہے کہ ہر انسان روزانہ مطلوبہ ضرورت کے ۲۰ر فیصد پروٹین ضرور کھائے۔ یوں اس میں شکم سیری کا احساس جنم لیتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اتنا زیادہ کھانا کھاتا ہے کہ ہر ماہ اس کا وزن ایک کلو تک بڑھ جاتا ہے۔ یہ سال کا ۱۲ر کلو بنتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان غذا سے مطلوبہ پروٹین نہ لے، تو موٹاپے کا شکار ہو سکتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ لوگ عموماً رات یا دوپہر کو پروٹین والی غذائیں مثلاً گوشت کھاتے ہیں۔ اب جدید تحقیق کہتی ہے کہ ناشتے میں پروٹین لیجیے تاکہ دن کے آغاز ہی میں سیری کا احساس پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ناشتے میں گوشت کھانا ممکن نہیں، تو اُبلا انڈا اور دہی لیجیے۔

3 نیلی روشنی سے بچیں

آج کل رات گئے تک کمپیوٹر، ٹی وی، سمارٹ فون وغیرہ پر کام کرنا معمول بن گیا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان آلات سے نکلنے والی نیلی روشنی دماغ کو مسلسل متحرک رکھتی ہے۔ نتیجتاً انسان کو نیند نہیں آتی اور وہ اس کی کمی کا شکار رہتا ہے۔ تاہم نیند کی کمی بھی ہزارہا مرد وزن کو کمپیوٹر یا ٹی وی سے دور نہیں رکھتی کیونکہ وہ ان کی لت یا نشے میں گرفتار ہوتے ہیں۔

ماہرین اب ایسے ہی لتّیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ سکرین کے آگے فلٹرنگ گلاس لگالیں تاکہ نیلی روشنی کے اثرات کم سے کم ہو جائیں۔ یوں وہ زیادہ دیر تک اور بہتر نیند لے سکیں گے۔

اگر آپ موٹاپے کے خلاف لڑنا چاہیں
تو اپنی خوراک کا
۱۵ر فیصد
حصہ پروٹین پر مشتمل رکھیں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

4 پوٹاشیم کی کمی نہ ہونے دیں

ماہرین قلب تجربات کی روشنی میں دل کے امراض کے شکار مردوزن کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنی صحت بہتر بنانے کے لیے جسم میں نمک اور پوٹاشیم کی مقدار متوازن رکھیے یعنی نمک کی مقدار کم جبکہ پوٹاشیم کی زیادہ ہونی چاہیے۔

وجہ یہ ہے کہ نمک کھانے سے ہمارا بلڈ پریشر بڑھتا ہے۔ پھر وہ مختلف طریق سے اپنے منفی اثرات دکھاتا ہے۔ معدن پوٹاشیم انہی مضر اثرات کو کم کر دیتا ہے۔

جدید طبی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جن مردوزن کے بدن میں پوٹاشیم کم اور نمک زیادہ ہو، وہ بہت جلد حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ واضح رہے، بالغ انسان کو روزانہ کم از کم ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ ملی گرام پوٹاشیم درکار ہوتا ہے۔ وہ یہ معدن مچھلی، خشک آلو بخارا، ساگ، کیلے، دودھ اور خشک خوبانی سے حاصل کر سکتا ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

5 کھڑے ہو کر 60 تک گنیں

ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ دن کے کسی حصے میں ورزش کر لی جائے، تو یہ انسان کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جدید طبی تحقیق نے یہ نظریہ باطل قرار دے دیا۔ اب ماہرین کہتے ہیں کہ اگر آپ صبح یا شام جتنی مرضی سخت ورزش کریں، دن کا بیشتر عرصہ دفتر میں بیٹھے گزارتے ہیں، تو وہ کسی کام کی نہیں۔

جدید تحقیق نے انکشاف کیا ہے کہ جو مردوزن دفتر میں کام کرتے ہوئے وقفے وقفے سے کھڑے ہوں، وہ سمارٹ، دُبلے پتلے اور چست رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ساٹھ سیکنڈ کا کھڑا ہونا بھی بدن پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔ مثلاً جسم میں کولیسٹرول کم کر دیتا اور انسولین کا نظام بہتر بناتا ہے۔ جبکہ جو لوگ طویل عرصہ بیٹھے رہیں، وہ مثبت فوائد حاصل نہیں کر پاتے۔

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ باقاعدگی سے پیروں پہ کھڑے ہونا انسان کو سرطان سے بھی بچاتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا کہ جو مردوزن ۱۰ برس تک طویل عرصہ دفتر

میں بیٹھے بیٹھے گزاریں، وہ عموماً آنتوں کے سرطان کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے منسلک ڈاکٹر آرتھر فریبر کا کہنا ہے ''فطرت نے انسانی جسم کی ساخت یوں رکھی ہے کہ وہ دن کا بیشتر حصہ چلنے جلنے میں گزارے۔ چنانچہ جو انسان فطرت سے بغاوت کرے، مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کئی لوگوں نے چہل قدمی کو اپنی زندگیوں سے نکال دیا ہے۔ ضروری ہے کہ یہ عمل واپس لایا جائے۔''

ماہرین کا کہنا ہے، ضروری نہیں کہ آپ ورزش کے لیے خاص وقت نکالیں۔ دورانِ کام بھی یہ عمل کرنا ممکن ہے مثلاً کھڑے ہو کر ٹیلی فون سنیں، کسی ساتھی کو پیغام دینا ہو تو فون کرنے کے بجائے اس کے پاس چلے جائیں، چلتے پھرتے میٹنگ کیجیے، وغیرہ۔

6 خوش رہنا ہو تو آفتوں کی توقع رکھیں

انسان غریب ہو یا امیر، فطرت کی نعمتیں بلاامتیاز اُسے عطا کرتی ہے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ خوش نظر نہیں آتے، وہ دولت مند ہوں یا قلاش۔ اب ماہرین نفسیات نے اندرونی خوشیاں بڑھانے کے لیے ایک نیا طریقہ دریافت کیا ہے۔ وہ یہ کہ دن میں چند منٹ اس بابت ضرور سوچیے کہ آپ کو جو نعمتیں حاصل ہیں، اگر آپ ان سے محروم ہو جائیں، تو کیا ہوگا؟

اس ضمن میں ایک برطانوی نفسیات داں، ٹموتھی ولسن کہتا ہے ''اس سوچ کے ذریعے آپ میں شکرگزاری، ممنونیت اور خوشی کے جذبات جنم لیں گے۔ ظاہر ہے، اگر آپ اپنے پیارے احباب اور ضرورت کی تمام اشیا کھو بیٹھیں، تو زندگی گزارنا کٹھن مرحلہ بن جائے گا۔ تب آپ کو دستیاب نعمتوں کی قدروقیمت کا احساس ہوگا اور وہ دوبارہ آپ کے لیے خصوصی بن جائیں گی۔

7 20 سیکنڈ میں نتیجہ پائیے

آپ کو علم ہے کہ منزل پانے کی کوشش اور حقیقتاً اسے پانے کے مابین کیا فرق ہے؟ ماہرین نفسیات کی جدید تحقیق کے مطابق یہ فرق صرف ''۲۰ سیکنڈ'' کا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر آپ کوئی بھی کام ۲۰ سیکنڈ پہلے شروع کر دیں، تو توقع یہ ہے کہ وہ مقررہ وقت سے قبل ہی انجام پائے گا۔

مثال کے طور پر صبح سویرے آپ نے ہوائی اڈے پہنچنا ہے، تو بہتر یہ ہے کہ رات کو ساری تیاری مکمل کر کے سوئیے حتیٰ کہ کپڑے اور جوتے بھی تیار کر لیجیے۔ اسی طرح اگر آپ اپنے کارکنوں کی تعریف کرنا چاہتے ہیں، تو میز پر ''تھینک یو'' نوٹ لکھیے۔ نیز قلم ہمیشہ پاس رکھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر فوراً شکریے کا نوٹ لکھ سکیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

8 صبح کام کیجیے اور سہ پہر کو آرام

یوں تو دھوپ کے کئی فوائد ہیں، لیکن وہ بعض نقصان بھی رکھتی ہے مثلاً ہماری جلد پر منفی اثرات مرتب کرنا۔ اب جدید تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ صبح کے وقت دھوپ ہماری جلد کے خلیوں پر سب سے کم اثرانداز ہوتی ہے جبکہ سہ پہر کو دھوپ میں رہا جائے تو جلد کا سرطان ہونے کا خطرہ ۵ گنا بڑھ جاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ہمارے ڈی این اے میں پایا جانے والا ایک خاص پروٹین جلد کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ پروٹین صبح کے وقت سب سے زیادہ جبکہ سہ پہر کو بہت کم ہوتا ہے۔ چنانچہ اب ماہرین طب لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ صبح کے وقت زیادہ کام انجام دیں، مثلاً باغبانی، پیدل چلنا اور اسی قسم کی دیگر سرگرمیاں۔

9 جلد کھانا کھائیے جلد سوئیے

مشرق میں بزرگوں کا یہ قول مشہور ہے کہ سرِ شام کھانا کھاؤ اور جلد سو جاؤ۔ اب جدید تحقیق نے بھی اس امر سے اتفاق کرلیا۔ ماہرین کی رو سے تادیر جاگنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان اچھا خاصا فربہ ہوجاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ انسان جتنی دیر جاگے، وہ مسلسل کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ہے۔ اس دوران عموماً وہ ردی (جنک) کھانے بھی خوب کھاتا ہے۔ پھر تادیر وہی جاگتے ہیں جو ٹی وی دیکھتے یا کمپیوٹر پر بیٹھتے ہیں۔ یوں حرکت نہ کرنے سے بھی وہ مٹاپے کی گرفت میں آجاتے ہیں۔

نیند کی بیماریوں پر تحقیق کرنے والی ایک امریکی ڈاکٹر، الزبتھ لی کہتی ہے ''جو مرد وزن نیند کی کمی کے باعث پریشان ہیں، وہ ایک آسان نسخہ اپنا کر تندرست ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ باقاعدگی سے کم و بیش ایک ہی وقت پر سوئیے اور جاگیے۔ یوں آپ کا جسم جان جائے گا کہ کب سونا ہے، یوں آپ پوری نیند لیں گے۔ اسی طرح کھانے کے بھی اوقات بنائیے۔ کوشش کیجیے کہ روزانہ ایک ہی وقت کھانا کھائیے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

10 شکر کے جال سے ہوشیار رہیے

جب سے ذیابیطس کا مرض عام ہوا ہے، کمپنیوں نے شکر سے پاک (شوگر فری) گولیاں ٹافیاں بھی بنائیں۔ ان کمپنیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ کیفیکشنری ذیابیطس پیدا نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے دانت خراب ہوتے ہیں۔ لیکن اب تجربات سے افشا ہوا ہے کہ یہ گولیاں ٹافیاں بھی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔

دراصل یہ چیزیں مصنوعی مٹھاس کے ذریعے میٹھی کی جاتی ہیں۔ مگر اب پتا چلا ہے کہ ان میں شامل کھٹاس اور پھلوں کے ذائقے (Flavours) مصنوعی مٹھاس سے تعامل کرکے ایسا تیزاب پیدا کرتے ہیں جو ہمارے دانت کمزور کرتا اور انھیں پیلا کردیتا ہے۔ سب سے خطرناک لالی پاپ ہیں، وہ آہستہ آہستہ گھل کر تیزاب کو موقع دیتے ہیں کہ طویل عرصہ دانتوں کو نشانہ بنائے رکھے۔

ڈاکٹر اب مشورہ دیتے ہیں کہ بچہ ہو یا بڑا، جو بھی شکر سے پاک گولیاں ٹافیاں کھائے، وہ کھانے کے بعد دانت صاف کرلے۔ دوسری صورت میں اس کے دانت ناکارہ ہوسکتے ہیں۔

11 سر ٹھنڈا رکھ کر اچھی نیند لیجیے

تیز رفتار زندگی (اور پاکستان میں لوڈشیڈنگ) کے باعث بے خوابی کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اب سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے کہ بے خوابی کی ایک وجہ بدن خصوصاً دماغ کا درجہ حرارت بڑھ جانا بھی ہے۔

چنانچہ جن مردوزن کے سر و بدن گرم ہوں، وہ بمشکل سو پاتے ہیں۔ جبکہ جن کا درجہ حرارت معمول پر ہو، وہ جلد خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر اب نیند کی کمی کے شکار لوگوں کو تجویز کرتے ہیں کہ سونے سے ایک گھنٹہ قبل نیم گرم پانی سے نہالیں تاکہ ہمارے جسم کا قدرتی سرد انتظام متحرک ہو جائے اور اگر کمرا ٹھنڈا ہو سکے، تو تب بھی اچھی نیند آتی ہے۔

12 یادداشت بڑھانے کے لیے پیدل چلیں

یہ دیکھا گیا ہے کہ باقاعدگی سے ورزش کرنے والے جسمانی طور پر تندرست رہتے ہیں۔ اب انکشاف ہوا ہے کہ ورزش دماغ کے لیے بھی بڑی مفید ہے۔ اس کی افادیت کا اندازہ درج ذیل حقیقت جان کر لگائیے۔

ہمارے دماغ میں ہپوکامپس (Hippocampus) نامی حصہ ہماری یادداشت توانا و تندرست رکھتا ہے۔ ہر سال یہ حصہ ایک تا دو فیصد سکڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے میں سیکڑوں مردوزن بھلکڑ پن کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

لیکن جدید تحقیق نے انکشاف کیا ہے کہ جو لوگ ہفتے میں کم از کم تین دن ۴۵ منٹ تک تیز چلیں، ان میں ہپوکامپس ہر سال ۲ فیصد پھیل جاتا ہے۔ گویا ورزش کی بدولت یہ علاقہ عمر سے وابستہ سکڑاؤ سے متاثر نہیں ہوتا۔

خوشخبری یہ ہے کہ اگر آپ بوڑھے ہیں، تب بھی ورزش سے اپنے ہپوکامپس کو پھیلا سکتے ہیں۔ یہ امر تجربات سے ثابت ہو چکا۔ ایک تجربے میں ان ۵۵ سے ۸۰ سالہ مردوزن کو ورزش کرائی گئی جنھوں نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ ۳ ماہ بعد ان مردوزن کی یادداشت پہلے سے بہتر ہو گئی۔

مزید براں ضروری نہیں کہ سخت ورزش کی جائے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے وابستہ ماہر طب، ڈاکٹر آرتھر کرامر کہتا ہے ''ایسی کوئی بھی ورزش آپ کو فائدہ پہنچائے گی جو دل کی دھڑکن تیز کر دے۔ چنانچہ پسندیدہ ورزش تلاش کریں اور اسے باقاعدگی سے انجام دیں۔ تیز تیز چلنا بھی ایک عمدہ جسمانی سرگرمی ہے۔''

13 چاکلیٹ سے منہ نہ موڑیں

سیاہ چاکلیٹ میں کیفین کا رشتے دار، کوکا کا تھیوبرومائن پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کی مقدار اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ نیند دم دبا کر بھاگ جائے۔ اسی لیے دوپہر کو فوری توانائی مہیا کرنے میں سیاہ چاکلیٹ کا جواب نہیں۔

واضح رہے کہ سیاہ چاکلیٹ میں مانع تکسید (Antioxidants) مادے بکثرت ملتے ہیں۔ نیز یہ حملہ قلب کا امکان کم کرتا اور موڈ خوشگوار بناتا ہے۔ پھر اس کا ذائقہ بھی من پسند ہوتا ہے۔

14 ثابت گندم اور باجرا کھائیے

ماہرین اناج کی دونوں درج بالا اقسام کو ''سپر'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ دراصل دونوں غذاؤں میں پروٹین، ریشہ اور میگنیشم ملتے ہیں۔ میگنیشم ایک قیمتی معدن ہے۔ یہ انسان کو ہائپرٹینشن سے محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ دونوں غذاؤں کو اکثر و بیشتر استعمال کیجیے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

15 یوگا اور کمر درد

انسان کو کمر درد چمٹ جائے، تو اسے مختلف طریقوں سے دور کرنے کی سعی ہوتی ہے۔ دراصل یہ ان گنے چنے امراض میں سے ایک ہے جو مشکل ہی سے کافور ہوتا ہے۔ ایک طریقہ علاج فزیوتھراپی ہے۔ مگر اب جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یوگا بھی کمر درد جلد دور کرتا ہے۔

یوگا ورزش کا قدیم طریقہ علاج ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ دماغ، نظام تنفس اور بدن کی حرکات کو منسلک و مربوط کرتا ہے۔ پھر یہ پورے جسم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمر درد کی صورت میں یوگا کرنے سے دیگر تکالیف بھی جاتی رہتی ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

16 بچوں نہیں بیوی پر دھیان دیجیے

ماہرین نفسیات زور دیتے ہیں کہ والدین اپنے بچوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں۔ لیکن نئی تحقیق کے مطابق حد سے زیادہ توجہ بچوں کے لیے کئی اعتبار سے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ماہرین اب خصوصاً شوہروں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ بیویوں پر بھی توجہ دیں۔

وجہ یہ ہے کہ کامیاب شادی مسلسل محبت اور تجدید عہد و پیمان مانگتی ہے۔ پھر ضروری ہے کہ ازدواجی زندگی میں ٹھہراؤ نہ آئے بلکہ نئی کہانیاں، تجربے اور یادیں جنم لیں۔ چنانچہ بیوی اور دیگر عزیز و اقارب کو بھی نظر انداز مت کریں اور ان سے ملنا جلنا جاری رکھیں۔

مشرقی تہذیب و تمدن میں گھر کا محور و مرکز بیوی ہی ہوتی ہے، لہٰذا شوہر کی بھرپور توجہ ملنے پر بیوی خوش سلیقگی اور اعتماد سے اپنے تمام کام انجام دیتی ہے اور گھر خوشیوں کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

17 سہ پہر کو میٹھی اشیا سے پرہیز کریں

ہمارے ہاں رواج ہے کہ سہ پہر کو چائے کے ساتھ کیک، بسکٹ اور میدے سے بنی اشیا اڑائی جاتی ہیں۔ لیکن ان اشیائے خورونوش کی قباحت یہ ہے کہ وہ بھوک کم کرنے کے بجائے بڑھا دیتی ہیں۔

ڈاکٹر پام پیکی امریکا کا مشہور ماہر غذائیت ہے۔ وہ کہتا ہے ''اگر آپ ۶/۷ گھنٹے پہاڑ پر چڑھ یا میراتھن میں حصہ لے کر آئے ہیں، تب تو سہ پہر کو میٹھی اور میدے سے بنی اشیا ضرور کھائیے۔ دوسری صورت میں یہ اشیا فائدہ کم، نقصان زیادہ پہنچاتی ہیں۔''

موصوف کا مشورہ ہے کہ سہ پہر کو ایسی چیزیں کھائیے جو آپ کو چکنائی، پروٹین اور ریشہ (فائبر) مہیا کریں مثلاً خالص گندم سے بنے دو تین بسکٹ، مونگ پھلی کا مکھن اور کم مٹھاس رکھنے والا پھلوں کا مربہ۔ یہ اشیا فوری اور تادیر رہنے والی توانائی فراہم کریں گی۔

18 زندگی کو چٹپٹا بنائیے

پاک و ہند میں صدیوں سے ہری و سرخ مرچیں اور دیگر مسالہ جات کھانوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ مسالہ جات کئی حیاتین و معدنیات رکھتے ہیں۔ چنانچہ اب مغربی سائنس داں بھی ان کی افادیت کے قائل ہو گئے۔

مثلاً تحقیق سے پتا چلا ہے کہ سرخ و سبز مرچ کو تُرش ذائقہ دینے والا مادہ، کیپسیسن (Capsaicin) ایک گھنٹے تک انسانی نظامِ استحالہ (میٹابولزم) فعال رکھتا ہے۔ نیز مرچیں انسان میں جلد سیری کا احساس پیدا کرتی ہیں، لہٰذا وہ بسیار خوری سے بچا رہتا ہے۔ پھر مرچوں میں وافر وٹامن سی بھی ملتا ہے۔ لہٰذا اس خدائی نعمت کو اپنے کھانوں میں شامل رکھیے۔

19 خیالی دوست سے مدد لیجیے

جب بھی انسان کسی معاملے میں ناکام ہو، تو اپنی ذات کو تنقید کا نشانہ بنالیتا ہے۔ تاہم ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ اس روش سے اُلٹا نقصان پہنچتا ہے۔ یوں انسان میں احساسِ کمتری جنم لیتا اور رہا سہا حوصلہ جاتا رہتا ہے۔ لہٰذا ناکامی ملنے پر خود کو نشانہ بنانا بالکل درست نہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ہر حال میں اپنے ساتھ اچھا سلوک کیجیے۔ یوں نہ صرف آپ اپنے عزائم میں کامیاب ہوتے بلکہ غم اور ذہنی دباؤ بھی کم محسوس کرتے ہیں۔ مزید براں ماہرین یہ نئی تجویز لے کر سامنے آئے ہیں کہ جب بھی کوئی کٹھن مرحلہ درپیش ہو، تو اپنا حوصلہ و جوش بڑھانے کے لیے خیالی دوست پیدا کر لیجیے۔

اس کے بعد تصور کیجیے کہ اگر آپ کا دوست ایسی مشکل صورت حال میں گرفتار ہوتا، تو آپ اسے کیسا مشورہ دیتے؟ چنانچہ وہ مشورہ بہ صورت خط تحریر کر لیجیے۔ یوں عموماً مسئلے کا حل سامنے آجاتا ہے۔ نیز انسان زیربار بھی نہیں ہوتا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

20 گائے وہ جو گھاس کھائے

ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ جو گائے بھینسیں گھاس کھا کر پرورش پائیں، ان کے گوشت میں نہ صرف چربی کم ہوتی ہے، بلکہ قلب کے لیے مفید اومیگا۔۳ تیزاب بھی ملتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر اب مشورہ دیتے ہیں کہ ان گائے بھینسوں کا گوشت کھائیے جو گھاس کھاتی ہوں۔

ان جانوروں کے گوشت میں تیزاب کی ایک قسم، لائنولیک ایسڈ بھی ملتا ہے۔ یہ غذائی تیزاب انسان کو کینسر سے بچاتا، دماغ کے خلیے محفوظ کرتا اور پیٹ کی چربی پورے جسم میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ■

ترقی کا حقیقی پیمانہ

خوشی

بھوٹان میں اُس انسان کو خوشحال اور ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے جو دولت مند نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ خوش ہو

صغیر علی

جگمے سنگیال وانگ چک ..... یہ کھل جا سم سم قسم کا کوئی جنتر منتر نہیں بلکہ بھوٹان کے ''سابق'' بادشاہ کا نام ہے۔ موصوف کو سابق اس لیے کہا گیا ہے کہ انھوں نے بحیثیت بادشاہ وہ کارنامہ کر دکھایا جو انسانی تاریخ میں شاید ہی کسی نے انجام دیا ہو۔

دراصل انسان ایک بار تختِ شاہی پر بیٹھ جائے اور اقتدار کے مزے لوٹ لے، تو پھر وہ عموماً جان سے گزرنے کے بعد ہی کرسی کی جان چھوڑتا ہے۔ لیکن بھوٹانی بادشاہ نے ازخود اقتدار چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہی نہیں، انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مملکت کے لیے بادشاہت نہیں جمہوریت مفید ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بادشاہی اختیارات بھی کم کر دیے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ شاہ جگمے نے بیٹے کو نیا بادشاہ نامزد کیا تھا۔ لیکن بھوٹان کے عوام نے اُسے اپنا حکمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہ جگمے کا سایہ ہی ان پر برقرار رہے۔ مزید برآں انھوں نے جمہوریت کو بھی قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد شاہ جگمے نے پورے بھوٹان کا دورہ کیا اور اپنی رعایا کو بتایا کہ ملکی ترقی و خوشحالی کے لیے جمہوریت ہی بہتر ہے۔ یوں ان کے اصرار اور سمجھانے بجھانے پر بھوٹانی عوام نے آخرکار جمہوریت اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔

یوں بادشاہ کے اختیارات کم ہوئے جبکہ وزیراعظم بھوٹان کے اختیارات بڑھ گئے۔ یقیناً یہ کم از کم حالیہ تاریخ میں انوکھا واقعہ ہے کہ ایک بادشاہ نے ازخود اپنے اختیارات کم کر لیے۔ آج بھوٹان آئینی بادشاہت کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا حکومت میں بادشاہ کا کردار رہی ہے۔ جس طرح برطانیہ میں ملکہ محض سرپرست کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاہ جگمے کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اقتدار چھوڑنے سے قبل انھوں نے جمہوری حکومت کو یہ بنیادی پالیسی دی کہ وہ قومی ترقی و خوشحالی کا اشاریہ یا نشان خام قومی پیداوار (Gross Domestic Product) نہیں بلکہ خام قومی مسرت (Gross National happiness) کو بنائے۔ عوام کی فلاح و بہبود پر کمربستہ شاہ جگمے کی جانب سے یہ ایک اور انقلابی قدم تھا۔

پچھلے دنوں وزیراعظم لاؤنچون جگمے تھنلے نے ''خام

قومی مسرت کمیشن'' قائم کیا ہے۔ یہ ادارہ اس امر کو یقینی بنائے گا کہ تمام قومی پالیسیاں اس انداز میں تشکیل دی جائیں کہ خام قومی مسرت حاصل ہو سکے مثلاً ایک پالیسی کے تحت بھوٹان دنیا کا پہلا ایسا ملک بننا چاہتا ہے جہاں صرف نامیاتی (Organic) غذا ملتی ہو۔ اسی طرح دوسری پالیسی کے ذریعے ایسی سرگرمیاں کم سے کم انجام دینا ہے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کریں۔

سوال یہ ہے کہ دیگر اقوام کے مانند بھوٹانی خام قومی پیداوار کو تمام مسائل کا حل کیوں نہیں سمجھتے؟ دراصل بھوٹانیوں کو احساس ہو گیا ہے کہ ترقی کے روایتی طریقوں نے یقیناً انسانوں کا معیار زندگی بلند کیا ہے، لیکن اب وہ فوائد دینے کی نسبت خرابیاں زیادہ پیدا کر رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر ترقی کی شرح نے کرۂ ارض کے وسائل پر اتنا بوجھ ڈال دیا ہے کہ اب وہ اُسے سہار نہیں پا رہے۔ لہٰذا بنی نوع انسان کو اب ترقی کا ایسا پیمانہ درکار ہے جو ملازمتیں پیدا کرے اور انسان کو آسائشیں دے، لیکن ساتھ ساتھ فطرت، ماحول، قدرتی وسائل اور انسان کے ذہنی سکون اور خوشیوں کا بھی خیال رکھے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

خام قومی پیداوار کو سمجھیں

ایک ملک میں جتنی مصنوعات اور خدمات (سروسز) جنم لیں، ان کی مجموعی مارکیٹ قدر (قیمت) کا نام خام قومی پیداوار ہے۔ لیکن اسے ترقی یا امارت کا پیمانہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صرف قومی آمدن یا معاشی سرگرمیوں کی پیمائش کا طریقہ ہے۔ پھر ان معاشی سرگرمیوں میں منفی اثرات کی حامل سرگرمیاں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔

مثلاً ایک ملک میں زلزلے سے تباہی آئے، تو اس کی خام قومی پیداوار بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے، تب تعمیر نو کی سرگرمیاں جنم لیں گی۔ لیکن ان سرگرمیوں کو ہم مثبت یا ترقی دینے والی نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ جرائم، زیادہ بیماریاں، جنگیں، آلودگی، زلزلے، سیلاب وغیرہ خام قومی پیداوار کے لیے ''مثبت'' اشارے ہیں کیونکہ یہ بھی مل کر معاشی سرگرمیوں کو بڑھا دیتے ہیں۔

خام قومی پیداوار کی یہی خرابیاں مدنظر رکھ کر بھوٹانی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اپنے عوام سے پوچھا جائے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی بنیاد پر معیاری زندگی، خوشحالی اور سب سے بڑھ کر ذہنی سکون حاصل کرنا ممکن ہے؟

اس سلسلے میں ہزارہا بھوٹانیوں سے ۲۰۰ سوال پوچھے گئے۔ یہ سوال زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تھے۔ ایک نئے علم، مسرت کی سائنس (Science of Happiness) کے ماہرین اس سروے کو ''خارجی خوشیوں کا تجزیہ'' کی اصطلاح سے پکارتے ہیں۔ یہ سروے کئی ترقی یافتہ ممالک نے بھی کرایا ہے تاکہ وہ اپنے عوام کی پسند و ناپسند سے واقف ہو سکیں۔

بھوٹان میں کیے گئے عوامی سروے سے انکشاف ہوا کہ لوگ آمدن اور آسائشوں کے علاوہ کئی غیر مادی چیزوں کو بھی اپنی خوشیوں اور ذہنی سکون کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں صاف ہوا، پانی اور ماحول شامل ہے۔ اسی طرح بھوٹانیوں نے سیر و تفریح کے مقامات اور عبادت گاہوں کو بھی ضروری قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوٹانیوں کی اکثریت نے بتایا کہ دولت کے بجائے فطرت سے محبت و ہم آہنگی خوشی کا مرکز و بنیاد ہیں۔

اسی سروے کے بعد بھوٹانی حکومت نے ترقی کے اپنے پیمانے، ''خام قومی مسرت'' کا احیا کیا۔ ذاتی آمدن اس کا بھی حصہ ہے لیکن اُسے اولیت حاصل نہیں، بلکہ غیر مادی چیزیں مقدم حیثیت رکھتی ہیں۔

بھوٹان ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن دیکھیں ..... اس نے نوع انسانیت کو کتنا بڑا سبق دیا..... کہ سراسر مادہ پرستی پر استوار معاشی ترقی اب خسارے کا سودا بن چکی۔ اگر انسان حقیقی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اُسے مادیت کا بھوت سر سے اتارنا ہوگا ورنہ لالچ و ہوس کے ہاتھوں وہ نہ صرف خود نیست و نابود ہوگا بلکہ کرۂ ارض بھی تباہ کر ڈالے گا۔ ■

قلم پارے

امریکا سے چند
خوش نظر فرحت اثر
نمک پارے، شکر پارے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

تیر انداز، فتنہ طراز، دنیا کے مشہور سخن پرداز آرٹ بک والڈ کے منتخب منتخب فکاہیے
روزانہ، دنیا کے پانچ سو اخباروں کے قارئین ان کے تیر و نشتر کی زد پر رہتے تھے

ترجمہ سلیم انور

صاحب حیثیت

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی عظیم ترین خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جتنی زیادہ رقم کے آپ مقروض ہوں گے، ہر کوئی آپ کی اتنی ہی زیادہ عزت کرے گا۔ اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا جب میں واشنگٹن میں واقع ایک بینک میں اپنا قرض ادا کرنے گیا۔ بینک میں داخل ہوتے وقت میں خاصی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ قرض جنوری تک واجب الادا تھا اور میرا خیال تھا کہ بینک میری پیشگی ادائی پر بے انتہا مسرور ہوگا۔

انھوں نے مجھ سے نہایت عمدہ سلوک کیا۔ بینک کے نائب صدر نے مجھ سے مصافحہ کیا، مجھے سگار پیش کیا اور مسکرانے لگا۔ ''ویل۔'' اس نے خندہ روئی سے کہا۔ ''یقیناً آپ مزید رقم قرض لینے کے لیے تشریف لائے ہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے بھی اسی خوش مزاجی سے کہا۔ ''میں تو اپنا قرض واپس ادا کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے کہا ''ضرور آپ مذاق کر رہے ہیں۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں واقعی وہ قرض واپس کرنا

چاہ رہا ہوں جو آپ لوگوں نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے گزشتہ موسم خزاں میں دیا تھا۔"

"لیکن وہ قرض تو جنوری تک واجب الادا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے خوش سے کہا۔ "لیکن میں اپنا حساب بے باق کر دینا چاہتا ہوں۔"

"ایک منٹ۔" اس نے کہا۔ "آپ یونہی سڑک پر ٹہلتے ہوئے اندر آ کر وہ قرض واپس نہیں کر سکتے جو ابھی واجب الادا بھی نہیں ہوا۔ آپ کے خیال میں ہمارا بینک کس قسم کا ہے؟"

"میں سمجھا تھا آپ لوگ خوش ہوں گے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خوش ہوں گے؟" وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "میں خوش کیوں ہوں گا؟ جانتے ہیں، یہ میری گردن ہے۔ میں نے آپ کے معاملے میں بینک کے صدر سے ٹکر لی تھی۔ قرض منظور کرنے سے قبل ہم نے آپ کے بارے میں پوری جانچ پڑتال کی تھی اور یہ دریافت کیا تھا کہ آپ بہت قلیل رقم کے مقروض ہیں اور کسی ایک کیس میں تو آپ نے خریداری کی ادائی، حد تو یہ ہے کہ نقدی میں کی تھی۔

"جہاں تک بینک کا تعلق ہے۔ آپ ابتدا ہی سے ہمارے لیے بڑا خطرہ تھے لیکن میں نے انھیں آمادہ کر لیا کہ آپ کے مقروض نہ ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ آپ کو اس ملک میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اب میں انھیں یہ بتاؤں گا کہ آپ پہلا ہی قرض واپس ادا کرنا چاہتے ہیں تو کیا میں انہیں منہ دکھانے کے قابل رہ سکوں گا؟"

"لیکن کیا آپ رقم کو استعمال میں نہیں لا سکتے؟"

"ہمارا بزنس قرضوں کی فراہمی ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کیا سمجھ رہے ہیں، یہ کس قسم کا ادارہ ہم لیے بیٹھے ہیں۔ اگر ہر کوئی یہاں آ کر یہ کہے کہ وہ قرض واجب الادا ہونے سے پہلے ہی لوٹا دینا چاہتا ہے تو ہمارا کام ہو گیا۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہر کوئی اتنا زر پرست نہیں جتنے کہ تم ہو۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں صحیح کام کر رہا ہوں۔"

"مجھے پریزیڈنٹ سے بات کرنا ہو گی۔" وائس پریزیڈنٹ نے دو بینک گارڈز کو آواز دے کر طلب کیا اور ان سے کہا۔ "ان پر نگاہ رکھو، یہ قرض لوٹانا چاہتے ہیں۔"

ان کے تیور اچھے نہیں تھے، میں نے دیکھا اُن کے ہاتھ ہولسٹر میں رکھے پستولوں کی جانب منڈلا رہے تھے۔

چند منٹ بعد صدر آ گیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"تم ایک آزاد کاروباری ادارے کے نظام کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔" اس نے مجھے موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا۔ "ایسے لوگوں سے ہم کوئی کاروبار نہیں کرنا چاہتے۔"

میری آنکھیں بھاری ہو گئیں۔ "مجھے معلوم نہیں تھا، میرا یہ ارادہ اس قدر تکلیف دہ ہو سکتا ہے۔ آئی ایم سوری۔ میں حقیقت میں قرض واپس ادا نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے...... ابھی ابھی کچھ خیال آیا ہے۔ کیوں نہ میں ایک کشتی خریدنے کے لیے مزید کچھ رقم کے لیے قرض کی درخواست آپ سے کروں۔"

یہ سنتے ہی بینک گارڈز کے تنے ہوئے جسم اور بپھرے ہوئے چہرے پُرسکون ہو گئے۔ صدر اور نائب صدر دونوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"میرے خیال سے تو ہم سب سے غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں۔" صدر نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میرا قیاس ہے کہ آپ ایک بڑی کشتی خریدنا چاہتے ہوں گے؟"

☆☆

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو

یہ سوال کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا سی آئی اے کے ذریعے غیر ملکی سیاسی پارٹیوں کو سرمایہ فراہم کرے یا نہ کرے، انتظامیہ کے لیے کوئی مسئلہ دکھائی نہیں دے رہا۔ بحث صرف یہ ہے کہ کن پارٹیوں کو رقم ملنی چاہیے! اور افواہ

یہ ہے کہ سی آئی اے اٹلی میں کرسچین ڈیموکریٹس کو ۶۰۰۰۰۰ ڈالرز دینے کا منصوبہ بنا رہی ہے تاکہ یہ یقینی ہوجائے کہ کمیونسٹ منتخب نہ ہونے پائیں۔ لیکن واشنگٹن میں کچھ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے، امداد سودمند ہونے کے بجائے برعکس بھی ہوسکتی ہے۔

ان میں سے میرا ایک دوست نکولو میکیاویلی ہے جو اٹلی کی سیاسی صورتِ حال سے اتنی ہی واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ کوئی اور۔

''میرا خیال ہے ہم اٹلی میں ایسی سیاسی پارٹی کو رقم دیں جس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کا مکمل یقین ہو۔''

تمہاری مراد کرسچین ڈیموکریٹس سے ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی بات کررہا ہوں۔''

''تم پاگل ہوگئے ہو؟'' میں نے میکیاویلی سے کہا۔ ''ہم رقم اطالوی کمیونسٹ پارٹی کو کیوں دیں؟''

''بات نہایت ہی آسان ہے۔ اگر سی آئی اے اپنے فنڈ، اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے سپرد کرتی تو ہر ایک یہی کہے گا کہ اٹلی میں کمیونسٹ، سی آئی اے کے لیے کام کرتے ہیں اور مرکزی پارٹیاں الیکشن جیت جائیں گی۔''

''لیکن یہ تو میکاویلیائی رائے ہے۔'' میں نے اپنے دوست سے کہا۔ ''امریکی عوام یہ صورت کبھی گوارا نہیں کریں گے۔''

''نہ ہی اطالویوں کو یہ بات قابلِ قبول ہوگی۔'' میکیاویلی نے کہا۔ ''دیکھو! اس وقت کمیونسٹوں کے سوا ہر سیاسی پارٹی اٹلی میں داغ دار ہے۔ وہاں تقریباً ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ ان کے سیاست داں سی آئی اے کے پروردہ ہیں۔ وہ واحد طریقہ جس کے ذریعے ہم یہ حقیقت پلٹ سکتے ہیں، یہ ہے کہ کمیونسٹوں کو پے رول پر لے آئیں اور بقیہ کو محروم کردیں۔''

''لیکن تم غیرکمیونسٹ سیاست دانوں کو سی آئی اے فنڈ سے محروم نہیں رکھ سکتے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''دائیں بازو، مرکز اور غیرکمیونسٹ بائیں بازو کے تمام سیاست دان اپنے ذاتی اخراجات کے لیے اسی رقم پر انحصار کرتے ہیں۔ انہیں محلات کی ادائیاں کرنا ہوتی ہیں، نئی کاریں خریدنا ہوتی ہیں، سوئز بینک اکاؤنٹس برقرار رکھنا ہوتے ہیں۔''

''آہ، بس یہی تو اصل نکتہ ہے۔'' میکیاویلی نے کہا۔ ''انہیں محروم نہیں رکھا جائے گا۔ جب روسیوں کو یہ علم ہوگا کہ سی آئی اے، اٹلی میں کمیونسٹ پارٹی کی حمایت کررہی ہے تو پھر کے جی بی (روسی خفیہ ایجنسی) کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ کرسچین ڈیموکریٹس کی کفالت کرے۔ تمہیں معلوم ہے؟ ہماری حکومت کے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ روسی کسی بھی غیرملک میں الیکشن کے لیے امریکا سے کہیں زیادہ رقم بہاتے ہیں۔ چنانچہ یقین رکھو، کرسچین ڈیموکریٹس کے پاس اس سے کہیں زیادہ فنڈز موجود ہوں گے جتنے سی آئی اے سرمایہ کاری کے وقت ہوا کرتے تھے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''یہ ایک دلچسپ تجویز ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن اس وقت کیا ہوگا اگر سی آئی اے کی سرمایہ کاری سے اٹلی میں کمیونسٹ جیت جائیں؟''

''یہ امکان بہت ہی کم ہے۔ عموماً سی آئی اے جس فریق کی الیکشن میں حمایت کرتی ہے، وہ ہار جاتا ہے لیکن ہمیں ایک اور کام کرنا ہوگا۔ اس فیاضی کی زبردست تشہیر کرنی ہوگی کہ اٹلی میں کمیونسٹوں کو ہماری سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی سرمایہ فراہم کررہی ہے۔''

''یہ تشہیر تم کس طرح کرو گے؟''

''ہم ڈائریکٹر جارج بش سے کہیں گے، وہ کانگریس کی واچ ڈاگ کمیٹی کے خفیہ سیشن میں بریفنگ کا اہتمام کرے کہ سی آئی اے اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کو ۶ ملین ڈالرز فراہم کرنے والی ہے۔ وہ ان سب سے رازداری کی قسم لے گا کہ وہ یہ خلاف واقعہ حقیقت خود تک محدود رکھیں گے۔

بریفنگ ختم ہونے کے پانچ منٹ بعد واشنگٹن میں ہر نیوز بیورو کو اس بات کا علم ہوجائے گا۔ یہ کہانی شائع

ہونے کے اگلے روز وائٹ ہاؤس اس کی تردید کرے گا۔ جوں ہی تردید کا اعلان ہوگا، اگلی میں ہر کسی کو یقین آجائے گا کہ یہی حقیقت ہے۔''

شان دار۔'' میں نے میکیاولی سے کہا۔ ''لیکن اگر سی آئی اے نے دیگر ممالک میں بھی کمیونسٹ پارٹیوں کی حمایت شروع کر دی تو کیا اس سے کشیدہ تعلقات میں مراسم کی استواری کو نقصان نہیں پہنچے گا؟''

''ہو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن روسیوں کو یہ جتلانے کے لیے کہ ہم واقعی تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں، اس سے بہتر طریقہ بھی اور کیا ہو سکتا ہے؟''

☆☆

قابل تجدید

چونکہ ان دنوں ہمارے تمام مقدس ادارے شدید تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، اس لیے یہ پڑھ کر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ شادی کے سلسلے میں ہمارا صدیوں پرانا نظریہ امریکی نفسیاتی ادارے کی ایک رکن نے چیلنج کر دیا ہے۔

واشنگٹن میں ہونے والی ایک کانفرنس میں کیلی فورنیا کی ایک نفسیاتی سماجی کارکن مسز ورجینیا ساتر نے ایک تحریری مقالہ پیش کیا ہے۔ اس میں مغربی عیسائی دنیا میں شادی کرنے والوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس سماجی کارکن نے کہا ہے کہ شادی ہمارے معاشرے کا وہ واحد انسانی معاہدہ ہے جس میں وقت کا کوئی تعین نہیں، نظرثانی کی کوئی صورت نہیں اور نہ ہی اس کی تنسیخ کے کوئی قابل قبول معاشرتی راستے ہیں۔

مسز ساتر کا حل نہایت سادہ ہے۔ وہ اس بات کی حامی ہیں کہ شادی، پانچ سالہ قابل تجدید معاہدہ ہونا چاہیے۔

اگر شادی پہلے پانچ سال بہ خیر و خوبی قائم رہتی ہے تو وہ جوڑا شادی معاہدے کی آئندہ مدت کے لیے مزید تجدید کر سکتا ہے۔ اگر شادی ناکام رہی ہے تو یہ کسی بے جا دباؤ، اخراجات، مقدمے بازی یا رسوائی کے بغیر خود بخود فسخ ہو جائے گی۔

میں نے یہ مقالہ پڑھا تو مجھے فطری طور پر طیش آ گیا اور میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''کیا تم سوچ سکتی ہو؟ کوئی خاتون نفسیات داں اس بات کا پرچار کر رہی ہے کہ شادی کی اساس پانچ سالہ معاہدے پر ہونی چاہیے جو دونوں فریقوں کی رضامندی سے قابل تجدید ہو۔''

''تم نے یہ بات کیوں چھیڑی ہے؟'' میری بیوی نے پوچھا۔

''کیوں؟'' میں نے نفرت سے اخبار ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کہ شادی ایک مقدس رواج ہے۔ ایک بار آپ کی شادی ہو جائے تو پھر ہر پانچ سال بعد آپ کو یہ فیصلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آپ اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کے فیصلے آدمی کو پاگل کر سکتے ہیں۔''

''تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو، یعنی تمہاری تشویش کا سبب یہ تو نہیں کہ جب ۱۵ سال گزر جائیں گے اور معاہدے کی مدت اختتام پذیر ہوگی تو تم اس کی تجدید کے لیے پُریقین نہیں ہو گے؟'' میری بیوی نے آہستگی سے کہا۔

''میں کسی طور سے ایسا کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ ہمارے معاملے میں شاید تجدید خودکار طور پر ہو جائے گی۔''

''شاید؟''

''تم مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی ہو۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''یقیناً یہ خود بہ خود ہو جائے گا، اگر میں ایمان داری سے کام لوں تو مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ جوں ہی پانچ سال کی مقررہ مدت قریب آئے گی تو میں اس معاملے میں زیادہ غور و فکر کروں گا۔''

''وہ کیوں؟'' میری بیوی نے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔

''یہ تو بہت سامنے کی بات ہے۔ اگر لوگوں کے پاس ہر پانچ سال بعد ایسا اختیار ہوگا تو نظرثانی کے بارے میں

لازماً سوچیں گے۔ شادی ایک نہایت سنجیدہ معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے، اگر میں ہر پانچ سال بعد عہدنامے کی مختصر تحریر پڑھے بغیر معاہدے پر بس دستخط کردوں گا تو تم میرا اتنا زیادہ خیال نہیں رکھا کرو گی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ اسے پڑھنے کے بعد میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔ لیکن ہو سکتا ہے، میں اس میں ادھر اُدھر چند شقوں کا اضافہ کرنا چاہوں جن کے بارے میں، میں نے اس وقت دھیان نہیں دیا تھا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔''

''مثال کے طور پر کیا؟'' میری بیوی نے بستر کے پہلو میں رکھا لیمپ شیڈ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! ہو سکتا ہے کہ میں رقم خرچ کرنے کی کوئی حد مقرر کردوں، تمھاری ماں کے بارے میں چند پیراگراف کا اضافہ کردوں اور ہو سکتا ہے کہ اپنے لیے آزادی کی کوئی شق شامل کردوں۔ اسی قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ہیں نا! لیکن فکر نہ کرو، معاہدے میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جو تمہیں اس پر دستخط کرنے سے روک سکے۔''

''فرض کرو کہ میں بھی اپنے طور پر چند شقوں کا اضافہ کرنا چاہوں؟'' میری بیوی نے پوچھا۔

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور یوں ایک پختہ شادی تباہ کردیں؟''

''اس بارے میں بحث کرنا ہی فضول ہے۔'' میری بیوی نے کہا۔

''خاص طور پر اس لیے کہ یہ بات ہی مشکوک ہے، تمھاری نفسیات داں دوست کے خیالات مستقبل قریب میں اپنا لیے جائیں۔''

''مجھے بھی امید ہے، ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ انسانی رشتوں کی تضحیک ہوگی اگر ہر پانچ سال بعد شادی شدہ لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ کیا وہ واقعی ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ دستخط کرنے کے بعد بھی آپ پُریقین یا پُرسکون نہیں ہو سکتے کہ آپ نے ہولناک غلطی نہیں کی۔''

میں نے اپنی طرف آتا ہوا لیمپ اس وقت دیکھا جب بہت دیر ہو چکی تھی۔

☆☆

چشم دید

۳راہم ٹیلی ویژن اداروں نے اعلان کیا ہے کہ وہ نئے سال کے آغاز سے ہر شب ۷ر بجے سے ۹ر بجے تک ٹیلی ویژن پر جنس اور تشدد کے پروگرام نہیں دکھائیں گے۔ یہ گھنٹے وہ ''فیملی پروگراموں'' کے لیے وقف کریں گے۔

میں آپ کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے ان نوعمروں کے بارے میں زیادہ تشویش ہے جو رات کو دیر تک ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں یعنی وہ نوعمر جنھیں چھوٹے بچوں کی طرح بستر پر دھکیلا نہیں جا سکتا۔

گزشتہ ہفتے میں ایک دوست کے مکان پر اس کے بیٹے کے ساتھ ایک شو دیکھ رہا تھا۔ ولن، ڈائنامائیٹ کی چار سٹکس اور الارم کلاک کی مدد سے ٹائم بم بنا رہا تھا۔ بم بنانے والا بار یک بینی سے تمام ٹکڑے جوڑ رہا تھا۔ دوست کا نوخیز فرزند بولا ''ہوں۔ یہ تو اس طرح بنایا جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے اس سے پہلے معلوم ہی نہیں تھا کہ ٹائم بم کس طریقے سے بنایا جاتا ہے۔ یہ تو بالکل آسان ہے۔''

''مگر تم بم کیوں بنانا چاہتے ہو؟''

''تجوری اڑانے کے لیے۔ گزشتہ شب میں نے ایک بینک کے بارے میں پروگرام دیکھا تھا۔ اس میں انھوں نے دکھایا تھا۔ آپ چھت کے ذریعے چوری چھپے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔'' چور گھر میں داخل ہو گئے تھے لیکن تجوری نہیں کھول سکے تھے۔ میں آپ سے شرط لگا سکتا ہوں کہ اس بم کی مدد سے وہ یہ کام کر سکتے تھے۔''

''کیا بینک میں رات کا چوکیدار نہیں تھا؟''

''تھا، لیکن انھوں نے عملی مظاہرہ کیا تھا کہ آپ حلق پر کراٹے کی ایک ضرب لگا کر اسے کس طرح بے ہوش کر

سکتے ہیں۔ یہ دیکھیں، آپ اپنی ہتھیلی کو اس طرح سے کھڑا رکھیں اور پھر اس طریقے سے چاپ کریں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''یقیناً، اگر آپ کراٹے استعمال نہیں کرنا چاہتے تو ایک ہتھیار ہے جس میں دو ڈنڈیاں اور تار کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ آپ اسے بندے کی گردن میں ڈال کر یوں دبا دیں اور چارلی الوداع ہو گیا۔''

''یہ تم نے کہاں دیکھا۔''

''کسی پولیس شو میں۔ وہ شخص واقعی جنونی تھا۔ جب تک پولیس اس تک پہنچ پائی، وہ چھے افراد ہلاک کر چکا تھا۔ وہ شاید اسے کبھی بھی ڈھونڈ نہ پاتے اگر وہ لڑکی ان کی مدد نہیں کرتی جس پر اس نے مجرمانہ حملہ کیا تھا۔''

''انھوں نے ٹیلی ویژن پر ایک شخص کو اس لڑکی پر مجرمانہ حملہ کرتے ہوئے بھی دکھایا؟''

''بے شک۔'' میرے دوست کے بیٹے نے کسی حیرت کے بغیر جواب دیا۔ ''جب آپ کسی لڑکی پر مجرمانہ حملہ کریں تو آپ اسے ہمیشہ پیچھے سے پکڑیں اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیں تاکہ وہ چیخنے نہ پائے لیکن آپ کو یہ احتیاط بھی کرنی ہو گی کہ وہ آپ کو کاٹ نہ لے ورنہ بعد میں اس کے دانتوں کے نشانات آپ کی شناخت کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔''

''ایسے شو تم دیکھتے ہو؟''

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ بس یہی کچھ تو اس میں دکھایا جاتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ سخت سیلوفین کے ٹکڑے کی مدد سے آپ کوئی بھی تالا کھول سکتے ہیں؟ میں نے یہ طریقہ گزشتہ اتوار ہی شو میں دیکھا تھا۔ دیکھیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔''

''مجھے تم پر یقین ہے۔''

''سنیں، اگر آپ کبھی دیوالیہ ہو جائیں تو میں جانتا ہوں کہ آپ کا مکان کس طرح آگ لگا کر راکھ کر دیا جائے اور کسی کو بھنک تک نہ مل سکے گی، اور آپ بیمے کی رقم بھی وصول کر لیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے یہ بدھ کے شو میں دیکھا تھا۔ بس آپ کو صفائی کرنے والا مائع استعمال کرنا ہو گا کیوں کہ اس میں بو نہیں ہوتی اور......''

''میں نہیں جاننا چاہتا کہ میرا مکان کس طریقے سے جلا کر راکھ کیا جا سکتا ہے۔''

''اوکے! گزشتہ ہفتے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی کے علم میں آئے بغیر ٹیلی فون کس طرح ٹیپ کیا جاتا ہے۔ یہ واقعی بہت آسان ہے۔ آپ کو بس یہ کرنا ہو گا کہ اپارٹمنٹ کے تہ خانے میں چینل بکس تلاش کر کے چند تار ایڈجسٹ کر دیں۔ میں آپ کو دکھاؤں؟''

''نہیں، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے عمل کر کے دکھاؤ۔ کیا تم ٹیلی ویژن سے جرم کی ترکیبیں جاننے کے سوا کچھ اور نہیں سیکھ سکتے؟''

''پرسوں رات میں نے ایک لڑکی کو ہیروئن کا انجکشن لیتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس سے مجھے نفرت محسوس ہوئی تھی۔''

''یہ تو اچھا ہوا۔''

''وہ دیکھیں! گاڑیوں کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو فرار ہونے کے لیے کسی کار چلانے والے کی ضرورت پیش آ جائے تو میں آنکھ بند کر کے یہ کام کر سکتا ہوں اور اگر میرے پاس ایک موٹر سائیکل ہو تو پھر تو وہ مجھے کسی طرح نہیں پکڑ سکتے۔''

''یہ کھیل تماشے دیکھ کر تم ایک ہفتے میں اتنا کچھ سیکھ چکے ہو جتنا سال بھر تعلیمی ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ کر سیکھ نہیں پائے۔'' میں نے کہا۔

''آپ رک جائیں اور وہ فلم دیکھیں جو اب دکھائی جانے والی ہے۔ یہ خاص طور پر ٹیلی ویژن کے لیے بنائی گئی ہے اور اس میں آپ کو دکھایا جائے گا کہ بوئنگ ۷۴۷ کس طریقے سے اغوا کیا جاتا ہے۔''

میں نے دوست سے رخصت کی اجازت لی اور چلا آیا۔

■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

مولانا مودودی کی زیرِ نگرانی چلنے والا مواصلاتی تعلیمی ادارہ

ترجمان القرآن کی دعوت

**[قرآن کو ہاتھ میں لو
اپنی زندگی پر آزماؤ
ساری دُنیا پر چھا جاؤ]**

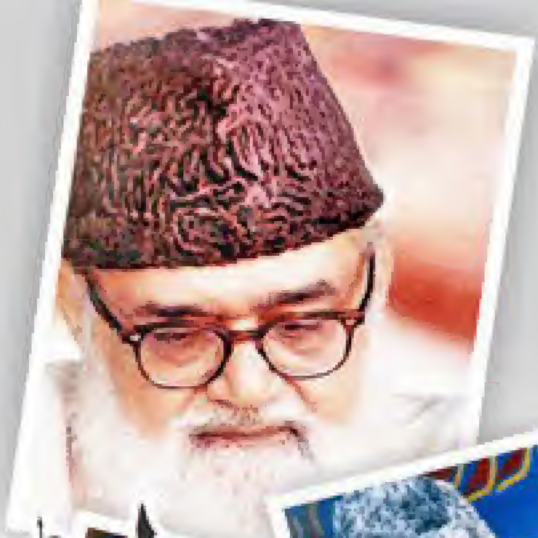

یہی اُن کا
اوڑھنا بچھونا تھا

نوید اسلام صدیقی

وہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۱ء تک ۹ رسال
انفرادی حیثیت میں تطہیر و تعمیرِ افکار کرتے رہے
تب رسالہ صرف ۲۹۸ لوگوں کے لیے چھپتا تھا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بے شک ستمبر مولانا کی پیدائش اور وفات کا مہینہ ہے

حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کی ادارت ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودیؒ نے سنبھالی اور اسے اقامتِ دین کی جدوجہد کا ذریعہ بنایا۔ قوم کے اندر تعمیرِ افکار و اصلاحِ کردار کا کام باقاعدہ شروع کیا۔ یہ ایک دیرپا، جاں گسل، صبر آزما اور جگر سوز کام تھا جو انہوں نے برسوں تک جاری رکھا۔ مالی مشکلات کے سنگین مراحل آئے لیکن وہ ہمت و جرأت اور صبر و توکل کے ساتھ اس مشکل ترین راستے پر چلتے رہے۔ سب سے پہلے ایک طویل عرصہ تک اُنھوں نے باطل کے پیدا کردہ ''نظامِ فکر اور'' حاضر و موجود'' پر سخت تنقید کرکے اس کا کھوکھلا پن نمایاں کیا۔ جو لوگ اس نظامِ فکر پر مطمئن تھے انہیں غیر مطمئن کیا۔ جو غیر مطمئن تھے ان کے سامنے مومن کی زندگی کا ایک مثبت لائحہ عمل رکھ کر انہیں یکسو کیا۔ جو یکسو ہوگئے ان میں اپنے اپنے ماحول کے اندر فکر و عمل کا انقلابی شعور بیدار کرکے اُنھیں اصلاحِ احوال اور تبدیلیِ حالات پر تیار اور آمادہ کیا اور جو آمادہ ہوگئے اُنھیں ایک نظم و ضبط کے تحت سلیقے اور تندہی سے منظم کام کرنے اور اجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ یہ کام وہ مدت تک مسلسل کرتے رہے۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وطنی اور ملکی حالات کے سبب فوری علاج کے مطالبے اٹھتے رہے لیکن وہ پہاڑ کی طرح گردوپیش سے بے نیاز مسلم قوم کی اصلاح کے ایک ہی پروگرام ''قرآن کو ہاتھ میں لو، اپنی زندگی پر آزماؤ اور ساری دنیا پر چھا جاؤ۔'' پر پیہم عمل کرتے رہے۔

مئی ۱۹۳۷ء کے شمارے میں یہ اعلان شائع ہوا:

''۱۱ ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ میں رسالہ ترجمان القرآن کا دفتر حیدر آباد سے جمال پور، ضلع گورداسپور (پنجاب) میں منتقل ہو جائے گا۔'' مولانا حیدر آباد دکن سے منتقل ہو کر پنجاب تشریف لے آئے اور '' ادارۂ دارالاسلام'' قائم کر کے اپنے مشن اور دعوت کے لیے مساعی کو تیز تر کر دیا۔

مولانا نے ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک انفرادی حیثیت سے شدید ترین مشکلات میں سے گزرتے ہوئے ۹ سال تک ترجمان القرآن کے ذریعے ابتدائی تطہیر و تعمیر افکار کا کام کیا۔ مشکلات کا آپ اس سے اندازہ کریں کہ مئی ۱۹۳۷ء کے ''اشارات'' میں مولانا لکھتے ہیں کہ پرچہ موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہا ہے۔ حیدر آباد دکن میں آخری پرچہ صرف ۴۹۸ کی تعداد میں شائع ہوا۔

ترجمان القرآن کے پہلے شمارے میں جو اُن کی زیر ادارت شائع ہوا آپ نے لکھا:

''یہ رسالہ آج جس مرحلے میں قدم رکھ رہا ہے وہ بہت کٹھن اور دشوار ہے۔ کٹھن اور دشوار اس معنی میں نہیں کہ اس کے پیش نظر اب پہلے سے زیادہ مشکل کام ہے، بلکہ اس معنی میں بھی کہ جن ہاتھوں میں وہ منتقل ہو رہا ہے وہ پہلے کام کرنے والے ہاتھوں سے زیادہ کمزور ہیں۔ ایک طرف یہ ضعیف و ناتواں ہے اور دوسری طرف پیش نظر کام یہ ہے کہ اسلام کو اس اصلی روشنی میں پیش کیا جائے جس میں قرآن کریم نے اس کو پیش کیا ہے۔ کہنے کو یہ کام بہت آسان ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مشکوٰۃ نبوت سے بعد، علم صحیح کی کمی، سلامتیٔ قلب و استعداد نظر کے فقدان، یونانی تفلسف، عجمی موشگافی، مغربی تشکیک اور سب سے بڑھ کر خود پرستی اور ہوائے نفس کے اتباع نے ہمارے اور معارف قرآنی کے درمیان ایسے پردے ڈال دیے ہیں کہ جس قرآن کو آسان کہا گیا تھا، وہ سب سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ ان حالات میں قرآن مجید کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنا ایک بڑا مشکل کام ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور والد محترم نعیم صدیقی دونوں نے ستمبر کے ستم گر مہینے میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ مولانا مودودیؒ کا انتقال ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکا میں جبکہ والد محترم ۲۵ ستمبر ۲۰۰۲ء کو فوت ہوئے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ''ترجمان القرآن'' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں لاہور میں حیدر آباد دکن سے شائع ہونے والے رسالے کی ادارت سنبھالی۔ وہ اصل میں ایک مواصلاتی تعلیمی ادارہ بن گیا۔ اس کے ابتدائی ۲ طالب علموں میں میاں طفیل محمد اور نعیم صدیقی شامل تھے۔ یہ دونوں طالب علم ترجمان القرآن کے ''کاغذی مدرسہ'' سے فیض یاب ہو کر اس قابل ہوئے کہ جب اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو دونوں نے جماعت میں شمولیت اختیار کر لی۔

☆☆

مولانا سے تعارف کے مراحل

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے والد محترم نعیم صدیقی کا پہلا تعارف مولانا کا ایک مضمون ''پیغام حق'' پڑھنے سے ہوا۔ یہ مضمون ترجمان القرآن سے نقل کیا گیا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے ترجمان القرآن بھی باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولانا سے قلبی تعلق میں مولانا کی ہر تحریر پڑھنے کے بعد اضافہ ہی ہوتا گیا۔ مولانا کی تحریروں نے ان کے دل میں مولانا سے ملنے کی تڑپ پیدا کر دی۔ اور آخر ۱۹۳۸ء میں آپ دارالاسلام میں اس عظیم ہستی کے پاس پہنچ گئے جس کے نقش قدم پر چلنے کا آپ نے فیصلہ کر لیا تھا۔

مولانا مودودیؒ کو آپ اپنا رہبر و رہنما سمجھتے تھے۔ آپ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

راہبر بھی، ہم سفر بھی، ہم نظر بھی تھا وہ شخص
اب تو سارا دور جیسے بھولا بسرا خواب تھا

دوسرے یہ کہ آپ کا اُن سے ایک خاص روحانی محبت کا رشتہ تھا۔ یہ وہ محبت ہے جو عظمت کردار ایک آدمی کے دل میں دوسرے کے لیے پیدا کر دیتی ہے۔ آپ اس ایک شعر سے اُن کی مولانا سے محبت و عقیدت کا اندازہ

کر سکتے ہیں جو کتاب 'المودودی' کے آغاز میں لکھا گیا ہے:

کہو، وہ کون حسیں ہے تمہاری بستی میں
کہ جس کے نام کے ساغر اٹھائے جاتے ہیں

تیسرا آپ کا اُن سے تعلق استاد اور شاگرد کا تھا۔ آپ نے تمام زندگی اُن کو اپنا استاد سمجھا، اس بات کو اپنے لیے اعزاز جانا۔ استادِ محترم سے ہر بات میں رہنمائی لے کر زندگی کا سفر مکمل کیا۔ مولانا کی وفات کے بعد بھی ہر قدم اُٹھاتے ہوئے مولانا کے دیے ہوئے سبق کو بھلایا نہیں اور باقاعدہ اعلان کیا کہ ہم تیرا دیا ہوا سبق کبھی نہیں بھلائیں گے:

یا سیدی! چمن کو سجائیں گے تیرے بعد
جذبوں کے تازہ پھول کھلائیں گے تیرے بعد
بن کر جئیں گے مقصدِ ''اعلیٰ'' کے ہم امیں
تیرا سبق کبھی نہ بھلائیں گے تیرے بعد

☆☆

ترجمان القرآن کی اہمیت

ترجمان القرآن کے شمارہ جولائی ۱۹۳۹ء میں مولانا لکھتے ہیں:

''اپنے دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں میں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اُس بے روح مذہبیت کا قلاوہ اپنی گردن سے اُتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اُسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حیاتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سرِ نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدی ﷺ کا مطالعہ تھا۔ اُس نے مجھے انسانیت کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے روشناس کرایا جس کی بلندی تک دنیا کے بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اُس نے انفرادی حُسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحہ زندگی (Scheme of Life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظام اسلامی بھی اُسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنا دیا ہے۔''

ترجمان القرآن کے بارے میں والد صاحب مزید آگے لکھتے ہیں ''ترجمان القرآن کو میری نگاہ میں ہمیشہ ایک ادب گاہ کی حیثیت حاصل رہی ہے کہ اس کی مجلس میں آدمی خاموشی سے داخل ہو اور کسی کونے میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرے، ایسے مجلّہ کا قاری ہونا ہزار گونہ موجبِ سعادت ہے مگر اس کی ادارت کی مسند پر بیٹھنے کا خیال آدمی کی تمام ایمانی و فکری کمزوریوں کو اس کے سامنے آراستہ کر دیتا ہے۔ یہ چھری کے بغیر ذبح (ذبح بغیر سکین) ہونے والی صورت ہے۔''

☆☆

کاغذی مدرسۂ ترجمان القرآن پہلا امتحان

ترجمان القرآن کے کاغذی مدرسہ میں پہلے امتحان کا موقع تب آیا جب ۱۹۴۸ء میں مدیرِ اعلیٰ مولانا مودودیؒ کو حکومت پاکستان نے جیل بھیج دیا۔ (یہاں اس بات کا ذکر کرتے چلیں کہ مولانا مودودیؒ کی یہ گرفتاری تفہیم القرآن جلد اول کی تکمیل کا باعث بنی۔ مولانا تفہیم القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''اب اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا سوء

اتفاق کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یکا یک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی، جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی‘‘۔ اللہ کے کام دیکھیں کس طرح وہ ایک نیک کام کی تکمیل کے لیے تدبیر کرتا ہے۔)

والد صاحب لکھتے ہیں’’ ۱۹۴۸ء میں صاحب ترجمان القرآن اور ان کے ساتھ علم و تقویٰ رکھنے والے ۲ر رفقاء (مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد) کی سیکورٹی ایکٹ کے تحت نظر بندی نے ایک ایسی حالتِ اضطراری پیدا کر دی کہ صاحب ترجمان القرآن نے اپنی رائے یہ دی کہ ترجمان القرآن کو بند کر دیا جائے۔ پھر جب حالات سازگار ہوں گے تو از سر نو دیکھا جائے مگر اپنے ہاں کے اہل الرائے حضرات جمع ہوئے اور انھوں نے مجھ میں اعتماد کو اُبھار کر اس پر آمادہ کر لیا کہ اب اس سفینۂ علم کو اپنے قلم سے کھینے کی ذمے داری مجھے لینی ہے اور میں نے اس جذبے سے کہ اپنے محاذ پر کسی بھی خالی شدہ جگہ کو خالی رکھ کر کسی کو یہ احساس نہیں دلانا ہے کہ ادارہ کفیل دو ۴ر افراد کا ہے۔ جن میں جسے بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے، کوئی نہ کوئی کام بند ہو جائے گا، اپنی استعداد سے زیادہ گراں ذمے داری کے لیے اپنے کندھے پیش کر دیے۔ غالباً یہ سلسلہ مولانا مودودیؒ کی رہائی (۱۹۵۰ء) تک جاری رہا۔ ہمت افزائی کرنے والے مخلصوں نے میری اس دور کی مساعی کی قدر افزائی کی۔ خاص طور پر یہ امر میرے لیے بہت سرمایۂ تسکین ہوا کہ خود صاحب ترجمان القرآن نے میری خدمات کے لیے اچھے الفاظ استعمال کیے اور الفاظ کے بغیر بھی میں مولانا کی نگاہوں اور ان کی پیشانی سے ان کے تاثرات پڑھ سکتا تھا۔‘‘

☆☆

ترجمان القرآن اور میاں طفیل محمدؒ

میاں صاحب نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے بتایا ’’یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے یعنی تشکیل جماعت سے پہلے۔ مستری محمد صدیق اور چودھری عبدالرحمٰن، یہ دونوں حضرات ایک دن کپورتھلہ میں میرے دفتر تشریف لائے اور مجھ سے کچھ تبادلۂ خیال کیا۔ دو تین دن بعد انھوں نے مجھے رسالہ ’’ترجمان القرآن‘‘ کا ایک پرچہ لا کر دیا۔ اس میں مولانا مودودیؒ کا مضمون ’’راہ رو پشت بمنزل‘‘ شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ جس راستے پر چل رہا ہوں وہ صحیح نہیں، بلکہ دوسرا راستہ صحیح ہے جس کی اس مضمون میں نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ مضمون بہت اہم ہے یہ ترجمان القرآن کے جنوری ۱۹۴۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، اس مضمون میں سے ایک اہم پیرا درج ذیل ہے:

’’کسی حالت کو مثالی یا آئیڈیل قرار دے کر اس کے لحاظ سے حال پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعۃً چھلانگ لگا کر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے اچانک تغیر کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہو گا مگر کسی صاحبِ عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس حالت کو مثالی حالت قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافتِ راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو، وہ فاروق اعظمؓ سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰؓ اور ابوعبیدہؓ بن الجراح اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے مثیل ہوں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزل مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابۂ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے

ہیں، بلکہ اس کے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔''

☆☆

ترجمان القرآن آغاز سفر کی یادیں

''دارالاسلام کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا فرنیچر لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ سرنا اسٹیشن سے اُسے ۲ر فرلانگ دُور لے جانا تھا۔ بالمعاوضہ حمالی کا کوئی قابلِ حصول انتظام تھا نہیں، اس لیے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں، میزیں اور دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جا سکتی تھیں، البتہ ایک بڑی الماری کا بوجھ ''اجتماعی مہم'' چاہتا تھا۔ سوا سے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے لے چلے جن میں خود مولانا مودودیؒ بھی شامل تھے۔ وہ کبھی ادھر سے سنبھالتے، کبھی ادھر سے سہارا دیتے۔ اس موقع پر خوب کہا کہ ''عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''۔

(المودودی، صفحہ ۵۹)

استاد اپنے شاگرد کی تربیت کرنے کے لیے ایک کے بعد دوسرا کام کرنے کا موقع دیتا رہا۔ والد صاحب لکھتے ہیں ''وہ لمبا عرصہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی، بالعموم بعدِ ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود املا کراتے...... کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے......لیکن سارے خطوط املا ہی نہیں کرائے جاتے تھے بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اور ان کو لکھنے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دیتے۔ اس احساسِ ذمے داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا۔ یہ مولانا کا ایک مستقل طریق تربیت تھا۔

(المودودی۔ صفحہ ۹۶)

آپ نے یہ نوٹ کیا کہ آج کی طرح اُس وقت دوپہر کو قیلولہ نہیں ہوتا تھا۔ بجلی نہ تھی، اس لیے لوڈ شیڈنگ بھی نہیں تھی، کمرے ٹھنڈے کرنے والے کولر بھی نہ تھے۔ اور کوئی جنریٹر بھی نہیں تھا، پینے کے لیے کنوئیں کا عام پانی تھا...... گرمی کا زمانہ، دوپہر کا وقت اور درخت کے سائے میں اُس مینارۂ نور (Light House) کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں جس کی مضبوطی کی آج سب ایک سے ایک آگے بڑھ کر گواہی دے رہے ہیں اور دنیا بھر میں ہزاروں لاکھوں اس مینارۂ نور سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔

آج اپنی رہائش گاہ کو دیکھیں اور ذرا تصور کریں اُن بے سرو سامان لوگوں کا جو تقسیمِ ہند کے بعد کرائے کے چھوٹے چھوٹے خیموں میں لاہور کے ایک کھلے افتادہ میدان میں پڑے ہوئے تھے۔ مولانا مودودیؒ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ لاہور کے کئی لوگ مولانا اور اُن کی فیملی کو اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرانے کے لیے درخواستیں کر رہے تھے۔ مولاناؒ ایسی پیشکشوں کے جواب میں شکریے کے ساتھ یہ کہہ کر معذرت کر دیتے تھے کہ ''ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں جنت۔ یہ بات مروّت کے خلاف ہے کہ میں یا میرے بچے تو پختہ مکانوں میں رہیں اور میرے ساتھی اور ان کے بچے خیموں میں پڑے رہیں''۔ والد صاحب اپنے اہلِ خانہ کو لے کر اپنے گاؤں خانپور (ضلع چکوال) جا سکتے تھے لیکن وہ مولانا مودودیؒ کو چھوڑ کر نہ جانا چاہتے تھے، اور دوسرے یہ کہ اُن خیموں میں محبت اور اخوت کا جو منظر تھا وہ بھی جانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ (مجھے ابھی تک یاد ہے مولانا مودودیؒ کے بچے اور ہم اُن خیموں کے درمیان آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ مولاناؒ یا کسی اور نے ہمیں کبھی ڈانٹا یا منع نہیں کیا تھا۔)

والدِ محترم کتنے خوش نصیب تھے کہ وہ دارالاسلام میں مولانا کے ساتھ کھڑے تھے جب وہاں مولانا کی پکار پر صرف ۵ر آدمی پہنچے تھے۔ لوگوں نے مولانا کے جمعہ کے خطبات اُن کی کتاب 'خطبات' میں پڑھے، والد صاحب کا یہ اعزاز ہے کہ اُنھوں نے یہ خطبات اپنے کانوں سے سنے۔ وہ اُن ۷۵ر آدمیوں میں شامل تھے جنھوں نے جماعتِ اسلامی کے تاسیسی اجلاس (منعقدہ ۲۵ر اگست ۱۹۴۱ء) میں شرکت کی۔

وہ ماچھی گوٹھ میں مولاناؒ کے ساتھ کھڑے تھے جبکہ

بڑے بڑے لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ ماچھی گوٹھ میں والدِ محترم کی تقریر نے اجلاس کی سوچ کا دھارا ہی بدل دیا تھا۔ مولانا کے پیغام، خیالات اور تجاویز کے حق میں یوں پُر زور اور موثر انداز میں بولنے والا اُس وقت کوئی دوسرا نہ تھا۔ نثر کیا شاعری کے ذریعے بھی اعلانِ حق کیا اور دھڑلے سے کیا۔ چند اشعار آپ بھی دیکھیں جو آپ کی مشہور نظم 'اے عشق خوش عناں' سے لیے گئے ہیں:

ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں، اے عشق خوش عناں!
شرطیں ہیں تیرے ساتھ، نہ تجھ سے مطالبات!
تجھ پر لٹائی ہم نے تمنا کی کائنات!
لے چل جہاں بھی چاہے کہ باری ہے تیرے ہات!
یہ دل ہے، یہ دماغ ہے، یہ جسم ہے، یہ جاں!
ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں، اے عشق خوش عناں!
چاک جگر کو بیٹھ کے اب ہم سئیں گے کیا
ہم تیرا ساتھ چھوڑ کے آخر جئیں گے کیا
اس میکدے سے روٹھ کر پھر اور پئیں گے کیا
پیش نظر نہیں ہے کوئی اور آستاں
ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں، اے عشق خوش عناں!

اور ۱۹۶۳ء میں ایوب خان کے دور میں لاہور میں جماعت اسلامی کا سالانہ اجتماع عام تھا۔ جلسہ میں سرکاری غنڈوں نے فائرنگ شروع کردی۔ مولاناؒ سے کہا گیا کہ آپ بیٹھ جائیں تو مولاناؒ نے جواب دیا (جو ایک تاریخی جواب تھا) کہ اگر میں ہی بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا۔ سٹیج پر اُس وقت والد صاحب بھی مولاناؒ کے شانہ بشانہ دوسرے اکابرین کے ساتھ کھڑے تھے۔

☆☆

مولانا مودودیؒ اور مخالفین

مولانا مودودیؒ کو اپنے دور کے نہایت گھٹیا حریفوں سے سابقہ پڑا اور زمانے نے اس داعیِ فلاح کا خیر مقدم گالیوں، پھبتیوں، الزام تراشیوں اور تکفیر و تفسیق سے کیا۔ مولانا نے ایک دفعہ ایک محفل میں کہا کہ ہم اقراری مجرم ہیں اور والد صاحب نے پوری نظم ہی لکھ دی۔ چند منتخب اشعار:

ہم لوگ اقراری مجرم ہیں!
سن اے جباری! مجرم ہیں
تن من کو نہ منڈی میں بیچا
ہم پیٹ پجاری بن نہ سکے
ذلت کے گھر کی چوکھٹ پر
عزت کے بھکاری بن نہ سکے
ہم لوگ اقراری مجرم ہیں!

مولانا مودودیؒ کا دیا ہوا ایک سبق

والد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے لکھا ''معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے ایندھن ڈھولے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے، یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریہ و مسلک پر کرنا ہوگا۔''

☆☆

نعیم صدیقی اور میاں طفیل محمد ایک دوسرے کے بارے میں کیا جذبات رکھتے تھے وہ بھی جان لیں:

نعیم صدیقی میاں صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں: ''عمر، علم اور قربانیوں کے لحاظ سے میں نے انھیں (یعنی میاں طفیل محمد) اپنے آپ سے برتر پایا۔''

میاں صاحب نے والدِ محترم کی یاد میں منصورہ میں منعقدہ ایک پروگرام میں کہا:

''صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جماعت اسلامی میں مولانا مودودیؒ کے بعد دوسرا مقام نعیم صدیقی مرحوم کا تھا اور ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ایک بے قابو ہجوم کا حصہ بنی ماں کی ٹیسوں کا ماجرا

رضوانہ سید علی

ٹیسیں

خوشبودار تازہ افطاری کے لیے اپنا بوسیدہ دوپٹا قربان کرنے والی ماں نہیں جانتی تھی کہ اُس کا اپنا بیٹا اتنی زور سے کیوں رو رہا ہے

کتے بلیوں کی دعوت جہاں کچھ انسان بھی پہنچ گئے تھے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

14th August
جذبہ آزادی سے سرشار
ترقی وطن کے لئے گامزن
فوجی فاؤنڈیشن-سماجی تحفظ کا خود کفیل اور مستحکم نظام
پاکستان بھر میں مندرجہ ذیل فلاحی خدمات انجام دے رہا ہے:
پاکستان بھر میں تقریباً 9 ملین سابق فوجیوں کی خدمت کے لئے علاج معالجے اور تعلیم کے 291 منصوبے چلاتا ہے۔
مختلف ویلفیئر پراجیکٹس کو کامیابی سے چلانے کے لئے فوجی فاؤنڈیشن ٹرسٹ اپنی کل سالانہ آمدنی کا 80% (تقریباً 6 ارب روپے سے زائد) استعمال کرتا ہے۔
55000 سے زائد طلبا میں سالانہ تقریباً 159 ملین روپے بطور وظائف تقسیم کرتا ہے۔
سال 2010-2011 میں فوجی گروپ نے قومی خزانے میں 61 ارب روپے سے زائد بطور ٹیکس لیویز اور ڈیوٹیز کی مد میں جمع کرائے۔
فوجی فاؤنڈیشن

دُلاری

نے اینٹیں کوٹتے ہوئے آپا جنتے کو آواز دے کر پوچھا۔

''آپا! روزہ رکھا؟''

''اری ہم جیسے روزے نہیں رکھیں گے تو کیا پیٹ بھرے رکھیں گے؟ میں نے تو سب چھوٹے بڑے کم بختوں کو جوتے مار مار کر اٹھایا اور روزہ رکھوا دیا۔''

''ہائے آپا! یہ تو ظلم ہے۔'' دُلاری نے ہنس کر کہا۔

''اری دُلاری کیسا ظلم؟ میں تو شکر کرتی ہوں کہ دوپہر کے کھانے سے نجات ملی۔ ویسے کئی دفعہ کم بختوں کو ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پیتے دیکھ لیتی ہوں پر ایسی بن جاتی ہوں جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔''

''ہائے آپا معصوموں سے اتنی سختی اچھی نہیں۔''

''کیا کروں؟ ٹوکرا بھر بچے اور پیٹ سب گاہے کا لے کر آئے ہیں۔ کوئی پانچ، سات روٹیوں سے کم پر راضی ہی نہیں ہوتا۔''

''روٹی پر یاد آیا۔ حکومت نے غریبوں کے لیے جو ۲۰ روپے کلو آٹے کا اعلان کیا ہے تو نے وہ خریدا؟''

جنت نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''یہ آٹا، یہ تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ رحمو کل لینے گیا تھا۔ ڈنڈے اور گالیاں کھا کر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ ابھی بھی پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا۔''

''تو ذرا جلدی جانا تھا نا۔''

''اری صبح ۹ بجے بھی جا کر دیکھ لیا۔ وہی لمبی لمبی قطاریں۔ جانے لوگ کب آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آگے والے پچیس پچاس کامیاب ہو جاتے ہیں۔ باقی دھکے، ڈنڈے کھا کر لوٹ آتے ہیں۔''

''آپا سچ کہوں؟ رحمو بھائی بالکل بدھو ہیں۔ میرے جیدے کو دیکھا۔ ۵۰ روپے ٹرک والے کے ہاتھ پر رکھے اور مزے سے ٹرک کے نیچے گھس کر سو گیا۔ صبح منہ اندھیرے چپکے سے ٹرک کے نیچے سے نکلا اور سب سے آگے۔ روز یونہی کرتا ہے۔ اب تک ہم نے ۱۲ بوری چینی اور ۱۲ بوری آٹا جمع کر لیا ہے۔ میں ۲۰ روپے زیادہ لے کر بستی والوں کے ہاتھ چپکے چپکے بیچتی رہتی ہوں۔ اپنا تو عید کا سارا خرچہ نکل آئے گا۔ آج تو چھوٹو کو بھیج دیا۔ تجھے اوروں سے سستا آٹا اور چینی دوں گی۔ آپا جو ہے اپنی۔''

☆☆

''رمضان! او رمضان۔'' شرفو نے آواز دی۔

''نوکری ٹھیک جا رہی ہے نا تیری؟''

''کہاں شرفو بھائی! تو نے مجھے کیسے لوگوں میں پھنسا دیا۔''

''ارے ارے ہمارے رمضان بھائی کو کیا مشکل پیش آگئی۔ رمضان کے مہینے میں۔''

شرفو بھائی سحری میں بھی اُبلی دال اور باسی روٹی اور افطاری میں بھی دال روٹی۔ ساتھ میں ۲ کھجوریں۔''

''اچھا میں سمجھ گیا۔ تمھارے مالک خود تو ہوٹلوں میں افطاریاں اڑاتے ہوں گے اور تمھیں ہاؤس کیپر کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔''

''ہاں وہ انچارج باجی کہتی ہے کہ مالکوں کا یہی حکم ہے۔''

''ارے تو پروا نہ کر۔ ہاں آج جب وہ تم لوگوں کو افطار کا سامان دے کر چلی جائے تو تم چپکے سے پیچھے گھس جانا۔ پھر دیکھنا کہ وہ خود کیا کیا مال اڑاتی ہے اور اپنے منہ چڑھے لوگوں کی کیا خاطر تواضع کرتی ہے۔''

''اچھا!'' رمضان حیرت سے بولا۔

''ہاں رمضان! تو ابھی نیا نیا ہے نا۔ جلد ہی سب کچھ سمجھ جائے گا۔ میں بھی اپنے مالکوں کے گھر کا انچارج ہوں۔ دنیا بھر کی نعمتیں انھوں نے ذخیرہ کر رکھی ہیں۔ پر جو نوکر دن رات خدمت کرتے ہیں۔ انھیں دیتے ہوئے دل پھٹتا ہے۔ میں بھی ان کے ساتھ وہ کرتا ہوں کہ یاد کریں گے کہ کس کے ساتھ پالا پڑا تھا کبھی۔ کئی مرتبہ تو جھاڑ پونچھ کی صافیاں اُبال کر نمک، کالی مرچ اور تھوڑا سا مکھن ملا کر ہی سامنے رکھ دیا۔ پوچھتے ہیں شرفو! اتنا لائٹ سوپ کیسے بناتے ہو؟ میں دل میں کہتا ہوں بیٹا جی اگر سچ سچ بتا دوں تو ابھی پیٹ پکڑ کر ہسپتال بھاگو گے۔ اب رمضان میں خود تو آئے دن دعوتیں اڑاتے ہیں۔ مجھے کہتے ہیں شرفو! مونگ کی دال پکوا لینا۔ شرفو! آج مسور کی دال چلے گی۔ میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سوکھا سا منہ بنا کر کہتا ہوں۔ جو حکم سرکار اور پھر مرغی روسٹ ہوتی ہے۔ سموسے، پکوڑے تلے جاتے ہیں۔ شربت بنتا ہے اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا ٹھاٹھ سے افطار کراتا ہوں۔

اوہو...... بڑے آئے کہیں کے حاتم کی قبر پر لات مارنے والے۔ شرفو! مونگ کی دال...... شرفو! مسور کی دال...... ان کی تو......“ شرفو کی تقریر جاری تھی اور رمضان منہ پھاڑے سن رہا تھا۔

☆☆

عنایت بی بی بھٹے سے مزدوری کر کے باہر نکلی تو سامنے سے اسے اپنا بیٹا آتا دکھائی دیا۔

”ارے اچھو! آج تجھے اتنی جلدی چھٹی کیسے ہو گئی؟“

”اس لیے ہو گئی کہ مالک کو افطاری نہ کرانا پڑ جائے۔ نہیں تو مغرب کے بعد بھی چھٹی مانگو تو جیسے میّا مرنے لگتی ہے۔“ اچھو جل کر بولا۔ اس کی کمر میں ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آج معمولی سی غلطی پر مالک نے اسے اپنے ۱۰ نمبر کے جوتے سے دھنک کر رکھ دیا تھا۔

”چل اچھا ہوا جو تو بھی آ گیا۔ دیکھ آج میں اس کوٹھی کے سامنے تجھے لے کر جاؤں گی۔“ عنایت بی بی نے پلو سے کاغذ کا ایک ٹکڑا کھول کر اچھو کو دیا ”رانو بتا رہی تھی کہ اس کوٹھی میں رہنے والے بڑے دیالو ہیں۔ غریبوں میں بہت اچھی افطاری بانٹتے ہیں۔“

اچھو نے بُرا سا منہ بنایا مگر چپ چاپ ساتھ چلتا رہا۔ ایک گھنٹے کی خواری کے بعد جب وہ امیروں کی بستی میں داخل ہوئے تو عنایت بی بی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کی ساری زندگی اپنی کچی بستی کی جھگی سے اینٹوں کے بھٹے کا درمیانی راستہ چلتے ہی گزر رہی تھی۔ کبھی کبھار کسی سستے بازار میں جانا ہو جاتا۔ بہرحال ٹوٹے پھوٹے گھروں، کیچڑ بھری گندی گلیوں کے سوا اس نے کبھی کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ کشادہ گلیاں، پکے گھر اور پھول پھلواری دیکھ کر وہ تو جیسے سانس لینا ہی بھول گئی۔

”ارے اچھو! ان گلیوں کی نالیاں کہاں ہیں؟ ان گھروں کا پانی کہاں جاوے ہے؟ کیا یہ نہاتے دھوتے نہیں ہیں؟“

”مجھے کیا پتا ماں۔“ بےزار سا اچھو تنک کر بولا۔ سامنے ہی وہ گھر نظر آ رہا تھا جہاں پھٹے حال لوگ جمع ہو رہے تھے۔ دونوں ماں بیٹا بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔ افطاری کا وقت کم ہی رہ گیا تھا۔

جلد ہی دروازہ کھلا۔ نوکر افطاری کے بڑے بڑے تھال لے کر باہر نکلنے لگے۔ خوراک کی خوشبو نے بھوکے ننگے لوگوں کو بےحال کر دیا۔ دودھ کے شربت کے ساوار بھی باہر لا کر رکھے گئے۔ سب ہڑبڑا کر اٹھے اور مکھیوں کی طرح ان نعمتوں کے گرد جمگھٹا کرنے لگے۔ ٹھہرو! کئی ملازم کرخت آواز میں چلائے۔ ابھی بی بی آ کر اپنے ہاتھوں سے سب چیزیں تقسیم کریں گی۔ مگر ہجوم تو بے قابو ہو چکا تھا۔ ایک ملازم کو دھکا لگا اور سموسوں کا تھال اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اسی وقت دروازہ کھول کر بی بی باہر نکلیں۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”کیسے جاہل اور ندیدے لوگ ہیں۔ ارے یہ سب تمھارے لیے ہی تو تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ملے گا، کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔ جب تک تم قطار بنانا نہیں سیکھو گے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ عبدالکریم سب پھینک دو۔ آج بلی کتے دعوت اڑائیں گے اور یہ سب منہ دیکھیں گے۔“

بی بی نے واپس لوٹتے ہوئے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ ملازموں نے واقعی سب کچھ زمین پر دے مارا۔ دودھ کے ساوار بھی الٹا دیے۔ قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔

ہجوم زمین پر گری خوراک پر ٹوٹ پڑا۔ وہ چھینا جھپٹی ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ واقعی آج کی دعوت بلی کتوں کے لیے تھی۔ عنایت بی بی نے بھی کچھ لینے کی کوشش کی تو اس کا بوسیدہ دوپٹا تار تار ہو گیا۔ اس نے اچھو کی نالائقی پر اسے ایک دھموکا لگایا تو دکھی کمر میں ایسی ٹیسیں اٹھیں کہ اچھو چیخ چیخ کر رونے لگا۔ عنایت بی بی نے آنسو بھری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا بیٹا اس قدر زور سے کیوں رو رہا ہے۔ ■

adcom 0706-12

لیاری کی ماں

کہنے کو اگر ماں سانجھی ہوتی ہے
تو پھر کہاں ہیں اس ماں کے
نوحے جس کا سب کچھ لٹ گیا

•

اور وہ لوٹنے والوں کا کچھ بھی
بگاڑ نہیں سکتی سوائے بے خودی
سے چلّانے اور آنسو بہانے کے

افشاں نوید

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

تخلیق کا اک منفرد انداز
SONICA
MOTORCYCLES
SM70
1st
ISO 14001
اب منزل ہے آسان
SONICA

تخلیق کا اک منفرد انداز
SM70
Chassis Specifications
Engine Specifications
Overall Length
Overall Width
Overall Height
Wheel Base
Ground Clearance
Frame Type
Brake
Front Tyre
Rear Tyre
Battery
Fuel Tank Capacity
Weight
Type
Intake System
Piston Displacement
Compression Ratio
Ignition
Starting System
Max. Power
Max. Torque
Clutch
Transmission
Gear Change Type

۱۶۸

ٹی وی

پر ماؤں کے عالمی دن پر آنے والے مسلسل پروگراموں کی آواز نے قلم سے ناطہ توڑ دیا

اور کھو گئی میں اس دنیا میں جہاں بس ماں ہی تھی ہر طرف۔ ''ماں، صرف ماں''۔ ہر اک دوسرے سے بڑھ کر خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔ کتنی عظیم ہے ماں۔ اسلام نے تو کہا ہی ہے لیکن یہ قوم بھی کس قدر معترف ہے اس ماں کی عظمت کی!! سب تو جانتے ہیں کہ قدموں تلے جنت ہے اس کے اور۔ اور ماں تو سانجھی ہوتی ہے نا۔ سب کی ماں ہوتی ہے؟؟ نہیں بالکل نہیں ہرگز نہیں۔ یہاں بس اپنی ماں ہی، ماں ہوتی ہے۔ اپنا گھر، گھر ہوتا ہے۔ باقی اپنا مفاد۔

اگر ماں سانجھی ہوتی ہے تو کہیں کیوں نہیں ہیں ان ماؤں کے نوحے جو اسی قوم کی مائیں ہیں۔ وہ اصغف ورجن مائیں جن سے ابھی ہفتہ کے روز میں ملی۔ سب نے دیکھے نا ان کے دکھ، پر محسوس کس نے کیا؟ کیسے کیا؟ کہیں بھی تو ذکر نہیں ان ماؤں کا!! لیاری کی وہ نوحے کرتی مائیں جن کا سب کچھ لٹ گیا۔ حافظ فواد کی ماں جو بس ۱۱ر برس کا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا حافظ بن کر عالم بنے۔ لیاری میدانِ جنگ تھا۔ بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک شکن توپوں کے حصار میں تھا۔ ایک بکتر بند گاڑی نے تین معصوم پھولوں کو لہولہو کر دیا۔ ان کا زندگی سے ناطہ توڑ دیا۔ کسی نے بھی تو اس ظلم کو ظلم نہ کہا۔ کسی نے ۱۱ر سالہ حافظ فواد کی ماں کا وہ چہرہ نہیں دیکھا جس پر آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ۱۸ر برس کا بیٹا وہ پہلے ہی کھو چکی تھی۔ جو رکشہ چلاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اندھیرے کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ لیاری میں لائٹ، پچھلے ۷ر دنوں سے نہیں ہے۔ وہ ۲ر چھوٹے کمروں کا گھر جن میں ہوا کا نام کو بھی گزر نہیں۔ دل بیٹھا جا رہا تھا اتنے رش میں اور اس بستی کے لوگ یوں بھی محصور زدہ ہیں قسمت کے ہاتھوں بھی اور سعی رائیگاں آپریشن کے ہاتھوں بھی۔ نہ آسمان زمین پر گرتا ہے نہ سمندروں میں جوار بھاٹا آتا ہے نہ زمین کا سینہ شق ہوتا ہے۔ ہاں شق ہوتا ہے تو حافظ فواد کی ماں کا سینہ، جس کی آہیں لبوں پر آ کر دم توڑ رہی ہیں۔ نیم اندھیرے کمرے، میں عورتوں کے ہجوم میں۔ مگر ان کے ''ہونے'' سے بے پروا، وہ غنودگی کے عالم میں بڑبڑا رہی ہے۔ ''حافظ فواد...... عالم فواد......!!''

اس ۳ر برس کی بچی کا دکھ نہ میڈیا نے دیکھا نہ دکھایا۔ نہ کسی این جی او کا دل دھڑکا نہ کسی حکومتی امداد کا اعلان ہوا۔ اُدھا کے مسافر جان سے گئے۔ ان کے لیے ۵۰ر لاکھ کی امداد پر غور ہو رہا ہے۔ اس تلافی کا سوچا جا رہا ہے! جانیں تو یہ بھی اتنی ہی قیمتی ہیں نا۔ یہ سب بھٹو کے متوالے، بھٹو کی حکومت میں، اس کے جیالوں کے گھروں میں جو نوحے ہیں ان کا کہیں کوئی مداوا نہیں۔ وہ ۳ر برس کی بچی...... بکتر بند کی آوازوں سے اس کی حرکت قلب بند ہوئی۔ ایک خاتون بولیں ''ایسی گھن گرج جیسے زلزلہ آ گیا ہو اور پھر اوپر سے فائرنگ۔ بچی سوتے ہوئے بیدار ہو گئی۔ چیخیں مار مار کر روتی رہی۔ اور تب اس کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ نہ ڈاکٹر کے پاس لے جا سکے نہ تدفین کو رشتے دار آ سکے، کہ لیاری میں قدم رکھنا تو اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اور وہ تیسری منزل کا گھر، جہاں سکول کی ہیڈ مسٹرس کھڑکی میں دیکھنے آئی تو موت اس کے تعاقب میں تھی۔ حادثہ سے بڑا سانحہ یہ کہ ۲ر روز اس کی لاش گھر میں پڑی رہی اور کسی کو علم بھی نہ ہو سکا۔ جب فائرنگ رکی اور کوئی گھر میں گیا تو حادثے کا علم ہوا اور اس کے اہلِ خانہ کو جو دوسری کسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے، اطلاع دی تو وہ تدفین کے لیے آئے۔ مقبوضہ کشمیر اور مقبوضہ فلسطین کے تو نہیں نا یہ نوحے بھائی! یہ ظلم کی داستانیں اور طرفہ تماشا یہ کہ فردِ جرم بھی کسی پر عائد نہیں کی جا سکتی۔

کیسے اوجھل ہو دل و دماغ سے لمحہ بھر کو غلام دستگیر کی ماں کا چہرہ جس کے ۸ر برس کے بیٹے نے ماں کا سہاگ اجڑنے پر کہا تھا ''ماں اب نہیں رونا، میں ہوں اس گھر کا باپ'' اور ۲۰ر برس تک اس نے اپنے اس قول کی لاج

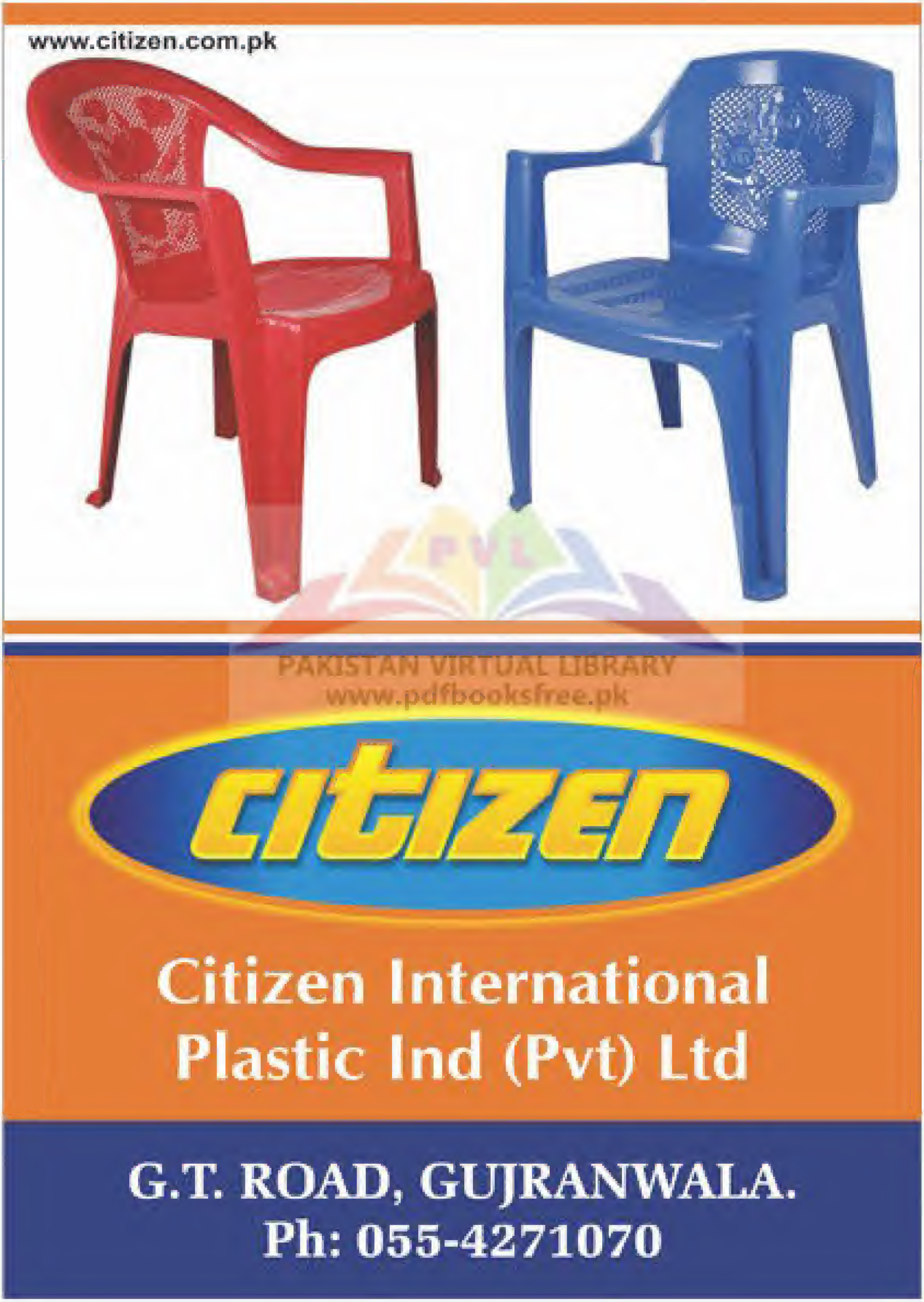

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رکھی اور محض ۲۴ برس کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا۔ سکیورٹی وردی میں ملبوس وہ خوبرو نوجوان جس کی فریم کی ہوئی تصویر پر مسلسل اس کی ماں کے آنسو گر رہے تھے۔ جو کسی گینگ وار کا حصہ نہ تھا۔ جسے کسی بھتے کی تقسیم سے کوئی غرض نہ تھی۔ جس کا قومی/صوبائی اسمبلی کی سیٹوں کی تقسیم پر کسی سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ روز دعائیں لے کر جاتا تھا میری۔ آج میرا جی نہ چاہتا تھا وہ ڈیوٹی پر جائے۔ بولا ''جس کی ماں کی دعائیں ساتھ ہوتی ہیں اس کو کیا غم ہوتا ہے۔'' پھر ۵ ربجے صحیح سلامت آگیا۔ گولیوں کی گھن گرج میں بھی۔ عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ میں نے منع کیا گولی نہ لگ جائے بولا ''ماں اللہ کے گھر سے نہ روک'' نماز پڑھ کر مسجد کے چبوترے پر بیٹھ گیا کہ سامنے سے آتی ہوئی گولی اس کے سینے کے آر پار ہوگئی۔ ہاں جب میں لمبی عمر کی دعائیں دیتی تھی تو کہتا تھا ''اماں لمبی عمر کی دعا نہ دیا کر، اچھی نہیں ہوتی زیادہ عمر''۔ کبھی کہتا تھا ''میں چکی میں پکا ہوا کوئلہ ہوں۔'' ۳ ربہن بھائیوں کو لکھایا پڑھایا، خود انٹر کیا۔ ہمیشہ محنت مزدوری کی۔ غلام دستگیر کی ماں اس کی یادوں میں کھوئی ہوئی۔ اور ہے بھی کیا اس کے پاس! بس یہی یادوں کا سرمایہ۔ جیسے نعمان کی ماں اب زندہ رہے گی تو نعمان کی یادوں کے سہارے۔

۳۰ ربرس کا نعمان جو رکشہ چلاتا تھا۔ ایک کمرے کا گھر جس پر تازہ رنگ و روغن کیا ہوا تھا۔ نعمان کی ماں بتانے لگی، پچھلے ہفتے خود اپنے ہاتھ سے رنگ و روغن کیا تھا اس کمرے میں تو پڑوس کی خالہ چھیڑنے لگیں ''کیا شادی کا ارادہ ہے؟'' اس پر جھینپ گیا۔ ہاں نعمان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس تازہ تازہ رنگ و روغن والے کمرے میں اس کی ماں کے پاس عورتوں کا ہجوم ہوگا جو اس جواں سال کے پُرسے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی ہوں گی کہ کہاں سے آئیں وہ الفاظ جو ۳۰ ربرس کے نعمان کی ماں کے زخموں کے لیے پھاہا بن سکیں۔ لُغت ہاتھ جوڑے کھڑی ہے اور ہم سب خاموش۔ کمرے میں ماں کی آواز گونج رہی ہے۔ ناشتہ چھوڑ کر گیا۔ بولا، ماں ابھی دیکھ کر آیا۔ گلی کے نکڑ پر سب ہی تو جمع تھے۔ میدان جنگ کا سماں تھا یہاں۔ بس ذرا گلی سے باہر جھانکا تھا اس نے اور گولی اس کے سر کے آر پار ہوگئی۔ ہم تو جنم جنم سے لیاری میں رہتے ہیں۔ ہم نے گینگ وار کو نہیں دیکھا۔ خدا کی قسم ہم اپنے گھر کے دروازوں پر کبھی تالا نہیں لگاتے۔ رات کو دروازے پر کنڈی بھی نہیں۔ میری بیٹی بھی تنہا دو دو دن بھی گھر پر ہو تو میرا دل مطمئن رہتا ہے کہ اک میرا اپنا نہیں، ہر گھر میں اس کے بھائی اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔

آنسو، سسکتے بلکتے اتنی داستانیں۔ لیاری کی یہ بستی اتنے قریب سے پہلی بار دیکھی تھی میں نے۔ ''پسماندگی'' جس کے گلی کوچوں کا عنوان تھی۔ چند روز قبل جنرل کیانی ''یوم شہدا'' کے موقع پر جب شہدا کے لواحقین میں اعزازات تقسیم کر رہے تھے، ان ماؤں کی مدح سرائی ہو رہی تھی جن کے بیٹے وطن پر قربان ہوتے ہیں۔ ساری دنیا انھیں ''ہیرو'' کا درجہ دے رہی تھی۔

ہاں مائیں تو یہ بھی ہیں۔ وطن پر تو یہ بیٹے بھی قربان ہوئے ہیں۔ کل کلاں مذاکرات ہوں گے۔ لیاری کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا لیکن حافظ فواد، نعمان، غلام دستگیر جیسے بچوں کی درجنوں ماؤں کو، ماؤں کا یہ عالمی دن ساری زندگی لہو کے آنسو رلاتا رہے گا۔

جو کہنے کو تو مائیں ہیں، سب کی سانجھی مائیں مگر ان کے دُکھ کا کسی کے پاس درماں نہیں، اُن کے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹنے میں نہیں آتیں کہ دُکھ دینے والے بھی سلامت ہیں اور آنسوؤں کا باعث بننے والے بھی آزاد۔

اُڑن طشتری

ایک صاحب کا سر پھوٹ گیا۔ راستے میں ایک دوست ملے۔ پیشانی پر پٹی بندھی دیکھ کر پوچھنے لگے ''کیا ہوا؟''
''اُڑن طشتری سے ٹکرا گیا۔''
''کہاں؟'' دوست نے حیران ہوکر وضاحت چاہی۔
''گھر میں۔''

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شفاء ہے

سرکہ بہترین سالن ہے۔اے اللہ تو سرکہ میں برکت ڈال کہ یہ مجھ سے پہلے نبیوںؑ کا سالن تھا اور وہ گھر غریب نہ ہوگا جس میں سرکہ موجود ہے۔ (ابن ماجہ)

T.M.
Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living

Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With Mother
100% Pure

انتہائی خالص اور پاک وصاف
WONDERFUL DRUG OF YESTERDAY & TODAY

ملک بھر سے ڈسٹری بیوٹرز درکار ہیں

ترکیب

- ایک کپ ایپل سیڈر وینیگر (Apple Cider Vinegar)
- ایک کپ خالص شہد (Raw)
- آٹھ عدد لہسن کے جوئے

قدرتی سرکہ سیب، شہد اور لہسن کو 60 سیکنڈز کے لیے بلنڈر میں مکس کریں۔ اس مکسچر کو شیشے کی بوتل میں ڈال کر فریج میں 5 دن کے لیے رکھ دیں اور پانچ دن بعد استعمال کرنا شروع کریں۔

ہر روز دو چمچ پانی کے گلاس، یا تازہ پھلوں کے جوس میں حل کر کے ناشتے سے ایک دو گھنٹے پہلے استعمال کریں۔

یہ ترکیب پٹھوں، جوڑوں کے درد، الزیمر، آرتھرائٹس، دمہ، بلڈ پریشر، Infertility، سردی، انفلشنز، موٹاپا، السر، کولیسٹرول، کینسر، بریسٹ کینسر، ایسوفیکس، جلد، معدے اور مدافعتی نظام کے لیے بہت اچھی ہے۔

- DR. ANGUS PETERS OF UNIVERSITY OF EDINBURGH'S ARTHRITIS RESEARCH INSTITUTE
- DR. RAYMOND FISH OF LONDON'S FAMOUS OBESITY RESEARCH CENTER
- DR. ETIK BLOCK OF THE STATE UNIVERSITY OF NEW YORK AT ALBANY.........

ڈاکٹر اصغر علی (ایم۔بی۔بی۔ایس) 0321-9785644, 0321-8823321
62-P مرغزار کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔
اسٹاکسٹ حضرات اس نمبر پر رابطہ کریں۔
طاہر جاوید 0321-4435960, 0423-5761796

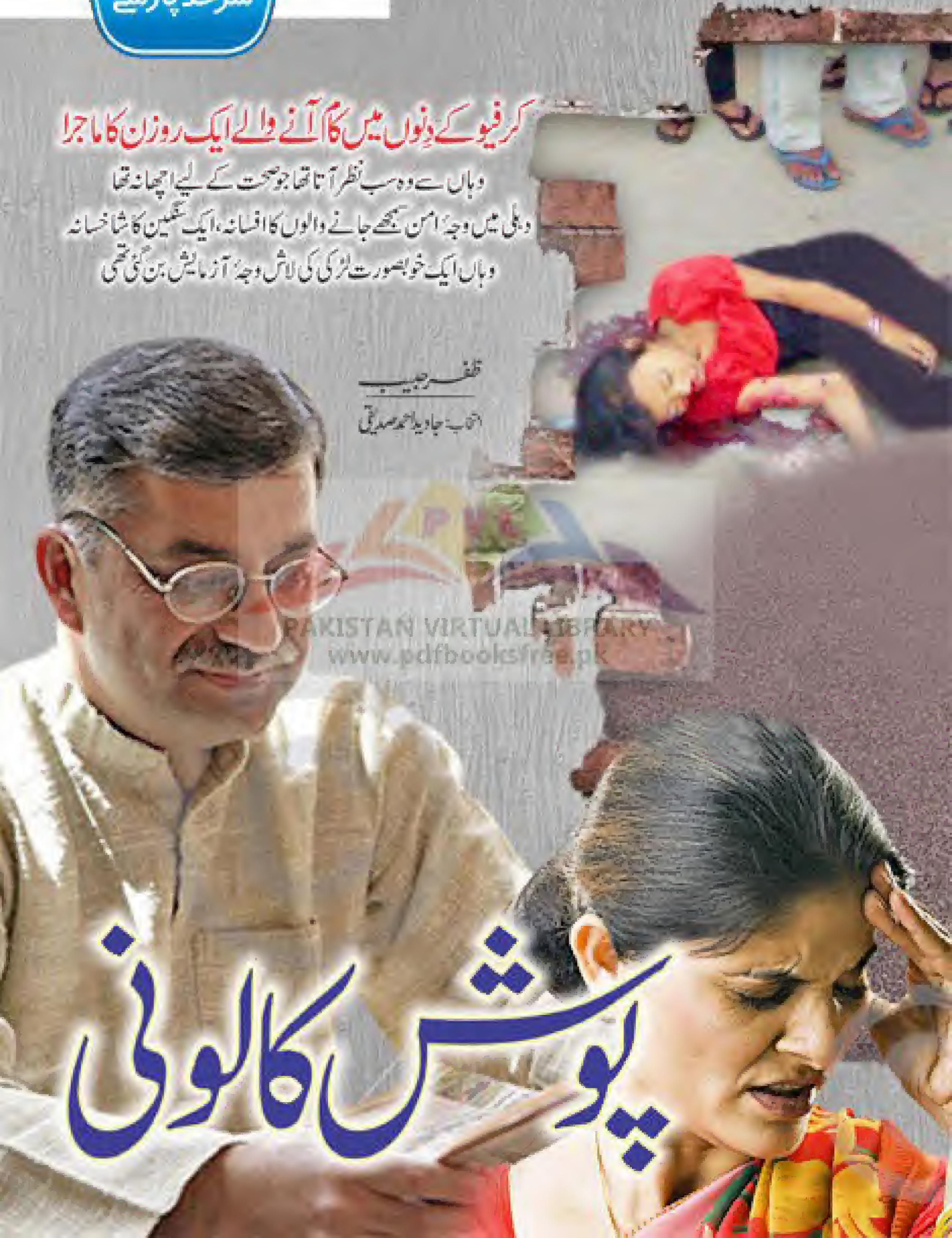

پوش کالونی

کرفیو کے دِنوں میں کام آنے والے ایک روزن کا ماجرا

وہاں سے وہ سب نظر آتا تھا جو صحت کے لیے اچھا نہ تھا
دہلی میں وجہِ امن سمجھے جانے والوں کا افسانہ، ایک سنگین کا شاخسانہ
وہاں ایک خوبصورت لڑکی کی لاش وجہِ آزمائش بن گئی تھی

ظفر حبیب

انتخاب: جاوید احمد صدیقی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

میری

بیوی جو کچھ دیر سے کرسی پر کھڑی ہو کر دیوار کے روزن سے سڑک کا تماشا دیکھ رہی تھی، اچانک ایک چیخ مار کر بیٹھ گئی اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا..... وہ کئی دن سے کچھ الجھی الجھی اور مضمحل سی تھی۔ رات بھر اسے سکون کی نیند نہیں آئی تھی اور میں ہر وقت اس کا یہ تماشا دیکھا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ کرسی سے بے ہوش ہو کر گر نہ پڑے، میں اپنی چارپائی سے ہڑبڑا کر اٹھا......

پہلا قدم اٹھانے سے قبل ہی میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر، جو اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں تھا، چھوڑ دیا اور کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا چلیے آج بھی بات آئی گئی ہو گئی۔ اس لیے پھر چارپائی پر دراز ہو کر وہ مضمون پڑھنے لگا جس کا عنوان تھا ''دنیا میں قیام امن کا مسئلہ'' مضمون ذرا طویل تھا اور میں اس کے مطالعہ میں غرق تھا کہ اسی دوران میں یہ ذرا سی مداخلت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ ذہن کی رو، جو ایک خاص ڈھنگ سے چل رہی تھی، ذرا سی دیر کے لیے ڈسٹرب ہوئی تھی۔ اس لیے میں خیال کے تانے بانے کو پھر سے سلجھا کر اس مضمون کی دنیا میں گم ہو جانے کی کوشش کرنے لگا تھا......

لیکن بیوی کے بعد بچوں نے فکری رو کے درمیان رکاوٹ کھڑی کرنی شروع کر دی تھی۔ دراصل ان لوگوں نے اپنی ماں کی چیخ سنی تھی، سر پکڑ کر اُسے بیٹھتے دیکھا تھا اور وہ لوگ یکے بعد دیگرے اُس کے اردگرد جمع ہو کر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

مجھے بچوں کا ڈسٹرب کرنا گراں گزر رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ میری بیوی اس جگہ سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ چلی جائے کہ اس کی مزاج پرسی کرنے والوں کا قافلہ اس کے ساتھ چلا جائے اور میں نامکمل مضمون کو مکمل کر سکوں...... اس کے لیے میں کبھی بچوں کو ڈانٹنا چاہ رہا تھا اور کبھی بیوی کو ہدایت دینا چاہ رہا تھا لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ سب کو دم دلاسہ دیا جائے اور ہمت باندھے رکھنے کی تلقین کی جائے۔

میرا مکان شہر کی مشہور سڑک ''دین دیال اپادھیائے روڈ'' کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جس کا پرانا نام ''جامع مسجد روڈ'' تھا۔ آزادی کے بیس برس بعد جامع مسجد کے یہاں واقع ہونے کے باوجود اس کا نام بدل دیا گیا تھا...... یہ سوال اپنی جگہ پر تھا کہ مسجد روڈ کا نام بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور نام کی یہ تبدیلی کس ذہنی اور تاریخی شعور کا پتا دیتی ہے؟ اس سڑک کے دونوں کناروں پر کئی ذات، نسل اور فرقہ کے لوگ برسوں سے آباد ہیں۔ یہ سڑک اتر سے دکھن کی سمت جاتی ہے، جس کے پچھمی کنارے پر مسجد واقع ہے اور مسجد کے آس پاس مسجد والوں کی آبادی ہے۔ اسی آبادی میں ایک گھر میرا بھی ہے۔

اس سڑک کے نام کی تبدیلی کے چند ماہ بعد ہی سڑک کے پوربی کنارے پر کچھ سکھ گھرانے بھی آ بسے تھے۔ یہاں بسنے کا یہ فیصلہ شاید اس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ یہاں کے لوگ امن پسند ہیں اور نام کی تبدیلی پر کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا ہوا تھا۔

ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں مختلف نوعیت کے بہت سارے ہنگامے کئی بار ہو چکے تھے، لیکن کبھی یہ گرم اور ناموافق ہوا ہمارے دیار میں داخل نہیں ہو سکی تھی...... یہ بات کہ پڑھتے لکھتے اور کھاتے پیتے لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کا مزاج تو رکھتے ہیں لیکن متصادم نہیں ہو سکتے، یہاں صحیح معلوم ہوتی تھی۔ یہ محلہ دراصل اس شہر کی ''پوش کالونی'' ہے۔ یہاں کے رہنے بسنے والے سب کے سب لوگ کسی نہ کسی دفتر یا ادارہ میں قیمتی کرسیوں پر بیٹھنے والے لوگ ہیں یا پھر اچھے تاجر ہیں۔ یہاں کی عورتیں ساڑھی کے ڈیزائنوں، ٹی وی کے سائزوں، کاروں اور اسکوٹروں کے رنگوں، عمارت کی سجاوٹ اور فرنیچر کی ناولٹی کے موضوعات پر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کیا کرتی تھیں۔ اپنے اپنے شوہروں سے اسی موضوع پر بحثیں، پھر دوران بحث فرمائشیں کرتے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بچوں کا رنگ بھی رام رنگ سے جداگانہ تھا۔ صبح ٹیوشن کی میز، شام سڑکوں پر چہل قدمی، جدید فیشن پر گفتگو، سنڈے کو پکچر اور فرصت کے دنوں میں پکنک یا سیر و سیاحت۔

یہ ہوا جو سمت غیب سے چلی اور جس نے سرور کا سارا چمن جلا دیا، یہ اس محلہ والوں کے لیے عام طور پر اور میری بیوی کے لیے خاص طور پر عجیب حادثہ تھا۔ وہ مصر تھی کہ کرفیو میں جیسے ہی ڈھیل دی جائے، یہاں سے نکل چلیں، جبکہ آج کرفیو کا چوتھا دن تھا۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک لگاتار کرفیو۔ ہر طرف سکوت اور گہرا سناٹا۔ دن بھی رات کی طرح بھیانک۔ بیچ بیچ میں اذان کی آواز یا پھر فائرنگ اور دھماکہ۔ یہی مختلف النوع آوازیں ۴ دنوں سے ہماری ہمدم و جلیس بنی ہوئی تھیں اور انہی آوازوں کے درمیان وقفہ میں بیوی کا یہ اصرار کہ ہم لوگ یہ محلہ چھوڑ چلیں۔

میں لگاتار سمجھا رہا تھا کہ یہ ہوا تمہارے خلاف تو نہیں؟ لیکن وہ میری یہ منطق تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ بس یہی کہتی تھی ''جو ہوا ایک بار چل چکی وہ اب بار بار چل سکتی ہے۔ کبھی اس کی زد میں دوسروں کا نشیمن ہے تو کبھی اس کی زد میں میرا بھی نشیمن آ سکتا ہے۔''

میں ان سے پوچھتا ہوں ''آخر وہ کون سی جگہ ہے کہ جہاں پہنچ کر سکون پا جائیں؟ یہ پوری دھرتی اس وقت دہشت گردی کی گرفت میں ہے۔ اسباب جدا جدا سہی، نوعیت یکساں ہے۔ عصر حاضر کی زبان اسلحہ ہے۔ اس کی آواز دھماکہ ہے اور اس کے ساز سے ہر لمحہ اجل کا نغمہ پھوٹ رہا ہے۔ پوری انسانی آبادی اس عفریت کے دائرہ اختیار میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔''

وہ کہتی ''جن لوگوں کے نشیمن آج اجاڑے جا رہے ہیں، کل تک وہ بھی تو یہی سوچ رہے ہوں گے۔ لیکن کیا آج ان کی فکر نے دوسرا رخ اختیار نہیں کیا ہوگا؟'' میں اسے سمجھانا چاہتا ''پناہ کی جگہ اب کوئی نہیں۔ یہ معاملہ جگہ کی تبدیلی سے حل ہونے والا نہیں۔ اس کا حل ذہن کی تبدیلی ہے۔ وہ ذہن جو ''مسجد روڈ'' سے ''اپادھیائے روڈ'' کا سفر کر سکتا ہے، وہ پھر مراجعت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ کیوں نہ ان متصادم لوگوں کو ''مسجد روڈ'' کی پاکیزگی بتائی جائے؟'' لیکن میری اس طرح کی بات اسے اچھی نہیں لگتی۔ وہ کہتی ''آپ عمر بھر ذہن کی تبدیلی کی بات کرتے رہیں گے اور آگ کبھی ایک گھر میں اور کبھی دوسرے گھر میں لگائی جاتی رہے گی۔'' اس کے اس جواب کی سچائی قبول کرنے کے باوجود میں اپنی فکر کے اس انداز کو بدلنے میں ناکام ہو رہا تھا کہ ذہن کی تبدیلی سارے مسائل کا حل ہے۔ ذہن کے اندر صالحیت اور انسان دوستی جس دن پیدا ہو جائے گی، سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ امن دراصل انسانی ضرورت ہے، جنگ طول نہیں پکڑ سکتی، جبکہ امن کو قیام و ثبات حاصل ہو سکتا ہے۔

کئی دنوں سے چلنے والی ان باتوں کا یہ ایک نیا موڑ تھا۔ ایک نئی چیخ تھی جس نے میرے گھر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے سارے چھوٹے چھوٹے بچے سہمے سہمے سے تھے اور ماں سے لگاتار پوچھ رہے تھے کہ اس نے کیا دیکھا تھا اور میں ''دنیا میں قیام امن کا مسئلہ'' پڑھنے کی کوشش میں دوسری بار لگ چکا تھا کہ یہی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

دوسری طرف بیوی نہ اپنی جگہ سے ہٹ رہی تھی اور نہ کچھ بول رہی تھی۔ مجبور ہو کر میں اٹھا اور جا کر اس سے

ایک شخص نے سعید بن عاص سے فی سبیل اللہ کچھ مانگا۔ سعید نے اپنے خادم سے کہا ''اسے ۵۰۰ درہم دے دو۔'' خادم اندر گیا پھر لوٹ کر آیا اور پوچھا ''۵۰۰ دینار یا ۵۰۰ درہم؟''

سعید نے کہا ''میری مراد اس وقت ۵۰۰ درہموں سے تھی مگر اب جبکہ تو نے پوچھ ہی لیا ہے تو اسے ۵۰۰ دینار ہی دے دے۔''

یہ سن کر سائل کے آنسو بہہ پڑے۔ سعید نے پوچھا ''اے شخص، تو کیوں رو رہا ہے؟''

سائل نے جواب دیا ''میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ تیرے جیسے سخی کے جسم کو مٹی کھا جائے گی۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پوچھا کہ آخر کیا ہوا؟ تم نے روزن سے کیا دیکھا؟؟ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ ''وہ لوگ جو سامنے مکان میں رہتے ہیں، ان کے پڑوسی ان کے گھر کے کواڑ توڑ کر اندر گھس گئے۔ ان کی ۱۳/۱۴ سال کی بچی کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور اس کی جانگھوں کے درمیان سنگین گھونپ دی گئی۔''

مجھے لگا کہ ان ساری باتوں میں تضاد ہے۔ اس لیے میں نے پھر بیوی سے تفتیش کی کہ بالوں کی درازی سے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ آخر وہ دونوں تو ایک ہی قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا رہن سہن ایک ہے، ان کا بزنس ایک ہے۔ ان کی گہری دوستی ہے اور وہ بچی تو ہمیشہ انھیں انکل کہا کرتی تھی۔ یہ ضرور تمھاری نگاہ کی خطا ہے لیکن بیوی نے اپنی ساری بات دہراتے ہوئے اپنی نگاہ پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ پھر بھی میں نے ایک اور سوال کیا کہ سنگین یا کوئی دوسرا ہتھیار؟ اس نے دوبارہ پُراعتماد انداز میں کہا کہ وہ کوئی دوسرا ہتھیار نہیں، سنگین ہی تھی، سنگین...... اور انھی لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کی موجودگی کو آپ وجہِ امن سمجھ رہے ہیں اور جن کی وجہ سے خود کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہیں۔

اسی دوران سائرن کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں تفتیش حال کے لیے اسی روزن سے جھانکنے لگا۔ دیکھا سچ مچ ہمارے سامنے والے مکان کی بے حد خوبصورت سی ۱۳/۱۴ سالہ بچی سڑک پر تڑپ رہی ہے۔ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے خون بہہ رہا ہے۔

دیکھتے دیکھتے کئی گاڑیاں وہاں آ کر رک گئیں۔ مختلف رنگوں کی وردیوں کے لوگ گاڑیوں سے اترے۔ سامنے کے مکان میں داخل ہوئے۔ کھینچ کھینچ کر گھر سے لاشیں نکالنے اور سڑک کے کنارے جمع کرنے لگے۔ پھر پڑوس کے ان لوگوں کا، جن کے بارے میں میری بیوی نے بتایا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا اور ان سے کچھ پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں اپنی دیوار کے روزن سے یہ سارا تماشا، جو بے حد اندوہناک تھا، کھڑا کھڑا دیکھ رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ لوگ میرے گھر کی طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں کہ اچانک میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں باہر نکلا تو وردی والے سارے لوگ مجھے گھیر کر میرے دامن پر خون کے چھینٹے تلاش کرنے لگے۔ کچھ لوگ میرے گھر کے اندر گھس گئے۔ میں لرز گیا اور اپنا گھر خدا کے سپرد کیا لیکن جلد ہی سارے لوگ خالی ہاتھ واپس آ کر میرے گرد جمع ہو گئے۔

سامنے کے وہ لوگ، جن کے بچے میرے بچوں کے ساتھ سکول جایا کرتے ہیں اور جن کی بیویوں سے میری بیوی کے گہرے مراسم تھے، بیک زبان وردی والوں کو خون کا دھبا میرے دامن پر تلاش کرنے کا اشارہ کرنے لگے۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں معلم پیشہ ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں اور اس وقت بھی محو مطالعہ تھا جب سائرن نہیں بجا تھا اور سارے لوگ پُرسکون تھے لیکن میری جانب اٹھنے والی انگلیاں لگاتار اٹھ رہی تھیں۔

میں عنقریب گرفت میں لیا جانے والا تھا۔ وردی والوں کی آواز میں کرختگی پیدا ہونے لگی تھی کہ اچانک اس بے حد خوبصورت لڑکی کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وردی والوں نے اسے دیکھا، سہارا دے کر بٹھایا اور پانی پلایا۔ ابھی چند قطرے اس کے حلق کو تر کر سکے ہوں گے کہ اس کی زبان میں لرزش ہوئی اور اس نے کہا کہ میرا پورا گھر ان پڑوسیوں نے تہِ تیغ کیا ہے جو اس وقت دوسری طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ یہ بے چارے تو شریف لوگ ہیں اور مجھے خود سنگین والوں نے مجروح کیا ہے۔

قبل اس کے کہ وہ بچی کچھ اور کہے، میں اس بچی سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ میری بیٹی ہے جو درندگی کا شکار ہوگئی ہے اور جسے اگر میں نے مارا نہیں ہے تو زندگی بھی نہیں دے سکا۔ پھر اس بچی کا سر میری گود میں ڈھلک گیا اور میں سوچنے لگا ''کیا پوش کالونی'' بھی اب محفوظ نہیں رہی؟

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

قینچی ہیئر کٹنگ

بے بس ہو جانے والے ہم رجاموں کا ماجرا

انھوں نے تھوڑی تھوڑی پونجی اور پورا لب ڈال کر ایک نئی دُکان کا آغاز کیا تھا

غلام عباس

آبادیوں کی اول بدل نے ایک دن ایک اجنبی شہر میں چار حجاموں کو اکٹھا کر دیا۔

وہ ایک چھوٹی سی دکان پر چائے پینے آئے۔ جیسا کہ مثال ہے، ہم پیشہ لوگ جلد ہی ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بہت جلد ایک دوسرے کو جان گئے۔ چاروں وطن سے لٹ لٹا کر آئے تھے۔ جب اپنی اپنی بپتا سنا چکے تو سوچنے لگے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ تھوڑی تھوڑی سی پونجی اور اپنی اپنی کسبت ہر ایک کے پاس تھی ہی۔ صلاح ٹھہری کہ چاروں مل کر ایک دکان لیں اور ساجھے میں کام شروع کر دیں۔

یہ تقسیم کے آغاز کا زمانہ تھا۔ شہروں میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دلجمعی سے کوئی کام نہ کر پاتے تھے۔ تمام کاروبار سرد پڑے ہوئے تھے، پھر بھی اُن حجاموں کو دکان کے لیے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ وہ کئی دن تک سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے اور چھوٹے چھوٹے افسروں، کلرکوں اور چپراسیوں تک کو اپنی دکھ بھری کہانی بڑھا چڑھا کر سناتے رہے۔ آخرکار ایک افسر کا دل پسیج گیا اور اس نے ان چاروں کو شہر کے ایک اہم چوک میں ایک حجام ہی کی دکان دلا دی جو ہنگامہ کے دنوں میں تالا ڈال

کر بھاگ گیا تھا۔

یہ دکان زیادہ بڑی تو نہ تھی، پر اس کے مالک نے اس میں اچھا خاصا سیلونوں کا سا ٹھاٹھ باٹھ کر رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے جوڑ اوپر سنگِ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جما، ٹیبل سے بنا لیے تھے۔ تین ایک طرف اور دو ایک طرف۔ ہر ایک ٹیبل کے ساتھ دیوار میں جڑا ہوا ایک بڑا آئینہ تھا اور ایک اونچے پایوں کی کرسی جس کے پیچھے لکڑی کا گدی دار سٹینڈ لگا ہوا تھا۔

گاہک ٹھگنے قد کا ہوا تو اسٹینڈ کو نیچے سرکا لیا، لمبے قد کا ہوا تو اونچا کر لیا اور گدی پر اس کے سر کو ٹکا کر مزے سے ڈاڑھی مونڈنے لگے۔

ضرورت کی یہ سب چیزیں مہیا تو تھیں مگر تھیں ذرا پرانے فیشن کی اور ٹوٹی پھوٹی سنگِ مرمر کی سِلوں کے کنارے اور کونے جگہ جگہ سے شکستہ تھے۔ آئینے تھے تو بڑے بڑے مگر ذرا چپکے، اس کی وجہ سے گاہکوں کو اپنی صورتیں چپٹی چپٹی سی نظر آتی تھیں۔ ایک آئینے کے بیچ میں کچھ اس طرح بل پڑ گیا تھا کہ دیکھنے والے کو اس میں بیک وقت ایک کے دو چہرے نظر آتے مگر دونوں ادھورے جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر مضحکہ خیز صورت پیدا کرتے۔ چنانچہ اس آئینے کے سامنے بیٹھنے والا اپنی گردن کو تین چار مرتبہ مختلف زاویوں پر اونچا نیچا کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ علاوہ ازیں اس دکان میں شیمپو کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

لیکن حجاموں نے ان خامیوں کا کوئی زیادہ خیال نہ کیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات ان کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ ایک دن انھیں یہ سب سامان بنا بنایا، مفت مل جائے گا۔ اپنے وطن میں وہ اب تک بڑی گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ ان میں ایک جو عمر میں سب سے بڑا تھا اور استاد کہلاتا تھا اس نے کچھ مستقل گاہک باندھ رکھے تھے جن کے گھر وہ ہر روز ایک دن چھوڑ کر ڈاڑھی مونڈنے جایا کرتا تھا۔ اس سے عمر میں دوسرے درجے پر جو حجام تھا اس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لاریوں کے اڈے بنا رکھے تھے۔ دن بھر کسبت گلے میں ڈالے ڈاڑھی بڑوں کی ٹوہ میں رہا کرتا اور دوسرے دو حجام جو نوعمر تھے ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو روپیہ یومیہ پر بھی کسی دکان میں تو کبھی کسی دکان میں کام کیا کرتے تھے۔ اب اچانک قسمت نے ان لوگوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی اور خودمختاری کا یہ موقع جو بخشا تو وہ بہت خوش ہوئے اور دکان کو اور زیادہ ترقی دینے اور اپنی حالت کو سنوارنے پر کمربستہ ہو گئے۔

سب سے پہلے ان لوگوں نے بازار سے ایک کوچی اور چونا لا کر خود ہی دکان میں سفیدی کی اور اس کے فرش کو خوب دھویا پونچھا۔ اس کے بعد نیلام گھر سے پرانے انگریزی کپڑوں کے دو تین گٹھڑ سستے داموں خریدے، ان میں سے قمیصوں اور پتلونوں کو چھانٹ کر الگ کیا۔ پھٹے کپڑوں کو سیا۔ جہاں جہاں پیوند لگانے کی ضرورت تھی وہاں پیوندکاری کی۔ جن حصوں کو چھوٹا کرنا تھا ان کو چھوٹا کیا اور یوں ہر ایک نے اپنے لیے دو دو تین تین جوڑے تیار کر لیے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کو ایک ایک چادر کی بھی ضرورت تھی جسے بال کاٹنے کے وقت گاہک کے جسم پر گردن کے نیچے لپیٹنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام تھا، مگر ان لوگوں نے شالوں، جمپروں، کوٹوں اور پتلونوں کو پھاڑ کر جیسے تیسے دو چادریں بنا ہی لیں۔ کپڑوں کے اسی ڈھیر میں انھیں ریشم کا سیاہ پردہ بھی ملا جس پر سنہرے رنگ میں تتلیاں بنی ہوئی تھیں، کپڑا تھا تو بوسیدہ مگر ابھی تک اس میں چمک دمک باقی تھی۔ اسے احتیاط سے دھو کر دکان کے دروازے پر لٹکا دیا۔

اپنے اپنے اوزار سب کے پاس تھے ہی، ان کی تو فکر نہ تھی، البتہ تھوڑے تھوڑے داموں والی کئی چیزیں خریدی گئیں مثلاً سلولائڈ کے پیالے صابن کے لیے، ڈاڑھی کے برش، پھٹکری، چھوٹی بڑی کنگھیاں، تولیے، دو تین تیز خوشبو والے دیسی تیلوں کی شیشیاں، ایک گھٹیا درجے کی کریم کی شیشی، ایک سستا سا پوڈر کا ڈبہ۔ علاوہ ازیں کباڑیوں کی دکانوں سے ولایتی لونڈر کی ٹیڑھی ترچھی خالی شیشیاں خرید ان میں سرسوں کا تیل بھر دیا۔

دکان کی آرایش کی طرف سے بھی یہ لوگ غافل نہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

رہے۔ دکان کے پہلے مالک نے اس میں نہ جانے کس زمانے کی دقیانوسی مذہبی تصویریں لٹکا رکھی تھیں، ان کو اتار ڈالا اور ان کی جگہ دو ایک پرانے امریکن فلموں کے بڑے بڑے رنگدار پوسٹر جو ایک کباڑیے کے ہاں سے لے آئے تھے، دکان کے اندر دیواروں پر چسپاں کر دیے۔ علاوہ ازیں دو تین قطعات اور ایک کیلنڈر جس میں ملک کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے فوٹو تھے، دیوار پر ٹانگ دیے۔

دکان کو جلد چلانے کے خیال سے انھوں نے اجرتیں بہت کم رکھیں۔ مروجہ اجرتوں کے نصف سے کم، چنانچہ ایک گتے پر سیاہ روشنائی سے حجامت کی اجرتیں لکھوا کر اسے دیوار پر ایسی جگہ لٹکا دیا کہ گاہک جیسے ہی دکان میں داخل ہو اس کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔

پہلے حجام نے اس دکان کا نام ''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون'' رکھا تھا۔ یہ نام دکان کی پیشانی پر جلی حروف میں انگریزی اور اردو زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ ایک بابو سے ''فینسی'' کا مطلب معلوم کر کے بہت خوش ہوئے اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسی سے کام لیا جائے۔ کوئی نیا نام رکھتے تو اس کو مٹانے اور اس کو لکھوانے پر خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی۔

جس روز باقاعدہ طور پر دکان کا افتتاح ہونا تھا، انھوں نے دوپہر کو بڑی محنت سے ایک دوسرے کی حجامتیں بنائیں، لمبی لمبی قلمیں رکھیں۔ گرم پانی سے خوب مل مل کر نہائے، صاف ستھری قمیصیں اور پتلونیں پہنیں، جن کو انھوں نے قریب کی ایک لانڈری سے دھلوایا تھا۔ بالوں میں تیل ڈالا، پٹیاں جمائیں، گردن اور چہرے پر ہلکا ہلکا پوڈر ملا اور یوں چاق و چوبند ہو، اگربتیوں کی بھینی بھینی خوشبو میں، استروں کو، جن کی دھار وہ رات بھر سلوں پر تیز کرتے رہے تھے، ہتھیلیوں پر ہلکا ہلکا پٹکتے ہوئے خود کو خدمت خلق کے لیے پیش کر دیا۔

پہلی شام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کل پانچ گاہک آئے، تین شیو اور دو بال کٹائی کے اور وہ بھی آدھ آدھ پاؤ پاؤ گھنٹے کے وقفے پر مگر یہ لوگ ذرا مایوس نہ ہوئے۔ ہر گاہک کا پُرجوش خیر مقدم کیا، اس کو بٹھانے سے پہلے کرسی کو دوبار جھاڑا پونچھا۔ اس کی ٹوپی پگڑی یا کوٹ لے کر احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ ڈاڑھی کے بال نرم کرنے کے لیے دیر تک برش سے جھاگ کو پھینٹا، بڑے نرم ہاتھ سے استرا چلایا اور اگر احتیاط کے باوجود کہیں ہلکا سا چرکا لگ بھی گیا تو بڑی چابک دستی سے خون کو صابن کے جھاگ میں چھپائے رکھا تاوقتیکہ پوری ڈاڑھی نہ مونڈ لی اور پھر اطمینان سے پھٹکری پھیر کر زخم کو نیست و نابود کر دیا۔

ایک حجام نے اس خیال سے کہ بال کاٹنے میں زیادہ وقت لگایا جائے تو گاہک خوش ہوتا ہے، ایک دفعہ بال تراش کر دوبارہ تراشنے شروع کر دیے۔ آخر میں اس نے گاہک کے سر میں تیل ڈال یوں ہلکے ہلکے مزے سے ملنا شروع کیا کہ گاہک کی آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کو محنت کا صلہ جلد ہی مل گیا۔ گاہک نے اجرت کے علاوہ ایک آنہ اسے ''بخشیش'' کے طور پر بھی دیا۔

اس شام کام کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے دیر تک دکان کھلی رکھی، پھر دکان بڑھانے کے بعد بھی وہ دیر تک جاگتے رہے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن دفتروں میں کوئی تعطیل تھی۔ صبح کو آٹھ بجے ہی سے گاہک آنے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد تو یہ کیفیت ہو گئی کہ ایک گیا نہیں کہ دوسرا آ گیا، پھر بعض دفعہ تو تین تین کاریگر بیک وقت کام میں مصروف رہے۔ رات کو دکان بڑھا کر حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں تقریباً چار چار روپے آئے۔ تیسرے روز پھر مندا رہا مگر چوتھے روز پھر گاہکوں کی گہما گہمی دیکھ کر چاروں کو یقین ہو گیا کہ دکان قطعی طور پر چل نکلی ہے۔

یہ لوگ اس اجنبی شہر میں اکیلے ہی آئے تھے لہٰذا رات کو فرش پر بستر جما دکان ہی میں پڑے رہتے۔ ایک چھوٹی سی انگیٹھی، ایک کیتلی اور دو تین روغنی پرچ پیالیاں خرید لیں۔ صبح کو دکان ہی میں چائے بناتے اور ناشتہ کرتے، دوپہر کو تنور سے دو ایک قسم کے سالن اور روٹیاں لے آتے اور چاروں مل کر پیٹ بھرتے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دکان کو قائم ہوئے ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن سہ پہر کو ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا شریف صورت آدمی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے میلے تھے، مگر پھٹے ہوئے نہ تھے۔ سر پر اس وضع کی پگڑی جیسے منشی لوگ باندھا کرتے ہیں، پاؤں میں تری کا جوتا۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس میں سفید بال زیادہ ہیں یا کالے۔ ایک گھٹیا درجے کی عینک لگائے ہوئے تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے دھاگے سے جوڑ رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ جھجکا مگر پھر بیٹھ گیا۔

ایک حجام نے پوچھا ''شیو؟''

اس نے کہا ''نہیں۔''

''بال؟''

''نہیں۔''

''اور پھر کیا چاہتے ہو؟'' استاد نے پوچھا۔

''مہربانی کرکے میرے ناخن کاٹ دو۔'' اس نے کہا۔

ناخن کٹوانے کے بعد بھی وہ شخص وہیں بیٹھا رہا۔ آخر جب ان لوگوں نے بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''صاحب میں ایک غریب مہاجر ہوں، میں اپنے وطن میں ایک بنیے کا منشی تھا اس کے ہاں راشن کارڈوں کی پرچیاں لکھا کرتا تھا اور حساب کتاب کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ وطن چھوٹا تو یہ روزگار بھی چھوٹ گیا۔ اس شہر میں کئی دن سے بے کار پھر رہا ہوں، کئی جگہ نوکری کی تلاش میں گیا مگر ہر جگہ پہلے ہی سے منشی موجود تھے۔ اگر آپ مجھے کوئی کام دلوا دیں تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گا۔ میں اس بے کاری سے ایسا تنگ آگیا ہوں کہ جو کام بھی آپ مجھے بتائیں گے دل و جان سے کروں گا۔ حساب کتاب کے کام کے علاوہ میں کھانا پکانا بھی جانتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر تھوڑی دیر یہ لوگ خاموش رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ آخر استاد نے زبان کھولی:

''دیکھو میاں! ہم خود مہاجر ہیں اور نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ تنخواہ تو ہم تم کو دینے کے نہیں، ہاں کھانا دونوں وقت ہمارے ساتھ کھاؤ بلکہ خود ہی پکاؤ کیونکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ بس تھوڑا سا اپنی دکان کو جھاڑ پونچھ دیا کرنا۔ پھر جب کہیں تمھارا کام بن جائے تو شوق سے چلے جانا، ہم روکیں گے نہیں۔''

اس شخص نے بڑی خوشی سے ان کی یہ شرط منظور کرلی۔ شکریہ ادا کیا اور وہیں رہ پڑا۔

دوسرے دن بازار سے ایلومینیم کی ایک دیگچی اور کچھ اور برتن خریدے گئے اور دکان میں ہنڈیا پکنے کا سامان ہونے لگا مگر پہلے ہی روز ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ شخص کھانا پکانا کچھ واجبی سا ہی جانتا ہے تاہم اسے نکالا نہیں گیا۔ جھاڑنے پونچھنے میں وہ کافی چست تھا۔ بازار سے سودا بھی دوڑ کر لے آتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ایک شخص جو آٹھ پہر غلامی کرنے کو تیار تھا، خط پتر لکھ سکتا تھا، حساب کتاب جانتا تھا، آقاؤں سے ادب سے پیش آتا تھا دو وقت کی روٹی پر کچھ مہنگا نہ تھا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ دکان کھلے دو مہینے ہوگئے۔ اس عرصے میں دکان نے خاصی ترقی بھی کر لی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے لیے کچھ نیا فرنیچر بھی خرید لیا تھا۔ شیمپو کے لیے بیسن وغیرہ بھی لگوا لیا تھا اور تھوڑی تھوڑی رقم ہر ایک نے بچا بھی لی تھی۔

تیسرا مہینہ ابھی آدھا گزرا تھا کہ ایک صبح ہی صبح استاد کو اپنے بیوی بچوں کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لینے لگا۔ تیسرے پہر اس کی اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے چار دن کی چھٹی لی اور بیوی بچوں کو لے آنے کے لیے روانہ ہوگیا جو کوئی ۲۰۰ میل دور کسی شہر میں اپنے کسی رشتہ دار کے دروازے پر ناخواندہ مہمان بنے پڑے تھے۔

استاد نے چار دن میں لوٹ آنے کا پکا وعدہ کیا تھا اور بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں مگر واپسی میں پورے پندرہ

www.pdfbooksfree.pk

دن لگ گئے۔ بیوی بچوں کو تو اسٹیشن کے مسافر خانے ہی میں چھوڑا اور خود دکان پر جا پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بیماریوں کی ایک طویل داستان سنائی جن میں اس کی بیوی اور چار بچے مبتلا تھے اور وہ تکلیفیں بھی بیان کیں جو بیوی بچوں کو یہاں تک لانے میں اسے اٹھانی پڑیں۔ آخر میں اس نے خرچ سے تنگی کا ذکر کیا اور روپیہ قرض مانگا۔

یہ بات تو ظاہر ہی تھی کہ جتنے روز استاد نے دکان میں کام نہیں کیا تھا اتنے روز کی آمدنی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا اور ایک کاریگر کے کم ہونے سے آمدنی بھی نسبتاً کم ہی ہوئی تھی مگر کچھ تو بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اور کچھ مروت کی وجہ سے اس کے ساتھیوں نے اسے یہ بات نہ جتائی بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ پندرہ روپے استاد کی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھے مگر وہ چپ چاپ یہ رقم لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن سے پھر چاروں آدمی کام کرنے لگے۔ تب تک تو ان کا یہ قاعدہ رہا تھا کہ گاہکوں سے اجرتیں لے لے کر اپنے پاس ہی جمع کرتے رہتے اور رات کو دکان بڑھاتے وقت ساری رقم اکٹھی کر کے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے۔ دکان کے رکھ رکھاؤ، ٹوٹ پھوٹ اور اپنے اور نوکر کے کھانے پینے پر جو رقم خرچ ہوتی اس میں وہ چاروں برابر کے ساجھی تھے مگر استاد نے دوسرے ہی دن باتوں باتوں میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ بھئی میں بیوی بچوں والا ہوں، پردیس کا معاملہ ہے، ان کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں، اس لیے رات کو میں ان کے پاس سویا کروں گا، دوسرے یہ کہ کھانا بھی میں ان کے ساتھ ہی کھایا کروں گا۔ آج سے تم کھانے پینے کے خرچ میں سے میرا نام نکال دو...... اور بھائیو! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ادھر تو تمھارے ساتھ خرچ کروں اور اُدھر گھر پر بھی۔

اس کے ساتھی یہ بات سن کر خاموش ہو رہے۔ اب استاد دوپہر کو کھانا کھانے گھر چلا جاتا جو اس نے قریب ہی کہیں لے لیا تھا دو گھنٹے بعد لوٹتا۔ رات کو بھی وہ جلد دکان بڑھوا، اپنا حصہ لے، چلتا بنتا۔

کوئی ہفتہ بھر تک یہی سلسلہ رہا مگر اس کے بعد استاد کے تینوں ساتھیوں کے طور ایک دم سے بدل گئے۔ اب وہ اکثر آپس میں کھسر پھسر کرتے اور چپکے چپکے استاد کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہتے۔ خصوصاً اس وقت جب حجامت کے بعد گاہک سے استاد اُجرت وصول کرتا وہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے کہ استاد پیسے کس جیب میں ڈالتا ہے۔

ایک رات جب استاد دکان سے رخصت ہوا تو اس کے تینوں ساتھی دیر تک جاگتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ انھیں استاد کے خلاف کئی شکایتیں تھیں جنھیں وہ اب تک بڑے صبر سے درگزر کرتے رہے تھے مگر اب، جب اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ استاد روپے پیسوں کے معاملے میں بھی کھرا نہیں ہے تو وہ صبر نہ کر سکے۔ اُنھوں نے استاد کی اس دھوکہ بازی کی روک تھام کے لیے بہت سی تجویزیں سوچیں مگر کسی پر دل نہ جما، آخر بڑی رات گئے ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی اور وہ اطمینان سے سو گئے۔

دوسرے دن جب استاد دکان پر آیا تو ان تینوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا، ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا:

''میں نے خود اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رات تم نے گاہک سے چونی لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لی حالانکہ سارے پیسے تم اپنی قمیص کی جیب میں ڈالا کرتے ہو۔''

دوسرے نے کہا، ''تم بکتے ہو۔ تم خود پکے بے ایمان ہو۔ پرسوں گاہک نے تمھیں ایک دونی اور دو اکنیاں دی تھیں۔ ایک دونی اور ایک اکنی تو تم نے جیب میں ڈال لی اور ایک اکنی چالاکی سے انگلیوں کے بیچ ہی دبائے رکھی۔''

اس پر تیسرے نے کہا ''ارے میاں لڑتے جھگڑتے کیوں ہو، جو ہوا اس کو تو کرو معاف، آیندہ کے لیے میں تمھیں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی چاہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

بھی تو اس قسم کا دھوکا نہیں کر سکے گا، وہ یہ کہ دروازے کے قریب میز کرسی ڈال دو۔ کرسی پر تو منشی کو بٹھا دو اور میز پر ایک صندوقچی رکھ دو جس کے ڈھکنے میں سوراخ ہو۔ بس گاہک حجامت کے پیسے اس صندوقچی میں خود ہی ڈال دیا کرے۔ ہم میں کوئی خود ایک پائی بھی وصول نہ کرے۔ منشی مفت میں روٹیاں بٹورا کرتا ہے اس سے یہ کام کیوں نہ لیا جائے۔ یہ اس بات کا بھی دھیان رکھے گا کہ کوئی شخص بغیر اجرت دیے نہ چلا جائے یا کھوٹے سکے نہ دے دے۔ پھر چاہو تو منشی ساتھ ساتھ کاپی میں رقمیں بھی لکھتا جائے گا۔ آخر کس لیے رکھا ہے اس کو!''

اس پر پہلے نے کہا، ''بہت ٹھیک۔ مجھے منظور ہے لیکن یہ نہیں مانے گا، بے ایمانی جو ٹھہری جی میں۔''

اس پر دوسرے نے بھنا کر کہا، ''کیوں میں کیوں نہ مانوں گا۔ اچھا ہے ایسا ہو جائے۔ جھوٹ سچ آپ ظاہر ہو جائے گا۔''

تیسرے نے استاد سے پوچھا ''کیوں استاد تمھاری کیا رائے ہے؟''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

استاد کچھ نہ کہہ سکا۔ نہ اس تجویز کے حق میں نہ اس کے خلاف۔ اس نے خاموش ہی رہنے میں مصلحت سمجھی۔

دوسرے ہی دن سے اس تجویز پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ ہر روز رات کو دن بھر کی آمدنی کا باقاعدہ حساب ہوتا اور اس میں سے ہر ایک کو پورا پورا حصہ ملتا۔ چار دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی کہ آمدنی کا حصہ بخرا روزانہ کے بجائے ہفتہ بعد کیا جائے، اس روز ہر شخص کو معقول رقم مل سکے گی۔ ہر روز جو تھوڑے تھوڑے پیسے ملتے ہیں ان سے تو کسی کی بھی پوری نہیں پڑتی۔ ہاں اگر ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی ساجھے دار کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ جائے تو وہ منشی سے پرچی لکھوا کر پیشگی لے سکتا ہے۔

استاد نے اس کی بھی مخالفت نہ کی نہ موافقت کی۔ وہ خاموش ہی رہا۔ مگر استاد اپنی خاموشی کو زیادہ دن قائم نہ رکھ سکا۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح دکان پر آ پہنچا اور چھوٹے پر استرے کی دھار گھسیٹتے ہوئے ایک دم اپنے ساتھیوں پر برس پڑا:

''بس جی بس! میں تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ انصاف کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے۔ تم نے گدھے گھوڑے کو برابر سمجھ لیا ہے۔ تم میں سے نہ تو کوئی میرے جتنا پرانا کاریگر ہے اور نہ ہنرمند، پھر ڈاڑھی مونڈنے میں میرا ہاتھ ایسا ہلکا ہے کہ ہر شخص مجھی سے ڈاڑھی منڈانا چاہتا ہے۔ میں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں کہ جب کام میں مصروف ہوتا ہوں تو وہ دکان میں آتے ہی نہیں۔ بلکہ باہر ہی باہر ٹہلتے رہتے ہیں کہ دوسرے سے ڈاڑھی نہ منڈانی پڑ جائے، پھر جہاں مجھے خالی ہوتے دیکھتے ہیں، لپک کر میری کرسی پر آ بیٹھتے ہیں۔ منشی اس بات کا گواہ ہے کہ میری روز کی کمائی تم لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب میں ہنر میں بھی تم سے بڑھ کر ہوں اور گاہک بھی زیادہ میرے ہی پاس آئیں۔ کام بھی زیادہ میں ہی کروں، کمائی بھی زیادہ میری ہی ہو تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مجھے بھی اتنا ہی ملے جتنا تم سب کو ملتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم لوگ میرا حصہ مجھے دے دو اور دکان خود سنبھال لو۔ اگر یہ نہیں تو کام کے لحاظ سے ہر ایک کی تنخواہ مقرر کر دو۔ آمدنی میں سے تنخواہیں نکال کر جتنی رقم بچے گی وہ ہم چاروں آپس میں برابر برابر بانٹ لیا کریں گے۔ اگر تم کو یہ بات منظور ہو تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں، ورنہ صاحب ایسی دکان اور ایسی ساجھے داری کو میرا دور ہی سے سلام۔ بندہ کہیں اور قسمت آزمائے گا۔ جتنے پیسے مجھے یہاں ملتے ہیں اس سے زیادہ تو میں آنکھ بند کر کے جس سیلون میں چلا جاؤں، لے سکتا ہوں۔''

استاد کی یہ تقریر اس کے تینوں ساتھیوں نے بہت غور اور توجہ سے سنی۔ اس میں کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں مثلاً ہنرمندی میں استاد واقعی ان تینوں سے کہیں بڑھ کر تھا مگر اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ ساجھے داری میں اپنی ہنرمندی کا ناجائز دباؤ ڈالے۔ جب ساجھا ہی ٹھہرا تو ہنرمندی کی کون پروا کرتا ہے۔ ساجھا ایک کنبہ کی طرح

ہے جس میں کمانے والے فرد اپنی بساط کے مطابق کنبہ کی پرورش کرتے ہیں۔ کم و بیش کمانے والوں یا نہ کمانے والوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی اور یہ استاد کی حد درجہ کم ظرفی ہے کہ وہ زیادہ ہنرمند اور کم ہنرمند کا سوال اٹھا کر ساجھے میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

استاد کی دکان سے قطع تعلق کر لینے کا مطلب بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بھاری رقم بطور معاوضہ استاد کو دینا اور یہ رقم ان کے پاس نہ تھی، دوسری صورت یہ تھی کہ یہ تینوں دکان سے علٰحدہ ہو جاتے مگر علٰحدہ ہو کر جاتے تو کہاں جاتے۔ نہ کام ہی میں ایسی مہارت تھی کہ دوسری جگہ آسانی سے نوکری مل سکتی اور نہ سر چھپانے ہی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ لہٰذا گلے شکوے تو انھوں نے بہت کیے مگر انجام کار انھوں نے استاد کی تنخواہوں والی شرط مان ہی لی۔ تنخواہیں مقرر کرنے کے مسئلے نے خاصا طول کھینچا، آخر بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ استاد کو تو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملے اور اس سے نچلے کاریگر کو ایک سو بیس، تیسرے کو سو اور چوتھے کو اسّی۔ ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ تنخواہوں کا حساب مہینے کے مہینے ہوا کرے۔

استاد دل میں بہت خوش تھا کہ بالآخر اس نے اپنا تفوق اپنے ساتھیوں پر قائم کر لیا۔ ادھر اس کے ساتھی کچھ دن پژمردہ رہے مگر پھر مہینے کے بعد ایک معقول رقم ہاتھ آنے کے خیال نے رفتہ رفتہ ان کا غم دور کر دیا اور وہ بڑی بے تابی سے مہینہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ کا دن آیا تو یہ دیکھ کر ان چاروں حجاموں کی حیرانی اور مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ پچھلے مہینے دکان سے جو آمدنی ہوئی تھی اس میں سے ان کی آدھی آدھی تنخواہیں بھی نہیں نکلتی تھیں۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا اس بات پر ہوا کہ دکان پہلے سے زیادہ ترقی پر تھی۔ گاہک بھی پہلے سے زیادہ آ رہے تھے مگر اس کے باوجود انھیں جو رقم ملی اس کا یومیہ ابتدائی دنوں کے یومیہ سے بھی کم تھا۔ منشی کے کھاتے کی جانچ پڑتال کی گئی مگر اس نے پائی پائی کا حساب بتا دیا۔ ہر شخص کی روز کی کمائی، چاروں کی روز کی کمائی، ہفتہ کی کمائی، مہینہ کی کمائی الگ الگ بھی اور مشترکہ بھی۔ پورا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ کیا مجال جو کوئی شخص اس کے حساب میں غلطی نکال سکے۔

قاعدہ ہے کہ روپیہ باہر آنے والا ہو یا بندھی ہوئی تنخواہ ہو تو انسان خواہ مخواہ اپنا خرچ بڑھا لیتا ہے، یا اس کے بھروسے قرض لے لیتا ہے۔ ان میں سے دو حجام، ایک استاد اسی امید پر محلے کے بعض دکان داروں کے مقروض ہو گئے۔ قرض خواہ کے تقاضے کا ڈر تو تھا ہی، آئندہ قرض کا دروازہ بند ہو جانے کا بھی احتمال تھا۔

اس روز رات کو جب وہ دکان بڑھانے لگے تو حد درجہ شکستہ دل اور مایوس نظر آتے تھے۔ سب سے زیادہ مسکین پن منشی کے چہرے سے ٹپک رہا تھا، ہر چند اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی، پھر بھی اپنے آقاؤں کی اس مصیبت میں وہ برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آیا اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں جھجک جھجک کر کہنے لگا:

آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے میں عمر بھر اسے نہیں بھول سکتا۔ آج آپ کو پریشان دیکھ کر میرا دل بے حد کڑھا ہے۔ اب میں آپ کو سچی بات بتاتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ جب میں اپنے وطن میں بنیے کے ہاں نوکر تھا تو ہر مہینے تنگی ترشی کر کے اپنی تنخواہ میں سے کچھ روپے بچا لیا کرتا تھا۔ چند مہینے میں خاصی پونجی جمع ہو گئی، وطن سے چلتے وقت ساتھ لیتا آیا اور یہاں ڈاکخانے میں جمع کرا دیا کہ آڑے وقت میں میرے کام آئے...... مگر اب آپ کو پریشان دیکھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے پاس روپیہ ہو اور میں اسے اپنے بھائیوں سے چھپائے رکھوں...... اگر آپ کہیں تو کل میں ڈاکخانے سے اپنا روپیہ نکال لاؤں۔ آپ اسے کام میں لائیے جب دکان کی آمدنی بڑھ جائے تو مجھے لوٹا دینا۔ میں کوئی نفع نہیں لوں گا۔

"تمھارے پاس کتنے روپیہ ہیں؟" حجاموں نے پوچھا۔ کچھ تامل کے بعد منشی نے دھیرے سے کہا، "۱۰۰ روپے!"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

دوسرے دن منشی ڈاک خانے سے سو روپے نکال لایا، اور ان سے الگ الگ رسید لے کر وہ رقم ان میں تقسیم کر دی۔ اس طرح ان کی پریشانیاں کسی قدر دور ہو گئیں مگر اگلے مہینے دکان میں اس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ تب تو یہ لوگ بہت ہی گھبرائے۔ منشی نے بڑی چھان بین کے بعد آمدنی کے کم ہونے کی یہ وجہ دریافت کی کہ چونکہ چوک کے دوسرے ہیئر کٹنگ سیلونوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی یا مندے کی وجہ سے اپنے ہاں اجرتیں کم کر دی ہیں، اس لیے وہ گاہک جو کچھ کفایت کے خیال سے ان کے ہاں لپک آئے تھے۔ اب سب سیلونوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان لوگوں نے منشی کی بات کا یقین کیا نہ کچھ کہا۔ بہرحال وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے چونکہ منشی اب کے اپنے ایک بھائی سے سو روپے قرض لے آیا تھا، اس لیے ان لوگوں کو زیادہ پریشانی نہ اٹھانی پڑی۔ تیسرے مہینے صورت حال کچھ کچھ سدھر گئی اور انھوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا مگر چوتھے مہینے آمدنی ایک دم پھر کم ہوگئی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اس دفعہ منشی نے ان کی امداد کرنے سے بالکل معذوری ظاہر کر دی۔ اس نے کہا:

"بھائیو! اگر میرے پاس روپیہ ہوتا یا میں کہیں سے لا سکتا تو میں آپ کے قدموں میں نچھاور کر دیتا۔ لیکن میرے پاس جو کچھ تھا، میں پہلے ہی آپ کی نذر کر چکا ہوں۔"

اس روز تو انھوں نے زیادہ اصرار نہ کیا مگر دوسرے دن صبح ہوتے ہی چاروں کے چاروں نے پھر منشی کو آگھیرا، جب ان کی خوشامدوں اور التجاؤں کی حد نہ رہی تو منشی نے کہا "اچھا بھائیو! شام تک صبر کرو۔"

شام ہوئی تو وہ چاروں حجاموں سے یوں مخاطب ہوا:

"صاحبو! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان کی حالت کبھی نہیں سدھرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی اپنی جو تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں، آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دکان چلے اور آپ کی پریشانیاں دور ہوں تو سب سے پہلے آپ اپنی اصلاح کیجیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ سب اپنے اپنے اخراجات کم کیجیے اور دوسرے یہ کہ اپنی اتنی ہی تنخواہیں مقرر کیجیے جتنی عام طور پر اس قسم کے سیلونوں میں ملازموں کو دی جاتی ہے۔ اگر آپ میری تجویز کی ہوئی تنخواہ منظور کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، بلکہ اس بات کا ٹھیکہ لیتا ہوں کہ ہر مہینے آپ کو پوری تنخواہ ملا کرے گی۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے کہنے پر چلیں تو آپ کو ہر مہینے کی پہلی کو پیشگی ہی تنخواہ مل جایا کرے گی۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا، اس سے آپ کو مطلب نہیں، چاہے میں چوری کروں، ڈاکہ ڈالوں۔ مگر آپ کو تنخواہ پیشگی ہی ملتی رہے گی۔ آپ نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی ہے کہ میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور بھائیو! اگر آپ کو یہ شرط منظور نہ ہو تو آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں آپ کے لیے روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد استاد نے منشی سے پوچھا:

"اچھا بتاؤ تو تم ہماری کیا کیا تنخواہ مقرر کرتے ہو؟"

منشی نے جواب دیا "گستاخی معاف! میں زیادہ سے زیادہ آپ کو اسی روپے دے سکتا ہوں۔ دوسرے نمبر والے کو ساٹھ، تیسرے کو پچاس اور چوتھے کو چالیس۔ اگر آپ لوگ یہ تنخواہیں منظور کریں تو ابھی جا کر، چاہے مجھے دُگنے تگنے سود پر قرض ہی لینا پڑے، آپ سب کے لیے دو سو تیس روپے بطور پیشگی تنخواہ کے لے آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ہر مہینے اسی طرح آپ کو پیشگی تنخواہ ملا کرے گی۔ یاد رکھو میرے دوستو یہ تنخواہیں کسی بڑے ہیئر کٹنگ سیلون کے ملازموں کی تنخواہوں سے کم نہیں ہیں۔ آپ لوگ جا کر خود دریافت کر سکتے ہیں البتہ اپنے ملازموں کو پیشگی تنخواہ دینا صرف اسی سیلون کی خصوصیت ہوگی......"

منشی کی یہ تقریر سن کر چاروں حجام گم صم سے رہ گئے اور کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا مگر یہ خاموشی بڑی صبر آزما تھی۔ انھوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر گردنیں جھکا لیں۔

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

آسٹرین کہانی

بددعا

ایک عورت کا ماجرا

اسے بددعا دینے کی طاقت حاصل ہوگئی تھی

روزے آئیوس لینڈر / محمد اکرام چغتائی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جولائی

میں اتوار کا ایک دن، آسمان ہموار طور پر سیاہی مائل نیلا تھا۔ بادل نہیں صرف دھند تھی۔ ۸ بجے ہی سورج ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ میری مریضانہ پیشین گوئی یہ تھی کہ یہ گرم ہوگا اور حبس زدہ، لیکن بالائی جانب کاہلن برگ (Kahlenberg) اور لیوپولڈس برگ (Leopoldsberg) جو کہ ویانا سے ۱۵۰۰ فٹ سے زیادہ کی بلندی پر واقع ہے، میں موسم اتنا ہی سرد ہوگا جتنا جنگلوں میں ہوا کرتا ہے۔ میں تنہا ہونا چاہتی تھی تاکہ مجھے اس مسئلے کے لیے کافی وقت مل سکے جو ایک لمبی مدت سے مجھے پریشان کر رہا تھا اور یہ کہ میں لکھ سکوں۔ میں اپنی نوٹ بک ساتھ لے گئی تھی۔

ساڑھے دس بجے میں گرنزنگ (Grinzing) میں تھی جو کہ کاہلن برگ کے بالکل نیچے واقع ہے۔ اس کے مرصع چشموں، تنگ ڈھلوانی گلیوں اور آسٹریائی زرد گھروں کی وجہ سے اس علاقے کی دلکشی اتنی جاذب نظر نہ تھی جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ گرمیوں میں گرنزنگ شہر کی شبانہ زندگی کا مرکز ہوتا ہے بلکہ مقبول ترین کشش۔ شام ہوتے ہوئے یہاں پر خالص ویانائی ماحول مہیا کیا جاتا ہے۔

مقامی شراب کے ساتھ سنطور کی تاروں کے ساتھ تھرتھراتے ویانائی بول چال میں لوک گیتوں کے ہمراہ کبھی کبھار ایسی شام ایک خاص رسم کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے جس کا ہر سیاح اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔

سواریوں سے بھری ہوئی بس کو کاہلن برگ کی چوٹی پر جانے میں تقریباً ۲۰ منٹ لگے۔ جلد ہی میں مشاہداتی چبوترے پر کھڑا تھا۔ دونوں آرام دہ بنچ موجود نہیں تھے۔ کیوں؟ ویانا جو کہ اس قسم کی چیزوں کے لیے مشہور ہے، اب ایسا کیوں ہوگیا ہے۔ ویانا ایک پُرسکون شہر سمجھا جاتا تھا، لیکن معلوم نہیں کیوں یہاں بے سکونی بڑھتی جا رہی ہے۔ نیچے شہر ایک دودھیا چادر اوڑھے سویا ہوا لگتا تھا۔ ایک دھندلا نمونہ، جس میں چمکدار سنہری منار نمایاں تھے۔ ماضی میں کھویا ہوا، یہ مونے (Monet) کے آخری دور کی کوئی تصویر لگتا تھا۔ کوئی خط، کوئی سفر بھی واضح سرحد کی تشکیل نہ کر پا رہی تھی۔ حتیٰ کہ سٹیفس اور ووٹوے (Vootive) کے گرجا گھروں کے منار بھی۔ بائیں طرف دھاگہ نما، گھومتی ہوئی روشنی کی بوچھاڑیں ڈینیوب دریا کے بہاؤ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ جھاگدار سبز لہروں نے اس تصویر کو فریم مہیا کر دیا تھا۔

یہ شہر جو دائروں میں حرکت کرتا ہے یعنی گلیاں مرکز کے اردگرد، دائروں اور لمبی پٹی اور جنگل کا دائرہ۔ کیا یہ مدوروی آتا والٹس (Walts) کا ایک نمونہ نہیں تھا؟ حتیٰ کہ سیدھے سادے لوگ، نرم لہجہ اور مترنم آوازیں، کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ والٹس نے یہاں اپنا گھر بنایا اور یوہان اسٹراس (Johann Strauss) نے ایک تہائی وقت میں اپنی دھنیں تخلیق کیں؟ ویانا کا چہرہ مہرہ ایک رقص ہی ہے؟ میں نے سوچا، لیکن کیا ساری کہانی یہی ہے؟ کیا ویانا کا کوئی زیادہ وضاحت کے ساتھ طے شدہ خاکہ نہیں ہے؟ مضبوط خطوط کے ساتھ آزادانہ طور پر سمجھا ہوا شہر کا ایک مرکز۔ یہ کافی عرصے سے محوِ خواب ہے۔ یہ جاگنا شروع ہو گیا ہے۔ ادب کے ارضی منظر پر نئی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ دوسرے فنون بھی مائل بلندی ہیں اور ان کے افق بھی وسیع ہوئے ہیں۔

زندگی کے پُرشور اور ہمہ رنگ نشانات نے چبوترے پر طوفان برپا کر رکھا ہے۔ ہوا میں مختلف زبانیں تیر رہی ہیں۔ کچھ کو میں سمجھتی اور دوسروں کی شناخت کر سکتی ہوں۔ اپنی زبان ہی کی طرح ۲ خوبصورت جاپانی خواتین نرمی سے گفتگو کر رہی ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، ہنگیرین، رومانس، شمالی جرمن، سوئس جرمن، سلاوک اور سکینڈے نیویا کی زبانوں کے ٹکڑے مجھے سنائی دیے۔ ویانا سیاحوں کا شہر بن چکا ہے۔ لیکن کیا ایک اہم شہر بھی؟ نہیں، ایک وسیع صوبائی شہر جو رات ۹ بجے بند ہو جاتا ہے۔ رات کو گلیاں واضح طور پر غیرآباد ہو جاتی ہیں۔ یہ امیرانہ طور پر مزین، گلاب کی خوشبو سے بھرا دارالحکومت، متعدد جدید عمارتوں کا شہر جو کہ موڈ کو خراب کرتی ہیں اور کچھ نواحی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

علاقے جو اپنا حسن اور دلکشی قائم رکھے ہوئے ہیں، یہ اب بھی زیریں علاقوں میں اپنا باذوق کردار قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ویانا کا مخصوص باشندہ ایک صوبائی ذہن رکھنے والا وطن پرست ہے۔ یہ مکمل طور پر محبت کرنے کے قابل، دردناک حد تک نرم خو ہے جب تک کہ اسے درباری شان وشوکت سے ملایا جائے اور اس کے وطن پرستانہ جذبات کو زخمی نہ کیا جائے۔ اگر روایتی رکھ رکھاؤ کو مناسب طور سے ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ بُرا منائے گا جو کہ ایک ضبط شدہ غصہ ہی ہوتا ہے۔ وہ آپ پر حملہ کرے گا، بدتمیزی سے کام لے گا اور بداخلاق ہو جائے گا۔ مخصوص ویانائی کے مختلف چہرے ہیں۔ وہ شائستہ ہوگا اور خبیث تابع اور گستاخ، لیورنگ اور اختناقی جو اس کے شہر اس کے ملک سے تعلق نہ رکھتا ہو، ویانا کا باشندہ اس کے نزدیک نہیں جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں کے لیے ساحرانہ طور پر منتقل کر لے گا۔ نہیں، ایک مثالی ویانائی تو ایک تجرید ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے لیکن وہ مختلف بھی ہے۔

اپنے دماغ میں اس قسم کے خیالات کو لیے ہوئے میں لیوپولڈس برگ کی طرف روانہ ہوئی، بھرپور پتوں کے ساتھ طویل درخت لمبے سائے فراہم کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مانوس چیزوں پر بھی آپ کی آنکھ ٹک جاتی ہے۔ حسب معمول جنگل سے بھرے علاقے نے اپنی دلفریبی کو محسوس کروا لیا۔ ہلتے ہوئے پتوں کے سمعی اور بصری تاثر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ لاتعداد سیاہ پرندوں، طوطوں اور دوسرے طائروں نے جو کہ گانے سے کبھی نہیں تھکتے، اس عظیم اور وسیع کمرے کی ڈھیلی ڈھالی بنی ہوئی چھت کے نیچے گھر بنا لیا ہے۔ پہلے میں نے الگ الگ درختوں پر اپنی توجہ مرکوز کی لیکن جوں جوں سبز رنگ گزرتے گئے درخت آپس میں مدغم ہوتے گئے۔ ایک اتحاد اور اتفاق پیدا کرتے ہوئے ایک واحد شکل جنگل کی صورت اختیار کر گئے۔

پھر ایک واضح دھن نے مجھے آلیا۔ یہ معززی ہرتس گروس بارٹ کا نغمہ تھا جو بگڑی ہوئی عبرانی زبان سے متعلق تھا۔ یہ نغمہ والٹز (Waltz) غنائیے پر مشتمل تھا جس کا خاتمہ لُٹزکی (Lutzky) ہے۔ اس تیز خوش الحانی سے ایک غیر رقص صورت برآمد ہوتی ہے۔ نغمہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ ''ایک دو تین'' میں نے اس سر کی طرف نصف بڑھتے ہوئے اس سے لطف اٹھایا جو بے لچک اور اس کے باوجود اجنبی حد تک ہموار ہے۔ اس نغمے نے میرے جسم کا کچھ بوجھ یقیناً ہلکا کر دیا۔ لاتعداد آوازوں نے ''ایک دو تین'' کہنے میں میرا ساتھ دیا۔ مختلف اور بار بار کی تکرار اور توقفوں کے ساتھ نغماتی پیکر اکٹھے آتے، تیرتے ہوئے جدا ہو جاتے، اڑتے ہوئے پھر اکٹھا ہو جاتے اور ایک برجستہ دھن میں ملوث ہو جاتے۔

یکایک مجھے رکنا پڑا۔ کسی چیز نے میری کمر کو چھوا تھا۔ یہ کوئی ٹھوس چیز نہیں تھی۔ دو لہروں نے جو ایک دوسروں سے چند انچوں کے فاصلے پر تھیں، میری کمر کو چھوا اور اس پر ایک دائرہ بنا دیا۔ میں نے مڑنا نہ چاہا۔ آج کوئی بدحواسی نہیں ہوگی، میں نے اپنے آپ کو حکم دیا اور اپنی ایک دو تین کی نغمگی کا تاثر بحال رکھا۔ پھر میں نے اپنے سامنے قدموں کی آواز محسوس کی اور اپنے بائیں گال پر وہی پُراسرار لمس محسوس کیا۔ میں نے دائیں طرف منہ پھیرا، تیز قدمی اختیار کی اور چند منٹوں میں ہموار فرش پر پہنچ گئی۔ میں بڑے گیٹ سے گزری، بائیں طرف زاویہ بنایا اور تنگ، لمبے چبوترے میں داخل ہو گئی جو لیوپولڈس برگ پر واقع ہے۔

یہاں پر بھی مانوس کا صدمہ موجود ہے: جنوب سے لے کر مشرق تک کا پُرفضا منظر۔ پہلے کی طرح ویانا کے مبہم خاکے سفیدی مائل دھند میں جسم کو سن کرنے والی گرمی کے نیچے بے حرکت لیٹے ہوئے ہیں۔ جبکہ چاندی کی طرح چمکنے والے میدان پر سبزے کے ٹکڑے جابجا بکھرے ہوئے۔ ڈینیوب، ایک ہموار نقرئی لکیر مدھم مدھم چمک رہی تھی۔ بائیں طرف ٹھوس بسا میرگ، درختوں بھری پہاڑیاں کلوسٹر نیو برگ (Klosterneuburg) کی طرف اترتی ہوئیں۔ اوپر والا دائیں طرف کا ہلن برگ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سے ایک سرکشانہ اور نوکیلا زاویہ اختیار کرتے ہوئے جو کہ ایک دیوقامت آرائشی پر کی طرح ہے اور اوپر، لٹکا ہوا گھڑیال نکئی کے پھول جیسی نیلی رنگت والا، جس کا سنہرا لنگن خوابناک انداز میں اپنی روشنی نیچے پھینکتا ہوا۔

میں نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ میری پیٹھ اور رخسار پر اب کوئی دباؤ باقی نہیں رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میرے تصور ہی کی کوئی اختراع رہی ہو یا مسحور کن غنائیے کی پیداوار۔ میں ارضی منظر نامے کے ساتھ تنہا تھی، میری معیت میں گلہری اتوار تھا اور میرے خیالات۔

پھر وہ لہریں موجود تھیں جو میرے رخسار کو برمے کی طرح چھید رہی تھیں۔ گھبراہٹ میں، میں واپس چبوترے کے سرے تک بھاگتی چلی گئی اور دالان سے ہوتے ہوئے ریستوران کے اندر اور اپنے لمبے قدموں میں کوئی رخنہ ڈالے بغیر کسی سایہ دار میز کی تلاش میں سرگرداں ہوئی جس کے ساتھ کسی منظر کی گنجائش بھی ہو اور جب میں نے دیکھا کہ پہلی قطار کے بائیں طرف کونے والی میز خالی ہونے جا رہی ہے تو میں اس کی طرف دوڑ پڑی اور دونوں ہاتھ والی کرسی کو پشت پر سے پکڑ لیا۔ اسی لمحے میں ایک خاتون میرے سامنے والی کرسی میں غڑاپ سے گر گئی۔ خوشی سے بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ بولی ''خوب، یوں لگتا ہے جیسے ہم نے اس علاقے کی بہترین میز حاصل کر لی ہے۔'' میں نے وہاں کھڑے ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔

''ہم'' اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے تو اسے دعوت بھی نہ دی تھی۔ مجھے تو اپنی گوشہ نشینی سے غرض تھی۔

وہ ایک عمر رسیدہ عورت تھی جس نے پرانی وضع کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے سیاہ بال تقریباً مکمل طور پر سفید ہو چکے تھے اور سامنے والے تقریباً سبھی دانت غائب تھے۔ اس کے رخسار پچکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی سیاہ آنکھیں گھماتے ہوئے پہلے نیچے بسنے والے شہر کو اور پھر مجھے دیکھا۔ ''تم بیٹھتی کیوں نہیں؟'' اس نے پُر جوش انداز میں کہا ''کیا تمھیں یہاں بیٹھنا پسند نہیں ہے؟ اس سے اچھی نشست اور کیا ہو سکتی ہے، یا کیا ہم کوئی اور میز تلاش کریں؟'' پھر وہی ''ہم''! میں پریشان ہو گئی اور ناراض بھی۔ میرے گھٹنے کانپ رہے تھے، مجھے بیٹھنا ہی پڑا۔ یہ مکروہ ہستی! قینچی کی طرح اس کی آنکھیں میری قیمتی تنہائی کو ٹکڑے ٹکڑے کیے دے رہی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں صرف ۵ منٹ رکوں گی اور پھر کسی دوسری میز پر چلی جاؤں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا، لیکن میں نے فوری طور پر سوچا کہ یہ ناشائستگی ہو گی۔ ٹھیک ہے، نصف گھنٹہ، ایک منٹ بھی اوپر نہیں۔ میں ایک آدھ لقمہ لوں گی، جب تک کہ میں یہاں ہوں۔

''بدقسمتی سے میں تھوڑی ہی دیر کے لیے آپ کے ساتھ گپ شپ کر سکتی ہوں'' میں نے کہا، ''مجھے کچھ کام کرنا ہے، لکھت پڑھت کا کام، جو کہ فوری نوعیت کا ہے، اس لیے مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔'' میں ہنس دی۔

''یقیناً تم سنجیدہ نہیں ہو، اس جگہ کام کرنے کون آتا ہے، خاص طور پر اس طرح اتوار کے دن؟ وہ تم شام کے وقت گھر پر بھی کر سکتی ہو۔ لکھنا اہم ہے، لیکن کوئی شخص اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور میں وہ شخص ہوں، ٹھیک؟ میرا نام ماری کرم ہولٹس (Marie Krumholz) ہے۔ آج میرا ساٹھواں جنم دن ہے۔'' میں نے شکست تسلیم کر لی۔ ایک آدمی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ایک تنہا فرد کی ساٹھویں سالگرہ زیادہ اہم ہے۔ میں نے اسے مبارکباد پیش کی۔

بیرا آیا۔ میں نے اسے دو نصف ابلے ہوئے انڈے اور دہی لانے کو کہا۔ مسز کرم ہولٹس نے ایک چھوٹا گلاس بیئر کا منگوایا اور اپنے تھیلے سے سور کی ران کے گوشت کا سینڈوچ نکالا۔ ''میں آج یہاں آ کر بے حد خوش ہوں، میں ویانا کے ان جنگلوں میں کئی برسوں سے نہیں آئی ہوں۔ وقت ہی نہیں تھا۔ تمام ہفتہ سخت محنت اور پھر گھر پر بھی سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ اتوار کے دنوں میں، میں آرام کرتی ہوں۔ یہاں پر تمھارے ساتھ ہونا کتنا شاندار ہے۔ ہم بور نہیں ہوں گے۔'' اس نے اس ''ہم'' میں مجھے گھرا کھینچ لیا تھا، مجھے اس کے مقناطیسی عزم کا احساس ہوا۔

''کیا تم وکیل ہو؟'' اس نے پوچھا اور متجسس نگاہوں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

سے میری طرف دیکھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بڑی بات'' اس نے گہرا سانس بھرا۔ مجھے ایک ایماندار وکیل کی ضرورت ہے۔ ان بدمعاش وکیلوں نے میرے ۲ ورثے لوٹ لیے ہیں۔ دوسرے کو تو ابھی بچایا جا سکتا ہے لیکن مجھے کوئی عمدہ وکیل کہاں سے دستیاب ہو گا؟ کوئی ہے ہی نہیں، تمھارا چہرہ ایماندارانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ جب کاہلن برگ میں میری نظر تم پر پڑی تو میں نے سوچا کہ یہ عورت مجھے انصاف دلا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وکیل ہو، چنانچہ میں نے یہاں تک تمھارا پیچھا کیا لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ تم یہودی ہو ناں؟''

''ہاں'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''میں بھی۔'' اس نے کہا، ''دراصل میں کیتھولک ہوں، میرا باپ اور اس کی بیوی بھی کیتھولک تھی لیکن میری ماں صیہونی تھی۔ یہ اس طرح ہوا: میرے باپ کی بیوی اور ایک یہودی عورت نے ۲ لڑکیوں کو جنم دیا، ایک ہی دن اور ایک ہی ہسپتال میں، دونوں مائیں اگلے روز مر گئیں۔ دونوں بچیاں غیر ارادی طور پر تبدیل ہو گئیں جیسا کہ میرے باپ کو کئی سال بعد ایک راہبہ سے معلوم ہوا جو اس وقت اس ہسپتال میں نرس تھی، چنانچہ میں ایک یہودی ماں کی بیٹی ہوں۔

قدرتی طور پر میرے باپ نے میری پرورش ایک کیتھولک کے طور پر کی لیکن میں نے خفیہ طور پر یہودی مذہب کی تعلیمات بھی حاصل کیں۔ میرا باپ مجھے کنشت میں بھی لے گیا اور اس نے مجھے ایک یہودی نام دیا، مریام (Miriam)۔ میں ایک مذہبی عورت ہوں، اتوار کو میں گرجاگھر جاتی ہوں اور سنیچر کے دن اکثر کنشت میں حاضری دیتی ہوں۔ میں یوم کپر (Yom Kippur) پر روزے رکھتی ہوں، میرے اپنے لوگ بھی ہیں، اسرائیلی'' اور اس نے اپنے بلاؤزر کے اندر سے ایک باریک طلائی زنجیر نکالی جس سے ایک سنہری ننھی صلیب اور داؤد کا ستارہ لٹک رہا تھا۔ جب میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو وہ بولی ''خدا تو وہی ہے، ہے یا نہیں؟''

کسی شاعر نے مشہور سخی ابو مرشد کی شان میں قصیدہ لکھا اور اس کے سامنے پڑھا۔ ابو مرشد نے کہا: ''اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں کہ تجھے دے سکوں لیکن ایک طریقہ ہے، وہ یہ کہ تُو مجھے قاضی شہر کی عدالت میں لے چل اور میرے خلاف ۱۰ ہزار درہم کا مقدمہ دائر کر دے۔ میں اس رقم کا اقرار کر لوں گا اور عدالت مجھے قید کی سزا دے دے گی لیکن میرے لواحقین میرا قیدی بننا ہرگز گوارا نہ کریں گے اور یقیناً رقم دے کر مجھے رہا کرا لیں گے۔

چنانچہ شاعر نے ایسا ہی کیا اور واقعتاً اُسے ۱۰ ہزار درہم مل گئے۔

میرے تجسس میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ''تم نے ہٹلر کا زمانہ کیسے گزارا؟ کیا تم نے داؤد کا ستارہ پہنے رکھا؟'' میں نے اس کی گھومتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اس نے جواباً میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''مجھے ایذا نہیں پہنچائی گئی، یاد رکھو کہ میں سرکاری طور پر کیتھولک ہوں اور اس حقیقت کا دستاویزی ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔ میں نے داؤد کا ستارہ اپنے پرس میں سی لیا تھا۔ وہ میرا نام تھا۔''

''اور وہ تمھارا ورثہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ بعد میں ہوا۔ پیچیدہ معاملہ۔ میں پہلا مقدمہ ۱۹۵۵ء میں ہار گئی اور دوسرا تھوڑا عرصہ پہلے۔ وکیلوں نے میرے خلاف ساز باز کر لی لیکن میں نے اپنا بدلہ لے لیا۔ میں پہلے ہی ان میں سے دو کو قتل کر چکی ہوں۔''

مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی۔ ایک قاتلہ؟ نہیں، وہ ایسی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ آوارہ نظر جو دفعتاً اور مسحور کن طریقے سے پتھر کی طرح ہو جاتی تھی۔ اس کی یکبارگی حرکات، ورثے کے متعلق پُراسرار مقدمے بازی اور دو مبینہ قتل، ہر چیز کسی ذہنی بیماری کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ اس نے میرے خیالات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ''نہیں، میں پاگل نہیں ہوں، یہ ایک حقیقت ہے، میں ۲ دھوکے

بازوں کی موت کی ذمہ دار ہوں۔"

"ذمہ دار ہونے سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

"میں نے انھیں بددعا دی تھی۔ جن لوگوں کو میں بددعا دیتی ہوں وہ مردہ ہو جاتے ہیں۔ میری ہمسائی اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔ جب ہم گرجاگھر سے اکٹھے آ رہے تھے، میں نے اس سے کہا: ٹھیک ہے اب میں نے وکیل ایچ پر بددعا بھیجی ہے، اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔ ۳ دن بعد وہ میرے پاس بھاگی آئی ہے اور اخبار میں چھپنے والی سانحۂ ارتحال کی خبر مجھے دکھاتی ہے۔ وکیل ایچ ایک گاڑی کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ دوسرے وکیل کو بھی جب میں نے بددعا دی تو وہ بھی تیسرے دن مر گیا تھا۔"

یہ عورت واضح طور پر توہمات کا شکار ہے۔ اس کی آنکھوں نے میری آنکھوں میں گویا شگاف ڈالتے ہوئے کہا: "تم مجھ پر یقین نہیں کر رہی، تم مجھے پاگل سمجھتی ہو؟ یا نہیں؟" میں خوش تھی کہ اس مرحلے پر بیرا اشیائے خوردنی لے آیا تھا اور اس طرح اس نے ہماری گفتگو میں خلل ڈال دیا تھا۔ میں اس کے سوالات کا جواب دینے سے گریز کر رہی تھی، چنانچہ میں نے کہا "تم نے اپنے دشمنوں کو گرجا گھر میں بددعا دی تھی اور وہ خدا نے قبول کر لی۔ تم اس کی کیا وضاحت کرتی ہو؟"

"یہ بہت آسان ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "خدا میرا باپ اور میں اس کا بچہ ہوں۔ میں نے کبھی گناہ نہیں کیا، چوری، جھوٹ، زنا کاری، میں خالص ہوں، چنانچہ اب اگر میں، اس کا معصوم بچہ، اپنے دشمن کو بددعا دیتی ہوں تو میرا باپ پہچانتا ہے کہ میں راستی پر ہوں اور وہ میری درخواست قبول کرتا ہے۔"

میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں اس سے کیونکر پیچھا چھڑا سکتی ہوں اور اس نے اس کا ایسے جواب دیا جیسے میں نے یہ بات کافی اونچی آواز میں کہی ہو: "براہ کرم ابھی مت جانا، میں تمھیں ایک راز بتانا چاہتی ہوں، میں نے اسے برباد کر دیا!"

"کسے، خدا کو؟"

"نہیں، تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو، ہٹلر کو! یقینی طور پر۔" اس نے جواب دیا اور میری طرف ملامت سے دیکھا۔ میں نے اس کے پرس پر ایک فوری نگاہ ڈالی۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور خوش ہو کر ہنسنے لگی۔ "یہاں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اور اس نے پرس کھولا اور مجھے دکھایا۔

"نہیں، میں اپنا ہتھیار پرس میں نہیں رکھتی۔ میرا ہتھیار بددعا ہے۔ خدا نے یہ مجھے اس دن ودیعت کی تھی، میرا ہتھیار یہاں ہے۔" اور اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے دل کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی آنکھیں چمک رہی تھی، وہ نوجوان لگ رہی تھی۔ اس کے رخسار سرخ اور بھرے بھرے تھے۔ اس نے جیسے ایک مقناطیسی ترنگ میری طرف پھینکی جس نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے اس سے پوچھا "وہ کون سا دن تھا جب خدا نے تمھیں بددعا کی طاقت ودیعت کی تھی؟"

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہا، "یہ کچھ اس طرح سے تھا: یہ ان دنوں کی بات ہے جب قدرتی طور پر مجھے اپنی یہودی پیدائش چھپانا پڑتی تھی، لیکن میں اپنے بہن بھائیوں کے ہمراہ دکھ برداشت کرتی تھی۔ میں نے آؤش وٹش (Auschwitz) میں کام کرنے والی ایک عورت کی زبانی سنا کہ موت کے کیمپوں میں کیا ہو رہا ہے۔ سال بہ سال میں نے اپنے لوگوں کے ہمراہ دکھ برداشت کیے حتیٰ کہ میں اسے مزید برداشت کرنے کے قابل نہ رہی۔ پھر میں نے ایک بھوک ہڑتال شروع کی۔"

"کہاں، جیل میں؟"

"نہیں، گھر پر۔ خدا کے خلاف بھوک ہڑتال۔ میں نے دعا مانگی، گریہ کیا اور اسے دھمکی دی۔ جب تک تم نے مجھے بددعا کا تحفہ نہ دیا، میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ خداوندا! مجھے طاقت دے کہ میں اسے بددعا سے تباہ کر سکوں، اپنے لوگوں کو بچانے کی طاقت۔" میں نے ۷ دن روزہ رکھا،

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

صرف پانی کے دو گھونٹ پیے۔ ساتویں دن میں بستر پر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ پھر یہ واقعہ رونما ہوا۔ ایک آواز نے واضح طور پر میرے کان میں کہا، بددعا اور برکت میں سے ایک کا انتخاب کرلو۔ اس آواز نے اسے تین بار دہرایا، پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے بددعا کو چن لیا۔ وہ فوراً میرے اندر سرایت کر گئی، زبردست طاقت بن کر، میں نے اپنے آپ کو پہلے کی نسبت طاقتور محسوس کیا۔ میں نے فوراً کپڑے پہنے اور گرجاگھر کی طرف بھاگ اٹھی۔ میں نے گھٹنوں کے بل ہو کر بددعا کی، تین بار اپنی ساری طاقت کے ساتھ۔ پھر میں بے ہوش گئی۔ میری آنکھ ہسپتال میں کھلی۔ میرا علاج اچھا ہوا تھا۔ ۲ر دن بعد میں گھر جانے کے قابل ہوئی۔ دوسرے روز، یعنی بددعا کے تیسرے دن میرے لوگ شیطان سے محفوظ ہو گئے۔''

میں جیسے خواب کی حالت میں اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنی معجزاتی بددعا میں اس کا مجنونانہ یقین، یقین جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتا ہے، یقین، جو مجھے بھی چھوت کی طرح لگ گیا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہماری زندگیاں تمھاری مرہون منت ہیں۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ اس مرحلے پر اس کی چھٹی حس ناکام ہوگئی۔

''تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔'' اس نے تلخی سے چیخ کر کہا۔ میرا خیال تھا کہ تم ان نکموں جیسے آدمیوں سے مختلف ہو جن کے سینوں میں دل نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھے دوسروں کی طرح انسان ہی سمجھوگی۔ ہاں، خدا نے اپنی مہربانی سے مجھے بددعا کا تحفہ دیا۔ ہاں بچ نکلنے والے یہودیوں کی زندگیاں میری مرہون منت ہیں، جن میں تم بھی شامل ہو۔ خدا نے میرے ذریعے شیطان ہٹلر کو تباہ کیا اور خدا کی مدد سے مجھے ان ۲ر بدمعاشوں سے نجات ملی۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے بہت نرمی سے کہا، جبکہ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ ''میں جانتی ہوں کہ میں نے وکیلوں کو بددعا دی تو میں نے گناہ کیا، لیکن میں مجبور تھی۔

تامل کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا ''مسز کرم ہولٹس، مجھے بتاؤ، تم نے برکت کیوں حاصل نہ کی جبکہ انتخاب تمھارا تھا۔''

''لیکن پہلے میرے لوگوں کا ان کے دشمن سے بچایا جانا ضروری تھا، نہیں؟'' وہ چیخی اور پہلی بار اپنا مکا میز پر دے مارا۔ میں نے سحرزدہ ہو کر اس کی کہانی سنی تھی جو یقین افروز لہجے اور زندہ حرکات کے ساتھ سنائی گئی تھی۔ میں نے اس کے طریق استدلال سے اسے ایک ناقابل تردید حقیقت سمجھتے ہوئے اس کی بددعا کو ایک مقدس آغاز تسلیم کر لیا تھا۔ میرا سوال تھا کہ ''کیا ہٹلر خدا کی برکت کے خلاف بے طاقت نہ ہو جاتا؟ کیا وہ اس کے باوجود بھی ہمارے لوگوں کی ایذا رسانی کرتا رہتا؟''

اس نے اپنی شکل بگاڑ لی، جیسے بجلی کے جھٹکے اس کی آنکھوں سے نکل کر میری آنکھوں کی طرف آنے لگے۔

ایک شخص حضرت سلیمان علیہ السّلام کے پاس آیا اور شکایت کی، یا نبی اللہ...... میرے کسی پڑوسی نے میری بطخیں چُرا لی ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ چور کون ہے؟

حضرت سلیمان علیہ السّلام نے اعلان کرا دیا کہ سب لوگ مسجد میں جمع ہو جائیں۔ جب سب لوگ مسجد میں پہنچ گئے تو آپ نے خطبہ شروع کیا اور کہا ''تم میں سے ایک شخص نے اپنے پڑوسی کی بطخیں چرا لی ہیں۔ اب وہ مسجد میں داخل ہوا ہے، اس حال میں کہ بطخ کے پَر اس کے سر پر موجود ہیں۔''

فوراً ایک شخص نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

حضرت سلیمان علیہ السّلام نے فرمایا ''اسے پکڑ لو، یہی چور ہے۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس نے دھتکارتے ہوئے کہا ''تم مجھے اس پر ملامت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ میری برکت اس قابل نہ ہوتی کہ میرے تمام لوگوں کو بچا سکتی، البتہ ایک اور صرف ایک آدمی کو تباہ کرنے کے لیے میری بددعا کافی تھی۔''

ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ارضی منظرنامے کی طرف متوجہ ہوئے۔ میں دائیں طرف اور وہ یعنی ماری میریام بائیں طرف۔ دھند کی تہ غائب ہو گئی تھی۔ عمارتوں کے مٹیالے بلاک واضح نظر آنے لگے تھے۔ تصویر میں ڈینیوب دریا نے ایک سست لیکن پیچدار لکیر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آسمان اور نشیبی وادی کا خلا بھی سست تھا۔ گہرے سرمئی بادلوں کے جھنڈ پھولے ہوئے پتوں کی طرح نیچے آ کر تیر رہے تھے۔ بجلی کی کڑک دور سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے بیرے کو بلایا۔

جب ہم جنگل کے اندر راستے پر پہنچے تو ہمارے اوپر بجلی چمک رہی تھی۔ اس کی مسلسل خاموشی کی وجہ سے میں نے منہ ہی منہ میں کہا کہ بارش شروع ہونے سے پہلے کاہلن برگ پہنچنے کے لیے ہمیں جلدی چلنا ہوگا۔ ایک دو تین آہنگ نے دوبارہ مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ پھر وہ کچھ ہوا، جس سے میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے صاف آواز میں نکلا: لا...... لا...... لا یہ میری غنائیت تھی۔ ماری میریام کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے ان ۳ر الفاظ نے مجھ پر اس کی بددعا کی کہانی اور تین قتلوں کی نسبت زیادہ اثر کیا تھا۔ پہلے تو یہ مجھے ایک واہمہ لگا، اس کے تخیل ہی کی پیداوار، پھر ایک خواب آلود حالت میں جو کہ بعد میں طاری ہو گئی، مجھے ایک گیرندہ آثار نظر آیا لیکن لا...... لا...... لا...... ایک حقیقت تھا۔ میں نے اسے سنا تھا۔ یہ ایک چھوٹی غلیظ اور بوڑھی عورت کون تھی؟ ایک پیغمبرہ؟ ''ابھی جو تم نے گنگنایا وہ کیا تھا؟'' میں نے ہانکتے ہوئے کہا۔ ''گنگنایا؟ اوہ، مجھے نہیں معلوم یونہی مجھے ایک نغمہ یاد آ گیا تھا۔'' اور پھر اس نے غیر مبہم طور پر اسے دہرایا، لا...... لا...... لا...... میرے خدا! کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ اس کی بددعا ہی کی طرح

میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اس وقت بہت اندھیرا ہو چکا تھا۔ تقریباً گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ یکایک میریام نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ ''شیطان، میں اپنے لوگوں کو نہ بچاتی اور برکت لے لیتی؟'' اور وہ بھاگ کر چند قدم سے آگے ہو گئی۔ اگرچہ اس نے زیادہ زور سے مجھے نہ مارا تھا لیکن پھر بھی میں لڑکھڑا گئی تھی۔ میرا گال زخمی نہ ہوا تھا لیکن میں نے صرف اس کے ہاتھ کا خاکہ سا اپنے چہرے پر ایک برقی رو کی طرح محسوس کیا تھا۔ شرمندہ اور مکمل طور پر مشکوک سی ہو کر میں اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

ایک واحد قطار میں ہم نے تیزی کے ساتھ یہ تاریک اور لمبا سفر طے کیا۔ پہاڑی پر پہنچتے سے فوراً ہی پہلے بارش کا پہلا قطرہ گرا۔ پھر ماری میریام نے مجھ پر اپنا آپ پھینک کر مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ ''خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا، معاف کر دینا، تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں اسے اس دن سے ہی جانتی تھی لیکن تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی، تمہارے لبوں سے اپنی پھٹکار سننا بہت تکلیف دہ تھا۔ تم میری وکیل صفائی نہیں بلکہ وکیل استغاثہ تھی اور شاید تم اس مقدمے میں خدا کی وکیل تو نہیں ہو؟ طوفان باد و باراں اپنی پوری غضب ناکی سے ہم پر اتر آیا تھا۔ ماری میریام نے مجھے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی تھی۔ ''میرا ارادہ کاہلن برگ کے گرجا گھر جا کر تمھیں بددعا دینے کا تھا لیکن اب میں ایسا نہیں کر سکتی۔ کسی کو بھی بددعا نہیں دے سکتی۔ بددعا کی طاقت مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ میں مکمل طور پر خالی ہو چکی ہوں۔ برکت! میں اس کے لیے پھر سات دن کا روزہ رکھوں گی۔ خدا حافظ!'' وہ بڑبڑائی اور جیسا کہ بارش دھڑا دھڑ برس رہی تھی وہ آخری سیڑھی تک بھاگتی ہوئی گئی اور زمین کے متوازی پہنچ کر بائیں طرف کو واقع چھوٹے سے گرجا گھر میں داخل ہو گئی جو اس وقت کھلا تھا۔

تیز بارش کی وجہ سے میں بھیگ چکی تھی اور اسی حالت میں، میں نے اپنی بس پکڑی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جیکی

نمیبیا میں بسنے والے ایک خاندان کا سچا واقعہ
انھیں ایک تیندوے کے زخمی بچے سے واسطہ پڑ گیا تھا

ماریون رٹر

PAKISTANVIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

میرے والدین کا تعلق برطانیہ سے تھا، لیکن میں شمال مشرقی نمیبیا میں پیدا ہوئی۔ وہاں میرے والدین کا ایک بہت بڑا فارم تھا۔ چونکہ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی، لہٰذا جب وہ چل بسے، تو فارم میری ملکیت بن گیا۔ اس کا انتظام تاہم میرے شوہر، رالف نے سنبھالا اور بڑی خوبی سے!

یہ ۱۵ سال قبل کی بات ہے، ہمارا ایک تنومند بکرا رسی توڑ کر نکل بھاگا۔ میرے شوہر تین ملازمین کے ہمراہ اس کی تلاش میں نکلے۔ فارم کے درمیان ایک پہاڑی سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی دیکھا گیا مگر بکرا نہ ملنا تھا نہ ملا، البتہ اس کی ہڈیاں ایک جگہ مل گئیں۔ قریب ہی رالف وہاں تیندوے کے تین بچے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

انھوں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی مگر بچوں کی ماں کہیں نظر نہ آئی۔ یقیناً وہ اپنی دانست میں بچوں کو پہاڑی پر چھپا کر شکار کرنے گئی ہوئی تھی۔

بچوں کی عمر چند ہفتے تھی۔ بڑے خوبصورت، بالوں بھرے اور گول مٹول سے تھے۔ مگر جب رالف نے ایک بچے کو تھامنا چاہا، تو وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر غرایا اور اس نے ہاتھ پر کاٹ کھانا چاہا جبکہ دوسرا بچہ آسانی سے ہاتھوں میں آ گیا۔

جب رالف نے اس کا جائزہ لیا، تو معلوم ہوا کہ اس کا پچھلا پیر زخمی ہے۔ زخم سے ہڈیاں نظر آ رہی تھیں اور پیر سُوجا ہوا تھا۔ بچے کی حالت خاصی بُری تھی۔ صاف لگتا تھا کہ زخم صحیح نہ ہوا، تو وہ جلد ہی موت کے منہ میں پہنچ جائے گا۔ یہ امر مدنظر رکھ کر میرے شوہر نے فیصلہ کیا کہ بچے کا علاج کرایا جائے۔

رالف نے بچہ ملازمین کے حوالے کر دیا۔ بقیہ دو

بچے وہیں رہ گئے۔ تین دن بعد ہمارے ملازمین دوبارہ وہاں گئے، تو بچے غائب تھے۔ انھوں نے پھر مادہ تیندوا کے نشانات پا دیکھے جو فارم سے باہر جا رہے تھے۔ یقیناً ماں واپس آ کر دونوں بچوں کو کسی محفوظ مقام پر لے گئی تھی۔

تیندوے کے بچے کو نزدیکی قصبے لے جایا گیا جہاں ایک ڈنگر ڈاکٹر بیٹھتا تھا۔ ہم نے بچے کا نام ''جیکی'' رکھ دیا۔ ڈاکٹر نے بہت اچھی طرح جیکی کا علاج کیا۔ زخم صاف کیا اور مرہم پٹی کر دی۔ اس کے علاوہ ہمیں تفصیل سے یہ بھی بتایا کہ زخم کیونکر دیکھنا بھالنا اور بچے کو کیا کھلانا ہے۔ (بچے کی غذا دودھ، کریم، انڈے کی زردی اور ادویہ کا آمیزہ تھی۔)

علاج مکمل ہوا، تو ہم جیکی کو اپنے گھر لے آئے۔ مجھے یہ معصوم سا بچہ بہت پسند آیا۔ ہم نے ایک کارٹن میں اس کا گھر بنایا اور اُسے اپنے بیٹے، رین ہارڈ کے بستر تلے رکھ دیا۔

ہم تب تک جان گئے کہ وہ مادہ ہے۔ شروع میں وہ ہمیں دیکھ کر سانپ کی طرح پھنکار مارتی اور خوفزدہ کرنے کی سعی کرتی۔ لیکن چند دن بعد وہ ماحول سے مانوس ہوگئی۔ خصوصاً جب کھانے کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھستی، تو وہ کارٹن سے سر باہر نکال کر ہمیں گھورنے لگتی۔

جیکی میں انقلاب ۲ ہفتے بعد آیا۔ ہوا یہ کہ ہمارا ۱۳ سالہ بیٹا، رین ہارڈ اقامتی سکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ ایک دن وہ ہفتہ بھر کی چھٹیاں گزارنے ہمارے پاس چلا آیا۔ اس نے جیکی کو کارٹن سے نکالا اور اپنے بستر میں گھسا لیا۔ حقیقتاً یہ دونوں کے لیے پہلی نظر میں عشق ہو جانے کا معاملہ تھا۔

رفتہ رفتہ دونوں میں اتنی الفت ہوگئی کہ جیکی کو جب بھی نیند آتی، وہ رین ہارڈ کے کمبل میں گھستی، اس کے شکم پر لیٹتی اور بڑے مزے سے سو جاتی۔ کبھی موڈ میں آتی، تو بیٹے کے کاندھوں یا گردن پر سوار ہوتی اور اٹھکیلیاں کرتی رہتی۔ صبح وہ باغ میں گیند سے کھیلتے اور جب تھک جاتے، تو سامانِ خورونوش سے لطف اندوز ہوتے۔ غرض ان میں بڑی دوستی ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رین ہارڈ ایک ہفتہ گزار کر واپس اقامتی سکول گیا، تو جیکی بہت اُداس ہوگئی۔

چند ہفتوں بعد جب جیکی میں خود اعتمادی آئی اور اُسے معلوم ہوگیا کہ گھر والے اس کے دوست ہیں، تو وہ گھوم پھر کر ہمارا مسکن دیکھنے بھالنے لگی۔ جب کبھی اُسے خطرے کا احساس ہوتا، تو بھاگ کر رین ہارڈ کی جرسی میں گھس جاتی۔ ہم نے بیٹے کے کمرے کی وہ کھڑکی کھول دی جو باغ کی سمت کھلتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ جب چاہے باغ کی سیر کر سکے۔ شروع میں جیکی کئی گھنٹے کھڑکی میں بیٹھی بیرون دنیا کا مشاہدہ کرتی رہی۔ آخر جب اس میں حوصلہ آیا، تو وہ تنہا باغ میں گھومنے پھرنے لگی اور یوں جیکی کی جھجک دور ہوگئی۔

خوش قسمتی سے ہمارے آئرش ٹیریر کتے رومیل اور جیکی کی بہت جلد دوستی ہوگئی۔ حالانکہ رومیل اس وقت قد کاٹھ میں جیکی سے دوگنا بڑا تھا۔ وہ دونوں گھنٹوں کھیلتے اور اپنے کھیلوں میں مگن رہتے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جب بھی رین ہارڈ چھٹیوں پر آتا، تو جیکی کی عید ہو جاتی۔ بیٹا جیکی کو موٹر سائیکل پر بٹھاتا اور اردگرد کا چکر لگاتا۔ دونوں جانور اس سے بہت مانوس تھے اور رین ہارڈ کے آتے ہی وہ بیٹے کے گرد ناچنے لگتے۔

رفتہ رفتہ جیکی کو احساس ہوگیا کہ رین ہارڈ مقررہ وقت آتا جاتا ہے۔ بیٹا جمعے کی شام گھر پہنچتا۔ وہ دروازے پر ہی صدا لگاتا ''جیکی!'' وہ باغ میں بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی ہوتی۔ آواز سنتے ہی چھلانگ لگاتی اور رین ہارڈ کی بانہوں میں پہنچ جاتی۔

اسی طرح اتوار کی سہ پہر جیکی جان جاتی کہ اس کا بہترین دوست عارضی طور پر بچھڑنے والا ہے۔ چنانچہ وہ رین ہارڈ کے ساتھ چپکی رہتی۔ جب بیٹا چلا جاتا، تو جیکی اُداسی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھرتی اور جب اسے بھوک لگتی، تبھی ہمارے پاس آتی۔

جیکی کو پوری آزادی حاصل تھی کہ گھر میں جہاں مرضی گھومے۔ جب وہ جوان ہوئی، تو اس میں زیادہ جرأت آگئی۔ وہ پھر ہمارے پالتو پرندوں پر اپنی شکاری حسیں آزمانے لگی۔ ہم نے اُسے نہیں روکا تاہم ہمارے مابین

ایک خاموش معاہدہ ہوگیا۔

وہ یہ کہ جیکی روزانہ ہمارے فارم میں پلی دو تین بطخیں شکار کرسکتی تھی، لیکن شرط یہ تھی کہ وہ مرغیوں کو کچھ نہ کہے۔ جیکی یہ معاہد بخوبی سمجھ گئی اور اس نے ایک مرغی کو بھی پنجہ نہ لگایا۔

بطخیں مارنے کا جیکی کو یہ فائدہ ہوا کہ اُسے شکار کے طور طریقوں سے فائدہ اٹھانا آگیا۔ اب وہ رات کو جنگلوں میں جانے لگی۔ تاہم دوسرے دن صبح واپس آجاتی۔ دراصل اس کے پیروں کے نشان دیکھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ مادام فارم سے باہر جاتی ہے۔ راتوں کو شکار کرنے سے اس نے بڑے جانور مثلاً ہرن، لگڑ بگڑ وغیرہ کو بھی شکار کرنا سیکھ لیا۔

تیندوؤں کی تمام مخصوص عادات اپنا لینے کے باوجود جیکی نے ایک ایسی عادت ترک نہ کی جو ہم نے اُسے ڈالی تھی۔ وہ یہ کہ شام ہوتے ہی وہ باورچی خانے پہنچتی اور چھلانگ مار کر مائیکرو ویو کے قریب بیٹھ جاتی۔ دراصل اُسے اپنے خصوصی دودھ کا انتظار ہوتا۔ وہ پھر صبر سے برتن خود تک پہنچنے کا انتظار کرتی اور دودھ ملتے ہی بے تابی سے غٹ غٹ پینے لگتی۔

جب جیکی جوان ہوئی، تو ایک خوبصورت، دیدہ زیب اور شاندار مادہ تیندوا میں ڈھل گئی۔ وہ ہمارے لیے تو قطعاً خطرہ نہیں تھی، لیکن ہمیں احساس ہوگیا کہ وہ اجنبیوں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ہم جیکی کو کسی چڑیا گھر نہیں بھجوانا چاہتے تھے کیونکہ وہ وہاں کی سخت زندگی شاید برداشت نہ کرپاتی۔ مگر ہمیں کوئی ایسا گھر ابھی نہیں ملا جو اُسے ہمارے گھر جیسا آرام عطا کرتا۔

ایک دن جیکی اچانک غائب ہوگئی۔ شاید اُسے بھی محسوس ہوگیا تھا کہ اس نے ہمارے ساتھ جتنا وقت گزارنا تھا، گزار لیا، اب راہیں جدا کرنے کا لمحہ آپہنچا تھا۔

ہم نے آس پاس کے جنگل چھان مارے مگر بدقسمتی سے اسی دوران تیز بارشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ جیکی کے قدموں کے رہے سہے نشان بھی مٹ گئے۔ تین مہینے بعد کی بات ہے، ہمارے بچے سکول سے واپس آگئے

جیکی رین بارڈ کی
آغوش میں آرام کرتے ہوئے

تھے۔ تبھی ہم اپنے فارم میں جیکی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر وہ شدید زخمی تھی۔ معائنے پر پتا چلا کہ اس کی ایک ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہ پھر تین ٹانگوں سے چلتی ہمارے پاس پہنچی تھی۔ مگر اس کٹھن سفر نے اُسے بے دم کردیا۔ وہ فارم پر پہنچتے ہی زمین پر گر پڑی اور ہانپنے لگی۔ رین بارڈ نے دوڑ کر اُسے بانہوں میں لے لیا۔ خدا جانے اس احساس کو کیا کہنا چاہیے جو اسے مشکل لمحوں میں مدد لینے واپس ہمارے پاس لے آیا تھا۔

ہم فوراً اُسے ڈنگر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ وہ فی الفور اپنے نائب کی مدد سے جیکی کے آپریشن میں جت گیا تاکہ گولی نکال سکے۔ مگر دورانِ سفر اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ چنانچہ وہ جانبر نہ ہوسکی اور ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ یوں ہمارا ایک پیارا ساتھی چند لمحوں میں جدا ہوگیا۔

ہم آج بھی جیکی کو یاد کرتے ہیں۔ ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہمیں ایک خوبصورت اور شاہانہ حیوان پالنے کا سنہرا موقع ملا۔ ہم نے جانا کہ یہ بڑی بلیاں کیونکر اپنی مخصوص حسیات سے کام لیتی ہیں اور یہ بھی پایا کہ انھیں جب آزادی دی جائے، تو کتنی خوش سلیقگی سے زندگی بسر کرتی ہیں۔

بہترین پارچہ جات کا مرکز

جلال دین

دیدہ زیب، دلکش، دھنک رنگ، خوشنما

کاٹن لان

گل احمد، الکرم، کلاسک، لاکھانی ملز، ستارہ سپنا
اور فردوس، اس کے علاوہ کئی دیگر ملز کی لان

www.pdfbooksfree.pk

کا تازہ ترین اسٹاک

بے شمار ڈیزائنوں اور دلپذیر شیڈز میں آپ کے عمدہ ذوق کی تسکین
اور پسند کے لیے وسیع تر ورائٹی میں ہلکی پھلکی، نرم ملائم اور راحت بخش
اس کے علاوہ بے شمار ایمبرائیڈرڈ لان

پُرسکون ماحول، ایئر کنڈیشنڈ فضا

ایم۔ جلال دین اینڈ برادرس

شاہراہِ عراق، صدر، کراچی

فون:۔ 35660444 - 35210350 - 35212758

فلسطینی کہانی

رگوں میں
اُترنے والی
کہانی

او غزہ کے بچو!

جانے کیوں
معجزوں کی عمریں
اتنی تھوڑی ہوتی ہیں

ایک دادی کی کہانی وہ معجزے کی دعائیں کرتی قبر میں جا اُتری تھی
پھر ایک روز ایک ایسا مسیحا اس کی پوتی کی زندگی میں معجزہ بن کر آ گیا تھا
جس کی انگلیوں میں ایک انوکھی خوبی ودیعت کر دی گئی تھی

سلمیٰ اعوان

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جمعہ

کا دن تھا۔ جگہ شہر دمشق کی قدیم ترین دمشق سٹیڈیل (Citadel) (Damascus) تھی۔ جہاں اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کا شاہکار اُمیہ مسجد ہے۔ عین سامنے جس کے وہ ساحتہ المسکیہ کا میدان قدامت کی فسوں خیزی لیے قلب ونظر کو حیرت زدہ کرتا ہے۔ آج تیسرا دن تھا۔ میں ہر روز دمشق کے محلوں، عجائب گھر اور اُس کے کوچہ و بازار میں گھومتی پھرتی یہاں آجاتی۔

پہلے دن ہی اس کی سحر انگیزی نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ کینا کے درخت تلے بیٹھی خوشگوار ہواؤں سے لُطف اندوز ہوتی کبھی اپنے دائیں ہاتھ نوادرات کی دوکان کے چوبارے کی آبنوسی کھڑکیوں کو دیکھتی جن کی چوبی کندہ کاری ایسی خوبصورت تھی کہ نگاہیں ان میں پھنس پھنس جاتیں۔ سامنے دمشق کے مشہور حمیدیہ بازار کے اختتامیہ حصّے پر بنے حداد (Hadad) ٹمپل کے کالم ٹوٹ پھوٹ اور خستگی کا شکار ہونے کے باوجود نظروں کو لُبھاتے تھے۔ پُشت پر اُمیہ مسجد کا پندرہ سولہ فٹ اونچا دروازہ، بلند و بالا دیواریں اور اس کے ۳ مختلف سٹائل کے بنے مناراس کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس جمعہ کے دن میری نگاہیں پتھر کے فرش سے پھسلتی کھجور کے صدیوں پرانے درخت کی جھالروں سے آنکھ مٹکا کرتی، پھڑ پھڑاتے کبوتروں کی اڑان میں اُلجھتی، اُس لڑکی سے جا ٹکرائی تھیں جو خوبصورت تو ضرور تھی پر ایسی نہیں جیسا شامی حُسن ہوتا ہے کہ بندے کو جکڑ لیتا ہے۔

سادے سے سفید سُوتی سکارف سے ڈھانپے سَر کے نیچے چہرہ دھوپ میں تمتما رہا تھا۔ لونگ سکرٹ ٹخنوں کو چھوتا تھا۔ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے اُسے گھسیٹ سی رہی تھی وہ سو فیصد یورپی نظر آتا تھا۔

جمعہ کی پہلی اذان ہو چکی تھی۔ چبوترے سے اُتر کر میں میدان میں مسجد کے دروازے کی سمت رواں تھی جب اُس نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

''مردوں کے لیے مسجد جانے کا کون سا راستہ ہے؟''

''یہی جو تمھارے سامنے ہے۔''

جب وہ دونوں باب بُرید سے گزر رہے تھے میں ان کے پیچھے تھی۔ لڑکا مردانے حصّے کی طرف بڑھنے لگا تو لڑکی نے انگریزی میں اُس سے کہا تھا۔ "نماز کے بعد ایک دو گھنٹے آرام کر لینا۔"

اب وہ وضو کیلئے کدھر جانا ہے؟ جیسا سوال کرتی میرے ساتھ ہولی۔

برآمدے میں سے گزرتے ہوئے میری نظروں کا بھٹکاؤ تو بس لمحوں کا ہی تھا۔ میرے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے بائیں ہاتھ کی بلند و بالا دیواروں پر آرٹ کے فطرت سے متعلق صدیوں قدیمی شاہکاروں پر نظریں ڈالے بغیر آگے بڑھ جاتی۔ دارالخزانہ جیسے شاہکار سے آنکھیں چُرا کر اپنا راستہ ناپتی۔ سچی بات ہے یہ تو سَراسَر اُس کی توہین تھی اور صحن میں بنا چوکور منار بھی ہرگز دیکھے بغیر گزر جانے والا نہ تھا۔

میں خود پر لگنے والے اس اعتراض کو سُننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ گزشتہ ۳ روزوں سے ہر روز ان کے نظاروں سے محظوظ تو ہورہی تھیں۔ اب کیا انہیں گھول کر پی جانا تھا۔

بھئی سچی بات ہے میں بھی اپنی بھُوک اور حریصانہ نظروں کے ہاتھوں مجبور ہوں جو اس آنکھ مٹکے سے باز رہ ہی نہیں سکتیں۔ جب گردن سیدھی کی لڑکی غائب تھی۔

''ارے......''

بھونچکی سی ہو کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ چکر کھا کر پُشت اور سامنے نگاہ کی۔ لڑکی تو کہیں نہیں تھی۔ آنکھوں کو ٹمٹماتے میں نے تاسف سے پھر اردگرد کا یوں جائزہ لیا کہ جیسے وہ لڑکی تو نہیں سُوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ میں پہنی بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی گر گئی ہے۔

لڑکی کہاں تھی۔ جس لڑکے کا ہاتھ پکڑے راستہ پوچھتی تھی وہ ۱۰۰ فیصد یورپین تھا۔ جھلاتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

''کیسی بے حس لڑکی تھی۔ پہلی بار اس نادر تاریخی ورثے میں داخل ہوئی اور پل بھر کیلئے رُک کر کسی چیز پر نظر نہیں ڈالی۔ کچھ سوچا بھی نہیں کہ جہاں سجدہ کرنے آئی ہے وہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

زمانوں قرنوں سے جائے عبادت تھی آرمینیوں، رومیوں، عیسائیوں اور اب مسلمانوں کی۔ یہ تاریخ کے کتنے بے شمار باب کھولتی ہے۔ اُس نے کسی کو بھی کھولنے یا پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

چشمہ کا حوض تو ابھی بھی سامنے موجود تھا۔

اب افسوس اور جھلاہٹ کا فائدہ۔ کہانی تو مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔ سُست قدموں سے وضو والے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں بھی دھیان وضو میں کم اور لڑکی میں زیادہ رہا۔

ابھی تو خطبہ جاری تھا۔ سامنے والے حصے کی طرف بڑھنے لگی کہ چلو وہاں سجدہ بھی ہوگا اور نظارہ بھی۔ مسجد کا وسیع و عریض پختہ صحن تنور بنا پڑا تھا۔ چھاؤں والے حصوں میں عورتیں پھسکڑے مارے بیٹھی تھیں۔ ذرا اُن سے بچتے دھیان سے آگے بڑھتی تھی کہ کسی کا ہاتھ کسی کی انگلی پاؤں کے نیچے آگئی تو سیاپا پڑ جائے گا۔ تبھی کسی نے عبا کھینچی۔ پلٹ کر دیکھا تو بند دروازے کے آگے بنے پوڈے پر لڑکی بیٹھی تھی۔

خوشی سے نہال ہو جانے والا معاملہ ہوا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہی اُسے اپنی کیفیات سے آگاہ کیا۔

''سوری، دراصل ایک خاتون پر مجھے سلفیٹ (Sulfit) فلسطین میں اپنی ہمسائی کا گمان گزرا تھا۔ بھاگی تھی کہ اُسے پکڑلوں کہیں ہجوم میں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ پر وائے حسرت وہ تو کوئی لبنانی نکلی۔

تو وہ فلسطین سے ہے۔ اور وہ لڑکا کون تھا۔

اندیشے سرسر کرتے لہجے میں دوڑتے چلے آئے تھے۔

لڑکی تو بڑی میٹھی اور بڑی پیاری سی دکھتی ہے۔ ہائے اللہ کوئی رولے غولے والا چکر تو نہیں۔

''بس کر۔ وڈی مولون۔''

ایسی پھٹکار کے باوجود پوچھ ہی لیا۔ لڑکا کون تھا؟

''میرا شوہر ہے۔'' چلو اطمینان تو ہوا۔ پر سوال پھر ہو گیا کہ وہ تو یورپین لگتا ہے۔

''ہاں نا۔ برٹش ہے۔ اسلام قبول کیا ہے اُس نے۔''

پوٹی جیسے ہاتھ کو بے اختیار ہی تھام کر چوم لیا۔

دھان پان سی لڑکی نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اوپر سے ترقی پسندی کی جتنی بھی ڈینگیں ماروں اندر سے مسلمانیت پھر بھی پلّہ مار جاتی ہے۔

نماز کیلئے عورتیں صف بندی میں مصروف ہوئیں تو میں اُس کا ہاتھ تھام کر باب جیرون میں داخل ہوئی۔ یہیں قریب ہی مشہد الحسین ہے۔ روایت ہے کہ امام عالی مقام حسینؓ کا سر مبارک یہاں دفن ہے۔

لڑکی نے چلتے چلتے رک کر پوچھا تھا سنا ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا روضہ مبارک بھی یہیں ہے۔

''ہاں محراب کے پاس ہی ہے۔ پچّی کاری کا بڑا خوبصورت کام ہے اُس پر۔''

فرش خوبصورت دبیز قالینوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جن پر ساتھ ساتھ ہم کھڑے ہوگئے۔ کسری فرض پڑھ کر میں نے پشت دیوار سے ٹکا کر اُسے دیکھا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ دعا کیلئے اُٹھے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اُس کا سارا وجود اُوپر والے کے قدموں میں کسی طلب کیلئے گویا مجسم تھا۔ چہرہ جیسے حزن و یاس کی بارش میں بھیگ رہا تھا۔

جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔ میرا دل تڑپ سا گیا۔ اس دید میں اپنایت اور محبت تھی۔ میں نے اُسے بانہوں کے کلاوے میں بھر کر اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چاہا کہ وہ میرے سامنے کھل جائے۔

پرس کھول کر اُس نے ایک پوسٹ کارڈ نکالا۔ میرے سامنے کیا۔ میں نے دیکھا تھا۔ سفید اور سبز رنگوں میں چند لکیریں جن کی بظاہر صورت کسی راکٹ جیسی، جو زمین کے سینے کو چھیدنے جا رہا ہو۔

''غور سے دیکھیے'' جیسی بات پر اوپر لکھا ہوا پڑھا تو معلوم ہوا فلسطین کا نقشہ ہے۔ ۱۹۴۶ء سے جب برطانیہ اور اس کے حواریوں نے اس پورے علاقے کی بندر بانٹ کی۔ ۲۲ ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ ان ٹکڑوں کو نئے ملکوں کے نام دیے اور باقی بچنے والے اس ٹوٹے کو اپنے پاس رکھا اور A land without a people for a

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

people without a land کا راگ الاپنے والوں کو یہ تحفہ دیا۔

۱۹۳۶ء میں فلسطینیوں کی اس سرزمین میں بنی اسرائیل کی یہ ناہنجار اولاد محدود تھی۔ مغربی اور مشرقی کناروں کے تھوڑے سے حصے پر چاولوں کے دانوں کی طرح بکھری ہوئی۔ آخری نقشہ ۲۰۰۵ء کا تھا۔

فلسطین ایک المیہ۔ ایک گہرا دکھ۔ عربوں کے سینوں میں پلتا ہوا ایک ناسور۔

کارڈ میرے ہاتھوں میں تھا۔ یونہی اس کی پشت کو دیکھ بیٹھی۔ بڑی موہ لینے والی لکھائی تھی۔ انگریزی میں لکھے گئے یہ اشعار کیسے دل چیر گئے تھے۔

If only our enemies would read
our letters twice or three times,
apologize to the butterfly for
their game of fire

اس نے ہرک کر میری طرح اپنی پشت دیوار سے لگائی۔ ایک لمبی آہ بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرے دادا کا گھر حیفہ میں تھا۔ حجاز ریلوے اسٹیشن کے پاس۔ حیفہ بحیرہ روم کے شمالی کنارے پر صدیوں پرانا تاریخی شہر ہے۔ یہاں سے ٹرین ہمارے مقدس شہروں مکہ اور مدینہ کو براستہ دمشق جاتی تھی۔ زائرین کیلئے عثمانیوں کا بنایا ہوا ریلوے اسٹیشن۔ اب تو ظالموں نے اس کا نام ہی بدل دیا ہے۔ حیفہ مشرقی اسٹیشن رکھ کر میوزیم بنا دیا ہے۔

میرے بچپن اور جوانی کی یادیں سلفیٹ (Salfit) شہر کی قصباتی جگہ حارث کے گلی کوچوں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے والد ڈاکٹر ابوموسیٰ بزاز بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ جن کا بچپن اور جوانی حیفہ میں گزری تھی۔ یہ وہ دن تھے جب غریب فلسطینیوں سے بنجر زمین خریدی جاتی یا ان کے شکستہ حال گھروں کا مہنگے داموں سودا کیا جاتا۔ غریب لوگ پیسے زیادہ ملنے پر خوش ہوتے۔ اس کے پیچھے جو مقاصد کام کر رہے تھے اس کا تو انہیں شعور اور ادراک ہی نہیں تھا۔ کہیں کہیں زور زبردستی ہوتی۔ یوں بڑی بڑی خوبصورت کالونیاں بنتی جاتیں اور باہر سے یہودیوں کو لا کر بسایا جاتا۔ باہر کی دنیا اس صیہونی پروپیگنڈے کے شوروغل سے متاثر تھی کہ فلسطین کی سرزمین ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے جو وہاں جتنی زمین چاہے خریدے۔ رہے عرب جاہل، اجڈ اور بے شعوری قوم۔

میرے والد کی کلاس فیلو یائل یہودی ہونے کے باوجود ان باتوں پر بہت جلتی کڑھتی تھی۔ یائل جرمن نژاد تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ حیفہ کی جرمن کالونی میں رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے شہر بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شہروں کو غریب فلسطینیوں سے پاک کرنے کا عمل زور پکڑ گیا۔ مہاجروں کے کیمپوں میں روز افزوں اضافہ، ان کی زمینوں پر شاندار پلازے، کوٹھیاں اور صنعتی یونٹ تعمیر ہوتے گئے۔ فلسطینیوں کی جھونپڑیوں میں خوفناک پھیلاؤ آ گیا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب میرے والد کو حیفہ چھوڑ کر حارث آنا پڑا۔ پر کہیں ایک دکھ کی لہر ان کے اندر سے اٹھتی تھی۔ انہیں اپنا باغ یاد آتا۔ اس میں اُگے سنگتروں کے پیڑ یاد آتے۔ بحیرہ روم کا ساحل، اپنا گھر، اس کی گلیاں بہت وقت وہ مضطرب رہے۔ میری دادی کیلئے حیفہ چھوڑنا گویا موت کو گلے لگانے جیسا تجربہ تھا۔

کبھی ہجرت کا زہر بھرا گھونٹ بھرا ہے؟ اس نے سسکاری بھری۔

میں نے دہل کر اسے دیکھا۔ میں خود تو اس تجربے سے نہیں گزری تھی کہ تقسیم ہند پر بہت کم سن تھی۔ مگر آنے والے بہت سالوں اس عملی مشاہدے سے گزری کہ میری دادی ہمہ وقت تیار ہی بیٹھی رہتی تھی کہ بس وہیں واپس جانا ہے۔ کمروں کو اس نے تالے کب لگائے تھے۔ وہ تو بہ امر مجبوری لوگوں کے اصرار پر باہر نکلی تھی۔

''چھوٹ، لوگ تو باولے ہو گئے ہیں۔ کوئی اپنا گھر بھی یوں چھوڑتا ہے۔ چلو دو چار دن بعد آ جائیں گے۔''

میری ماں چولہے کے پاس بیٹھی راکھ پھرولتے ہوئے مدتوں وہیں اور اس کی گلیوں کو یاد کرتی اور وہیں کے ناسٹلجیا سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سابق مشرقی پاکستان میں شمالی ہند سے ہجرت کر کے آنے والی میری بہت سی دوستوں کے والدین اور خود وہ ۱۹۷۱ء کے المناک حادثے کے بعد جس ٹوٹ پھوٹ کا ذہنی شکار ہوئیں اُن کی تو میں خود چشم دید گواہ تھی۔

تو مجھے اُس کی دادی کے جذبات سمجھ آتے تھے۔ اُس کے گھر کا آنگن بہت کشادہ تھا۔ دمشق، حلب اور فلسطین کے معززین کے گھروں جیسا جن کی دیواروں پر چڑھی انگور کی بیلوں پر ٹنوں پھل لگتا تھا۔ سنگترے کے بوٹے جب منوں وزنی بوجھ سے جھک جھک پڑتے تو اس کی آنکھیں انہیں دیکھ دیکھ کر ہیروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتیں۔ صحن کے عین درمیان کنواں تھا۔ بڑے بھاری شہتیروں والے کمرے تھے جن شہتیروں پر اس نے میرے دادا سے ضد کر کے گل کاری کروائی تھی اور جو بہت خوبصورت لگتے تھے۔ وہ باؤلی سی آنکھوں میں آنسوؤں کے کٹورے بھرے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتی تھی۔ لمبی لمبی محرابی جھروکوں والی بالکونیاں دیکھتی تھی۔

''دیکھو تو اس کمرے میں میرا چچا مفتی فلسطین امین الحسینی ٹھہرتا ہے۔ یہ کمرہ تو اس کے لیے مخصوص ہے۔''

اُسے اپنی زمین پر زیتون کے باغوں کی فکر تھی۔ وہ بھیڑ بکریوں کیلئے ہلکان ہو ہو جاتی تھی۔

وہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھی پر اپنے چچا کے گھر آنے پر معززین حیفہ کے ساتھ بیٹھک میں ان کی جو نشستیں جمتیں اور وہ شوق و محبت سے کھانے اور قہوے کی سروس خود بھاگ بھاگ کر کرتی تو ایسے میں اُن کی باتیں سُنتے سُنتے وہ بہت بالغ ہو گئی تھی۔

تُرکوں کے فضیحتے کرتی۔ مسلمان تھے پر کیسے مسلمان؟ ہمیں اپنی محکوم رعایا بنا کر رکھا اور ہمیشہ نظر انداز کیا۔ آخری عثمانی سلطان کے لتے لیتی کہ جس نے اُس مردود بارن ایڈمنڈ تھس چائیلڈ کو فلسطین میں ایک یہودی آبادی کی آباد کاری کی اجازت دی تھی۔ سارا معاملہ تو یہیں گڑبڑ ہو گیا تھا۔ تم مجھے سر اندر کرنے دو۔ بیٹھنے اور لیٹنے کی جگہ میں خود بنالوں گا۔ وہ اُونٹ اور خیمے کی کہانی سُنانا شروع ہو جاتی۔

تب دھیرے سے میرے والد انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہجرت کا عمل صدیوں قرنوں سے ہے۔ ایک مسلک ایک عقیدے کے لوگ پرائی جگہوں پر اپنی آبادیاں بھی بنا لیتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ غلط ہے کہ آپ اس حد تک چلے جائیں کہ مالکوں کو نکال باہر پھینکیں۔ پھر ان کی زمینیں چھین لیں اور انہیں اپنی ہی سرزمین پر قیدی بنا دیں۔

تب لعن طعن کے گولے برطانیہ اور اس کے حواریوں پر برسنے لگتے۔ شریف مکہ پر طوفانی یلغار ہوتی۔

ارے وہ پاسبان حرم تھا کہ ڈاکو۔ ہماری قیمت وصول کی۔ ہمیں سکوں کے عوض بیچ ڈالا۔

میرے والد چپ چاپ اُن کی باتیں سُنتے رہتے۔ وہ اُن کے جذبات سمجھتے تھے پر انہیں مزید دُکھ سے بچانے کیلئے ہونٹوں کو سیئے رکھتے۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کے دل کی ہر دھڑکن نزار قبانی کے شعروں کے ساتھ دھڑکتی اور ان کے خون کی گردش تیز اور تیز تر ہوتی جاتی۔

میں دہشت گردی کا حامی ہوں
اگر یہ مجھے روس، رومانیہ، پولینڈ اور ہنگری لے آئے
مہاجروں سے بچا سکے
یہ مہاجر فلسطین میں آ بسے
انہوں نے القدس کے مینار اقصیٰ کے دروازے اور محرابیں چُرا لیں
میں دہشت گردی کا حامی ہوں
جب تک نیو ورلڈ آرڈر میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
اُن کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
میں دہشتگردی کا حامی ہوں

تب ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ دائیں ہاتھ کی پوروں سے انہیں صاف کرتے ہوئے وہ وہاں سے اُٹھ جاتے۔

اور گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ حیفہ کی زمین پر بس فلسطینیوں کا خال خال کوئی گھر رہ گیا اور یہی وہ دن تھے جب میرا باپ حیفہ چھوڑنے کو کہتا تھا اور میری دادی کو ہول اُٹھتے تھے۔

’’آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ اشقیت اور جینی میں آپ کے کتنے رشتے دار اور دوسرے لوگ تھے۔ کیا ہوا؟ سارا علاقہ مسمار کر دیا گیا۔ عالیشان گھر بنے اور یورپ کے ملکوں سے اسرائیلی آئے اور قابض ہو گئے۔ مہربانی کریں ابھی گھر کے دام مل رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اس سے بھی جائیں۔‘‘

وہ چھم چھم روتی تھی۔ اُس کا کلیجہ منہ کو آتا تھا اور رندھے گلے سے کہتی تھی۔ کہاں جانا ہے؟ اچھا تو چلو نظارت میں جا بستے ہیں۔

اُن کی ایک بیٹی نظارت کے پرانے شہر میں العبید مسجد کے پاس مارکیٹ والے علاقے میں رہتی تھی۔

میرے والد چپ تھے۔ فیصلہ کرنے میں بہت سوچ بچار کے بعد قدم اٹھانے والے، حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ سمجھتے تھے کہ گرجاؤں، مناریوں اور شمنی گاگوں سے سجا یہ قدیم شہر آنے والے وقتوں میں اسرائیل کی ظالمانہ گرفت میں ہوگا۔

تو پھر عکا چلتے ہیں۔ میری دادی نے آہ بھری تھی۔

عکا کیلئے میرے والد رضامند تھے۔ پانچ ہزار سال کے تہذیبی ورثے کا مالک بہت خوبصورت عکا۔ مغرب اور مشرق کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی شہر میں دیکھنے کو ملے جیسا یہاں تھا۔ آرٹ اور مذہب کے امتزاج سے گندھا ہوا۔ دُنیا کی بہت ساری تہذیبوں اور ثقافتوں کی باقیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔ قلعوں، گرجاؤں، مسجدوں، مندروں سے بھرا ہوا شہر جو اپنے قدیم جنگجوؤں، اپنے معماروں اور اپنی گزشتہ شان و شوکت کی کہانیاں سناتا ہے۔ مگر پتا نہیں کیوں انہوں نے سلفیٹ (Sulfit) کو ترجیح دی۔

وہ ڈاکٹر تھے۔ ہمدرد اور غم گسار سے۔ نہ یہ دیکھتے کہ ان کا مریض عیسائی ہے، یہودی ہے یا مسلمان۔

نئی جگہ بسنے کا واویلا تو اپنی جگہ تھا۔ پر وہ حادثہ تو جیسے اُن کی جان پر گزر گیا۔ جون کے تپتے دنوں کا حادثہ۔ جائے نماز پر ہی بیٹھے بیٹھے آنسوؤں کی مالا پروتی جاتیں۔ کبھی شدید غصے سے لرزتی آواز اور کبھی غم میں ڈوبے لہجے میں میرے والد کو آواز دیتے ہوئے کہتی چلی جاتیں۔

’’سنتے ہو ابو موسیٰ ان مصریوں کو چوڑیاں کیوں نہیں دے آتے۔ ارے ایسے بزدل۔ انہوں نے بٹہ لگا دیا عربوں کی روایات کو۔ بھاگنے میں گھوڑوں کو بھی مات دے دی۔ نہر سویز تک سارا سینائی دے دیا۔ کس آرام سے اُن کی جھولی میں ڈال دیا۔ شام اور اس اُردن کو بھی ڈوب مرنا چاہیے۔ آج گولان کی پہاڑیاں چھینی ہیں کل دمشق پر ہاتھ ڈالیں گے۔ یروشلم تو گیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مقدس مقامات کے رکھوالے بھی وہ ہوئے۔

ارے ابھی پتا نہیں کیا کیا دیکھنا ہے؟‘‘

پھر آہ و زاری بڑھ جاتی۔ جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے کہیں آنسوؤں کے دھاروں میں بہتی آوازیں دیتیں۔

’’ابو موسیٰ کہاں ہو؟ ارے جاؤ نکلو۔ دیکھو تو جنہیں دیس نکالا دیا ہے وہ کس حال میں ہیں؟ جیتے ہیں یا مر گئے ہیں۔ ان ظالموں نے بڑی گولہ باری کی ہوگی۔ توپ بندوقوں نے ان کے کلیجے چھلنی کر دیے ہوں گے۔ ارے ڈاکٹر ہو تم۔ جاؤ ان کے زخموں پر مرہم رکھو۔

ارے ابو موسیٰ اب اللہ کی مصلحتوں کو میں کیا نام دوں۔ مجھے ان دو لڑکیوں کی جگہ دو بیٹے دے دیتا تو کیا تھا میں ان کے ہاتھوں میں بندوقیں نہ سہی پتھر پکڑا دیتی۔ ارے ایک دو کے ہی سر پھوڑ دیتے۔‘‘

ہماری والدہ اُس وقت ان کے قریب ہی کہیں موجود ہوتیں۔ میری بڑی دونوں بہنیں چھوٹی چھوٹی سی، ان کے جائے نماز پر آگے پیچھے دادی کی باتوں کی کاٹ سے بے نیاز چکر کاٹتی رہتیں۔

ایسے دُکھ بھرے بہت سے لمحوں میں انہیں قطعی یاد نہ رہتا کہ اُن کا بڑا سعادت مند بیٹا انہیں بتا کر ہی اُردن کے کیمپوں میں گیا ہے۔

تاریخ کا کتنا بڑا جبر۔ ہزاروں فلسطینی بے گھر ہو گئے۔ اُن کی بڑی تعداد شام اور اُردن کے مہاجر کیمپوں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔

اب فلسطین کا ہر گھر ماتم کدہ ہے۔ ہوا کرے۔ عرب اور مغربی دُنیا کو اس سے کیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اور ایسے ہی دنوں میں میرے بڑے ماموں ہمارے گھر آئے اور ہماری دادی کے پاس بیٹھ کر انہوں نے نزار قبانی کی وہ نظم انہیں سُنائی تھی جو شاعر کے ہونٹوں سے نکلتے ہی تند و تیز ہواؤں کے جھکڑوں کی طرح عرب دنیا میں پھیل گئی تھی۔ میری بہنیں مجھے بتایا کرتی تھیں کہ وہ نظم دادی کے ساتھ ساتھ انہیں بھی زبانی یاد ہو گئی تھی۔

کوئی ایک بار تھوڑی، میری دادی بار بار ان اشعار کا ورد مقدس آیات کی طرح کرتیں۔

جان کی امان پا سکتا تو سلطان سے کہتا۔

سلطان آپ دو جنگیں ہار چکے ہیں۔ آپ نسل نو سے کٹ چکے ہیں۔ دشمن ہمارے خون سے ہولی کھیل گیا۔

عرب بچو! مستقبل کو بتا دو تم ہماری زنجیریں توڑ دو گے۔ عرب بچو! ساون کے قطرو! تم ہی وہ نسل ہو جو شکست پر غالب آئے گی۔

غزہ کے بچو! اپنی جنگ جاری رکھو۔

ہم مُردہ اور بے گور ہیں۔

ان اطفال سنگ نے ہماری عباؤں پر سیاہی انڈیل دی ہے۔

او غزہ کے دیوانو۔

وہ جب یہ اشعار پڑھتیں تو میری بہنوں کی طرف دیکھتیں۔

"کاش یہ لڑکے ہوتے۔"

میرے والد مہینوں بعد آئے کمزور، نڈھال، شکستہ، ٹوٹے پھوٹے سے۔ کیمپوں کی حالت زار۔ ہسپتالوں میں نیپام بموں سے جھلسے ہوئے بے کس و لاچار فلسطینی۔ متاثرین تک پہنچنے کی راہوں میں حائل رکاوٹیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کا اغوا اور اُن کا اور عام لوگوں کا قتل عام۔

فلسطینیوں کو اپنی یہ لڑائی خود لڑنی ہے۔ کوئی عرب ملک اُن کی امید نہیں۔ کوئی اُن کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔ سب اپنے اپنے مفادات کیلئے بکے ہوئے ہیں۔

بستر مرگ پر بھی میری دادی فلسطین کیلئے معجزوں کی منتظر رہی۔ کسی صلاح الدین ایوبی کے اُٹھ کھڑے ہونے کی دعائیں کرتی کرتی قبر میں اُتر گئی۔

بیٹا تو میرے باپ کے شاید مقدر میں نہ تھا۔ تیسری لڑکی میری صورت میں گھر اور آ گئی۔ گھر تین لڑکیوں سے بھر گیا۔ جب ہوش سنبھالا میری بڑی بہنیں قاہرہ پڑھنے جا چکی تھیں۔ بیروت تو آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

اپنی بہنوں کے ساتھ میں دیر بعد شامل ہوئی تھی۔

وقت کے ساتھ ہتھکنڈے کن حربوں پر اُتر رہے تھے۔ ہمیں اس کا احساس ہر پھیرے پر ہوتا تھا۔ ہم تینوں بہنیں جب بھی گھر آتیں۔ جگہ جگہ ہماری گاڑی روکی جاتی۔ جا بجا چیک پوسٹوں پر ہمارے کاغذات چیک ہوتے۔ میری بڑی بہنیں جز بز ہوتیں۔ اُن کی چتونوں پر پڑے بل آج سمجھ آتے ہیں۔ فوجیوں کی نگاہوں کا گُرسنہ انداز کا مفہوم تب نہیں آج میرا خون کھولاتا ہے۔

مار دھاڑ، بے دخلی اور ہماری زندگی اجیرن کرنے کا ہر حربہ اپنایا جا رہا تھا۔ کنکریٹ کی دیواریں، برقی باڑھیں، آبزرویشن ٹاور، خندقیں، سُرنگیں اور پرمٹ سسٹم کیا کیا نہیں ہمارے لیے بنا دیا۔

وہ باغ وہ زمینیں جو کبھی فلسطینیوں کی تھیں اب اُن پر وہ قابض تھے۔ بیچارے فلسطینی پھل اُن سے خریدتے اور سڑکوں کے کناروں پر کھڑے ہو کر انہیں بیچتے۔ اُن کی Settlements پر دہاڑی دار مزدور بن کر کام کرتے۔ مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے پر جانے کیلئے سویرے سویرے لائنوں میں کھڑے ہو جاتے۔ پرمٹ سسٹم جیسے تکلیف دہ مرحلوں سے گزرتے۔

وہ دن بھی میں اپنی یادداشتوں سے کبھی نہیں نکال سکتی۔ میں اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ غزہ کے جنوب مشرقی علاقے "زیتون" میں رہنے والی اُن کی بے حد پیاری پھوپھی کی بیٹی اسرائیلی بمباری سے شہید ہو گئی تھی۔ اسرائیلی طیاروں نے بمباری کی تھی۔ میزائل ان کے گھر گرا تھا۔ ان کے دو کمسن پوتے اور وہ خود شہید ہو گئی تھیں۔ تعزیت کیلئے بھی بہت دنوں بعد جا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سکے کہ محاصرہ طول پکڑ گیا تھا۔

ڈاکٹر ابو موسیٰ بزاز دو بیٹیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ سب سے بڑی ڈاکٹر لائیلا انگلینڈ تھی، نمبر ۲ نُسرا میری پھوپھی کے گھر نظارت میں، تیسری میں یعنی آرینا اب اس مرحلے سے گزر رہی تھی۔ میری زندگی میں ڈاکٹر یشار البشر کا آنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر یشار البشر فلسطینی تھا مگر پرائمری کے بعد آئرلینڈ اپنے چچا کے پاس چلا گیا تھا۔ وہیں اُس نے میڈیکل کیا۔

گو وہ باہر رہا مگر فلسطین اُس کے وجود کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا تھا۔ وہ جب بھی آتا حالات کے تیور دیکھ کر کڑھتا، پیچ و تاب کھاتا اور اپنا خون جلاتا اور پھر دور نزدیک جگہ جگہ پھرتا۔ لوگوں کو دیکھتا، انھیں چیک کرتا، دوائیاں دیتا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے اس اُجڑے بکھرے محکوم و مجبور وطن آ گیا۔ مسیحائی کا تحفہ اُسے قدرت نے انعام کی صورت دیا تھا۔ عجیب سی بات تھی وہ قرونِ وسطیٰ کے طبیبوں کی طرح مریض کو لٹا کر اُس کا سر سے پاؤں تک معائنہ کرتا۔ اور یہ کیسی حیران کن ناقابلِ یقین بات تھی کہ جونہی اس کے ہاتھوں کی تحرکتی انگلیاں بیمار کے اعضا چیک کرتے کرتے اس کے پاؤں کی انگلیوں تک پہنچتیں، مرض ہاتھ جوڑے اُس کے سامنے مجسم ہو جاتا۔ نہ ایکسرے، نہ رپورٹ اور نہ کوئی ٹیسٹ۔

اُس کی اس عجیب و غریب سی خوبی نے اُسے قرب و جوار میں خاصا مشہور کر دیا تھا۔

ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔

میں سو کر اُٹھی۔ میرے سر اور گردن میں ایسا شدید درد تھا کہ چیخیں نکلتی تھیں۔ نہ صرف میرے والد بلکہ چند دوسرے ڈاکٹروں نے بھی چیک کیا۔ ابھی ٹیسٹوں کا مرحلہ جاری تھا جب اتفاق سے یشار البشر جارث میرے والد سے ملنے آ گئے۔ انہوں نے صرف پانچ سے چھ منٹ کے معائنے میں بتا دیا کہ اسے مینجائٹس ہو گیا ہے۔ فوری تشخیص اور علاج نے مجھے نئی زندگی دی تھی اور میں ڈاکٹر کی عاشق ہو گئی تھی۔

میری اس وابستگی کا اظہار میرے والد کی زبان سے ہوا اور یشار کی عنایت کہ اُس نے اِسے پذیرائی دی۔ گھر کی آخری اور بے حد لاڈلی بیٹی کی شادی جس انداز میں ہوئی وہ داستان بھی دل ہلانے والی تھی۔

اندرونِ وطن عزیزوں کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی رشتے کے چاچے، ماموں بھائیوں اور ان کے بال بچوں کا کٹھ ہوا پڑا تھا۔ اس رنگ رنگیلی فضا کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ جب مغربی کنارے کی شمالی پہاڑیوں کے دامن میں اسرائیلیوں کی آتمار Itamar نامی Settlement میں فوگل Fogel فیملی کے پانچ افراد کو ان کی خوابگاہوں میں چاقوؤں سے قتل ہو جانے کی خبر آئی۔

اسرائیلی ملٹری اور سیکورٹی سروسز نے بغیر تحقیق کے ملحقہ فلسطینی گاؤں آوارتا Awarta پر چڑھائی کر دی۔ نوجوان لڑکوں کی گرفتاریاں، گھروں کی تلاشی، سامان کی توڑ پھوڑ چند گھنٹوں میں حشر نشر ہو گیا۔

یشار کا بڑا بھائی اور اُس کے ۳ ربیٹے بھی اسی چکر میں دھر لیے گئے۔ وہ شادی میں شرکت کیلئے تیاریوں میں تھے جب یہ قیامت ٹوٹی۔ نابلوس میں کرفیو لگ گیا تھا۔ بارات کیسے آتی۔ آنسو میرے گالوں پر بہتے تھے اور میں اپنی بہنوں سے کہتی تھی۔ میری شادی پر ہی یہ سب ہونا تھا۔

ابا کے اسرائیلی دوستوں سے رابطے، بھاگ دوڑ، فلسطینی میئر اور سب سے بڑھ کر انکل یوری ایوزی سابق ممبر اسرائیلی پارلیمنٹ کی کاوشیں رنگ لائیں۔ انکل یوری ایوزی اسرائیل میں رہتے ہوئے، سیاست دان ہوتے ہوئے، حق سچ کا علم اٹھائے رکھتے ہیں۔ ظلم و جبر پر بولتے اور لکھتے رہتے ہیں اور فلسطینیوں کے حقوق اور ان کی آزاد ریاست کے قیام کی حمایت میں ہمیشہ آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

لڑکے بارات میں پھر بھی شامل نہ ہو سکے کہ وہ تو زیرِ حراست تھے۔ بیچاروں کے کہیں فنگر پرنٹ، کہیں ڈی این اے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔

یہ شادی نہیں تھی فرض کی ادائی تھی۔ میں نے میک اپ نہیں کیا۔ کپڑے نہیں پہنے۔ بس اُسی حالت میں گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

مہینوں میں اس دُکھ سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ یشار مجھے سمجھاتا اور دلداری کرتا نہ تھکتا تھا اور میں کہتی تھی۔

"کمزور ہونا کتنا بڑا جرم ہے۔"

یشار نابلوس کے رفیدیہ ہسپتال سے منسلک تھا۔ ایک دن کوئی ۲ر بجے گھر آیا۔ میرے ہاں دوسرا بچہ متوقع تھا۔ کھانا تیار نہیں تھا۔

کچھ کھانے کو ہے؟ اس کے انداز میں دھیما پن تھا۔

میں نے ذرا سے تامل ذرا سے تاسف سے اپنی خرابی طبیعت کا بتایا۔

چلو چھوڑو۔ زاطر تو ہے نا۔ اُسے ہی لے آؤ۔

میں نے میز پر خبض، زیتون اور زاطر سجا دیا۔

زاطر ہمارے مڈل ایسٹ میں بہت کھایا جاتا ہے۔ ہربل اور تلوں کا آمیزہ جسے زیتون سے ملا کر روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ابھی اُس نے توالے کو زیتون میں ڈبو کر اسے زاطر میں لتھیڑنے کیلئے نکالا ہی تھا کہ باہر کسی جیپ کے رُکنے اور پھر بیل بجنے کی آواز آئی۔

میں دوسرے کمرے میں چلی آئی۔

خادمہ نے مجھے بتایا کہ اسرائیلی فوجی ہیں۔

میرا دل دھک سے ہوا۔ اسی سے پتا چلا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

اندر کیا ہو رہا تھا؟ میرا دل سینے میں پھڑ پھڑاتا تھا۔

دیر بعد دروازہ کھلا۔ آنے والے جیپ میں بیٹھے اور چلے گئے۔ یشار اندر آیا۔ مجھے فق بیٹھے دیکھا۔ سینے سے لگایا اور بولا۔

"حد ہو گئی ہے۔ نارمل ہو جاؤ۔ لگتا ہے تمہارا دل جیسے ابھی اندر توڑ کر باہر آجائے گا۔ اور جب میں نے کچھ جاننے کی کوشش کی اُس نے رسان سے کہا۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔"

میرا اصرار حد سے بڑھا۔ اُس نے کہا۔ "مریض اگر اپنی بیماری کو راز میں رکھنے کا متمنی ہے تو ڈاکٹر کو اختیار نہیں کہ وہ اس کا پردہ فاش کرے۔"

پر میری حد سے بڑھی ضد پر بالا آخر اُسے بتانا پڑا۔

آنے والوں میں سے ایک اسرائیلی فضائیہ کا پائلٹ مسٹر ہیری یاتم تھا۔ دوسرا اُس کا دوست۔ اُس پائلٹ کے ساتھ ایک گھمبیر مسئلہ ہو گیا۔ جونہی وہ کسی مشن پر جانے کیلئے جہاز اُڑا کر فضا میں لاتا اُس کے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ وہ اپنی بیماری ملٹری ہسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میڈیکل گراؤنڈ پر فوراً ایکشن ہو کر سارا کیریئر داؤ پر لگ جاتا تھا۔ یشار کے بارے میں سُنا تھا۔ علاج کیلئے آیا تھا۔

اس کی پریشان کُن بیماری نے صحت یاب ہونے میں زیادہ وقت بھی نہیں لیا تھا۔ یشار کا معتقد ہو گیا۔ اسرائیلی افسروں میں اُس کی مسیحائی کا اچھا خاصا پرچار ہوا۔

یشار بے باک تھا۔ سچی بات کہنے سے اس کے منہ کو کوئی مصلحت روک نہیں سکتی تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار وہ اسرائیلیوں اور لیبر پارٹی کے ارکان سے اُلجھا تھا کہ وہ پرشیائی بن گئے ہیں۔ کل جو اُن کے ساتھ ہوا تھا وہی وہ فلسطینیوں کو لوٹا رہے ہیں۔ اس کا انجام جانتے ہو بہت خوفناک ہوگا۔ مت بھولو یہ سب جو بظاہر نظر آتا ہے اور جو تمہارے غلبے اور اقتدار کا خوف ہے ایک دن تمہیں پاتال میں پھینک دے گا۔

ابھی بھی وقت ہے۔ کیا یہاں اسی ۲ر فلسطینی ریاستیں نہیں بن سکتی ہیں جو امن اور آشتی سے رہ سکیں۔

کچھ لوگ اگر اس کی ایسی باتوں پر خار کھاتے تھے تو وہیں چند ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔

مگر یہ ٹھیک سمجھنے والے تو آٹے میں نمک برابر تھے اور جو اُس سے نفرت کرتے تھے بالا آخر وہ اُسے زمین کا رزق بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ تو ذرا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی معقول بہانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر میں کمرے میں تھی۔ یشار چھت پر تھا۔

موسم میں کچھ خنکی تھی۔ پتا نہیں میرا دل کیوں گھبرایا۔ میں نے ٹی وی کھولا۔ فلسطین کی بہت سُریلی گلوکارہ خاتم الشعر محمود درویش کی امر ہو جانے والی نظم گا رہی تھی۔

جیل بہت خوبصورت ہیں باہر کی دنیا کے باغوں سے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہم سے ہمارا وطن ہے اور وطن سے ہم ہیں
ہماری جنم بھومی، ہمارے اجداد کی،
ہمارے بچوں کی، ہماری جنت
آؤ کہ ہم اپنے دشمنوں کو کبوتر کی غٹرغوں سنائیں
اگر وہ سُننا چاہیں
آؤ کہ انہیں سپاہیوں کے ہیلمٹوں پر پھول اُگانا سکھائیں
اگر وہ سیکھنا چاہیں

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ روتے روتے جانے کب سو گئی۔ بس شور و غوغا سے آنکھ کھل گئی تھی۔ ساتھ کی چھت پر سوتا سارا خاندان ان کی وحشت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ یشار خون میں نہایا ہوا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں کا کہنا تھا کہ چند شرپسندوں نے اُن پر گولیاں چلائی تھیں۔ ان کے تعاقب اور فائرنگ پر جوابی کارروائی میں یہ سب ہو گیا۔ اور جب وہ یاکلت تعزیت کیلئے آیا میں نے کہا تھا۔

''مجھے بتاؤ میرے بچے بڑے ہو کر تم لوگوں سے انتقام نہیں لیں گے۔ ان کی پور پور میں جس نفرت کے بیج آج تم لوگ بو رہے ہو یہ کل فصل کی صورت میں پروان چڑھیں گے۔

یاتم نے شرمندگی سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ میری طرف دیکھا اور بولا۔

شاید آپ نہیں جانتیں۔ میں اسرائیلی ہوتے ہوئے بھی دوسرے درجے کا شہری ہوں کیونکہ میرا تعلق Sephardic Jews سے ہے جو اگرچہ عبرانی جانتے ہیں مگر ہسپانوی النسل ہیں، جو کیتھولک عیسائیوں کے سپین پر قبضے کے بعد اُن کے ظلم و ستم اور اپنا مذہب نہ تبدیل کرنے کے جُرم میں ہجرتوں کے مسافر بنا دیے گئے۔ جائے پناہ ملی تو کہاں؟ مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں عراق تک اور بلغاریہ سے لے کر جنوب میں سوڈان تک۔ مسلم دنیا ہمارا ٹھکانہ بنی۔

اُس کے اندر سے دُکھ اور یاس میں لپٹی بڑی لمبی آہ نکلی تھی۔ ان کا تکبّر، ان کا غرور اور ان کا ظلم انہیں ایک دن لے ڈوبے گا۔ اُس نے سر جھٹکا لیا تھا۔

نظارت میں رہنے والی اپنی بہن کی جھولی میں اپنے دونوں بیٹے ڈالتے ہوئے میں نے کہا تھا۔ ''اپنے بیٹوں کے ساتھ انہیں بھی پال لینا۔ میں باہر جاتی ہوں تاکہ ان کے لیے بندوقوں اور پستولوں کا بندوبست کر سکوں۔''

''دیکھو یاد رکھنا اگر بندوقیں نہ ملیں تو پتھر اور ڈنڈے ضرور پکڑا دینا۔ مزاحمت کی تاریخ تو ضرور مرتب ہوگی۔''

رہا یہ ٹونی کلف (اب ابراہیم) یہ تو یونہی پیچھے پڑ گیا تھا۔ محبت کرنے لگ گیا تھا۔ میرے پاس کیا تھا؟ اسلام سے متاثر تھا۔ میرے پیار میں اُلجھا تو سرتاپا اس چلن میں ڈوب گیا۔ شادی کے لیے جب اصرار بڑھا میں نے شرط رکھ دی کہ اگر تم سے میرے لڑکے ہوئے تو میں انہیں فلسطین بھیج دوں گی۔ اُسے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔

۲ بیٹے ہیں۔ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

وہ رُک گئی تھی۔ چند لمحوں تک خلا میں دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں جذبات کا طوفان اُمنڈا ہوا تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر قبل میں صلاح الدین ایوبی کے مزار پر تھی۔''

دنیا کے تہذیبی تصادم کے بھی کتنے جبر ہیں جو تاریخ کے سینے میں درج ہیں۔ ایک اُس ہوچھے فرانسیسی جرنیل ہنری گورو کا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر مال غنیمت کے طور پر فرانس کو ملنے والے ملک شام کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے دمشق میں داخلے پر سب سے پہلا کام اُس کا یہاں صلاح الدین کے مزار پر آنے، قبر پر کھڑے ہونے اور اپنی آواز کی پوری شدت سے چلّا کر کہنے کا تھا۔

''صلاح الدین سُنتے ہو۔ ہم فاتح بن کر لوٹ آئے ہیں۔ دیکھو۔ ہم نے سبز ہلالی پرچم کو سرنگوں کر دیا ہے۔ صلیب ایک بار پھر اپنے عروج پر ہے۔''

آنسو بہاتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

''تم نے یہ سب سُنا اور چُپ رہے۔ صلاح الدین! بہت آرام کر لیا ہے تم نے۔ اب اُٹھ جاؤ۔ صدی بیت گئی ہے۔ فلسطین کے بیٹے اور بیٹیاں بہت بے آبرو ہو گئی ہیں۔''

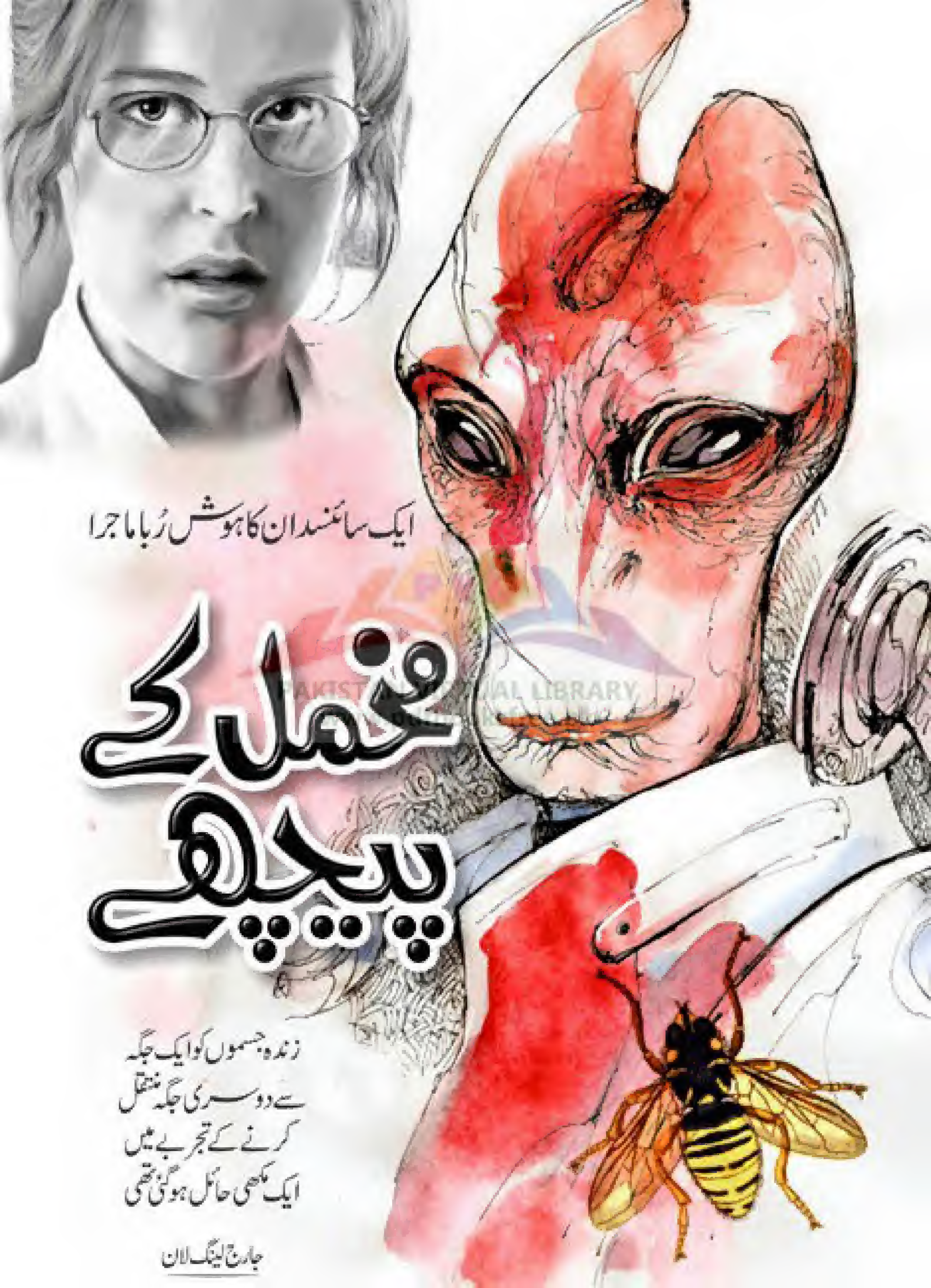
ایک سائنسدان کا ہوش رُبا ماجرا
مکھی کے پیچھے
زندہ جسموں کو ایک جگہ
سے دوسری جگہ منتقل
کرنے کے تجربے میں
ایک مکھی حائل ہو گئی تھی
جارج لینگ لان

رات

کے ۲ ربجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں لحاف میں لپٹا میٹھی نیند سو رہا تھا۔ غصے اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ میں نے ریسیور اٹھایا، میرے بھائی اینڈرکی بیوی بول رہی تھی۔

''میں نے تمھارے بھائی کو قتل کر دیا ہے، اس کی لاش فیکٹری کی لیبارٹری میں ہے۔ تم پولیس کو اطلاع دینے کے لیے آجاؤ۔''

''میرے بھائی کو تم نے قتل کر دیا، اپنے شوہر کو!'' میں نیند میں بولتا چلا گیا۔

''میں تمھیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتی۔'' ہیلن نے کہا۔ ''اور دیکھو اگر تم پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے یہاں پہنچ گئے تو مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ پولیس تم پر شک کرے گی۔ تم ان کے سوالات کی بوچھاڑ کا مقابلہ نہ کر سکو گے۔'' ہیلن نے یہ کہہ کر ٹیلی فون رکھ دیا۔

میں نے فون پر ہی انسپکٹر چیرس کو اطلاع دی اور وہ چند منٹ بعد پولیس کانسٹیبل کے ہمراہ میرے مکان پر پہنچ گیا۔ میں نے شب خوابی کا لباس اتارا، کپڑے تبدیل کیے اور انسپکٹر کے ساتھ اپنے بھائی کے مکان کی طرف چل دیا۔ موٹر میں انسپکٹر میرے بھائی کے متعلق مجھ سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ میں نے ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا بھائی فیکٹری کی لیبارٹری میں مختلف تجربات کر رہا تھا۔ وہ فیکٹری کے عقب میں پہاڑی پر اُس مکان میں رہتا تھا جو ہمارے دادا نے بنایا تھا اور جواب کافی عرصے سے خالی تھا۔

انسپکٹر نے آخری سوال پوچھا ''کیا آپ کے بھائی نے اپنے تجربات کے متعلق آپ کو کبھی کچھ بتایا؟'' میں نے جواب میں کہا:

''وہ وزارتِ فضائیہ کے لیے بعض تجربات کر رہے تھے۔ کئی مہینوں سے ان کی مشغولیت بہت بڑھ گئی تھی، وہ لیبارٹری میں کئی کئی گھنٹے کام کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ فضا کے ذریعے ایک چیز کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا تجربہ کر رہے ہیں۔'' میں نے بات ختم کی ہی تھی کہ پولیس کی موٹر فیکٹری کے دروازے پر رک گئی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کمرے میں پہنچے جہاں میرا بھائی مُردہ پڑا تھا۔ بجلی کا ایک بڑا قمقمہ روشن تھا۔ فرش پر جو لاش پڑی تھی اس کا چہرہ فیلٹ سے ڈھانپا ہوا تھا، بازو ہتھوڑے سے کچل دیے گئے تھے، فرش پر خون بہہ کر جم گیا تھا۔ انسپکٹر نے فیلٹ چہرے سے ہٹایا۔ اتنا دہشت ناک منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ سر اور منہ کی ہڈیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں، بھیجا باہر نکلا ہوا تھا، چہرہ بگڑ کر اتنا خوفناک ہو گیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ لاش کا یہ حصہ برقی شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

میں نے انسپکٹر کو بتایا کہ برقی شکنجہ آٹومیٹک ہے، بٹن دباتے ہی جب سوئی صفر پر پہنچے گی، شکنجہ کھل جائے گا۔ انسپکٹر نے فوراً پوچھا ''کیا آپ کے بھائی کی بیوی اس برقی شکنجے کو حرکت دینے اور ٹھہرانے کے راز سے واقف ہے؟''

''قطعاً نہیں۔'' میں نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

''اور آپ یہ راز کیسے جانتے ہیں؟'' انسپکٹر نے فوراً ہی دوسرا سوال کر دیا۔

میں نے اسے بتایا کہ فیکٹری کے کام سے فارغ ہو کر جب میں لیبارٹری جاتا، تو میرا بھائی یہ عمل بار بار میرے سامنے دہراتا تھا، لیکن جب بھی ہیلن وہاں آتی، اینڈر کام روک دیتا اور جب تک وہ چلی نہ جاتی، وہ اپنا کام شروع نہیں کرتا تھا۔

انسپکٹر مقدمے کی تفتیش میں کئی ہفتے مصروف رہا۔ اس نے ہر چیز کا بغور مشاہدہ کیا، مختلف لوگوں سے ہزاروں سوال کیے، لیبارٹری میں جو کچھ بھی ملا، اسے گہری نظر سے دیکھا، لیکن اس عرصے میں ہیلن کا رویہ عجیب تھا۔ وہ بالکل خاموش تھی اور ہر سوال کا جواب صرف ایک ہی دیتی تھی کہ میں نے ہی اپنے شوہر کو برقی شکنجے کے ذریعے قتل کیا ہے۔ یہ قتل کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب وہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ ملائمت اور دھمکی کا ہر حربہ، جو پولیس آزما سکتی تھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ اگلوا سکا۔ آخر پولیس سرجن نے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اُسے پاگل قرار دے دیا اور ہیلن دماغی امراض کے شفاخانے میں بھیج دی گئی۔

تفتیش کے دوران میں پولیس انسپکٹر میرا گہرا دوست بن گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شروع میں اسے مجھ پر قتل کا شبہ تھا لیکن اب اسے یقین ہے کہ میں اپنے بھائی کا قاتل نہیں ہوں۔ وہ ہیلن کو بھی قاتل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے چوکیدار نے بتایا تھا کہ جس رات اینڈر قتل ہوا ہے، لیبارٹری سے برقی شکنجہ چلنے کی ۲ر بار آواز آئی تھی، لیکن ہیلن کا اصرار تھا کہ اس نے برقی شکنجے کو صرف ایک بار چلایا تھا۔ لاش دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ برقی شکنجے میں پہلی بار اینڈر کے بازو کو کچلا گیا اور دوسری بار بازو نکال کر سر پر چوٹ لگائی گئی۔ اس طرح ہیلن کا اعتراف غلط ثابت ہوتا تھا۔

ایک روز پولیس کے ۶ر اعلیٰ افسر لیبارٹری میں آئے اور کئی گھنٹوں کی جستجو کے بعد انھوں نے صرف اتنی بات لکھی کہ لیبارٹری کی بعض اہم چیزیں تباہ کر دی گئی ہیں۔ پولیس لیبارٹری کے ایک افسر نے رپورٹ پیش کی کہ مقتول کے سر کو مخمل کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر برقی شکنجے میں دبایا گیا ہے۔ پولیس انسپکٹر نے مجھے مخمل کا وہ ٹکڑا دکھایا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ لیبارٹری میں کھانے کی میز پر بچھا رہتا تھا۔

ہیلن کو جس پاگل خانے میں داخل کیا گیا تھا وہ صرف مجرموں کے لیے تھا۔ میں ہر اتوار اسے ملنے جاتا، کبھی کبھار انسپکٹر بھی میرے ساتھ ہوتا۔ لیکن ہیلن اپنے رٹے ہوئے جواب کے سوا کوئی بھی ایسی بات نہ بتاتی جس سے قتل کے راز پر سے پردہ اٹھتا۔ وہ دن بھر سویٹر بُنتی رہتی، لیکن جب بھی کوئی مکھی اُدھر سے گزرتی، وہ کمال پھرتی کے ساتھ اسے پکڑتی، بغور دیکھتی اور چھوڑ دیتی۔ مکھیاں پکڑنے، دیکھنے اور چھوڑ دینے کا یہ جنون اس حد تک بڑھا کہ ڈاکٹروں نے اسے نیند کے انجکشن کے ذریعے سُلانا شروع کر دیا۔

ایک روز انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کو یقین ہے کو رجان پاگل ہے؟''

''مجھے تو اس میں کوئی شک نہیں۔''

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہیلن پاگل نہیں۔ وہ بے حد ذہین ہے اور جب وہ مکھیاں پکڑتی ہے، تو غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیتی ہے۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر بھی اسے پاگل قرار دے دیں، میں تسلیم نہیں کروں گا۔'' انسپکٹر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''اگر آپ کی بات ٹھیک ہے، تو وہ اپنے ۹ر برس کے لڑکے ہنری سے سردمہری کا سلوک کیوں کرتی ہے؟''

''ممکن ہے وہ اسے بھی خود کو پاگل ثابت کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہو لیکن ایک بات ضرور ہے کہ جب ہنری موجود ہوتا ہے، ہیلن مکھیاں نہیں پکڑتی، اس میں ضرور کوئی راز ہے۔''

''اچھا یہ بتایئے آپ کے بھائی مکھیوں پر بھی تجربہ کرتے تھے؟'' انسپکٹر تفتیش کے انداز میں بولا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں، اس بارے میں آپ وزارت فضائیہ سے کیوں معلوم نہیں کر لیتے؟ اسی کے لیے تو میرا بھائی ریسرچ کر رہا تھا۔''

''ہاں میں نے پوچھا تھا، وہ لوگ مذاق اُڑانے لگے کہ اس قتل سے مکھی کا کیا تعلق ہے، اس لیے میں خاموش ہو گیا۔''

☆☆

شام کو کھانے کی میز پر ننھے ہنری نے اچانک سوال کیا ''چچا جان! کیا مکھیاں زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں؟''

میں اس سوال پر چونک اُٹھا۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ میں نے ہنری سے اس سوال کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ جس مکھی کو امی تلاش کر رہی ہے وہ اس نے دوبارہ دیکھی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مکھی کیسی ہے اور اسے کب دیکھا ہے؟

ہنری نے بتایا کہ یہ مکھی عام مکھیوں کی نسبت جسامت میں بڑی ہے، اس کا سر سفید ہے اور ٹانگیں عجیب طرح کی ہیں جنھیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ ہنری نے یہ بھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

بتایا کہ اس نے یہ مکھی تھوڑی دیر ہوئی اوپر کے کمرے میں ڈیسک پر بیٹھی دیکھی تھی۔

''اور تم نے اس مکھی کو پہلی بار کب دیکھا تھا؟'' میں نے ہنری سے پوچھا۔

''جس روز پاپا کا انتقال ہوا ہے میں نے اُسے پکڑا تھا، لیکن امی نے چھڑا دیا اور پھر تھوڑی دیر بعد امی نے مجھے حکم دیا کہ میں جس طرح بھی ہو، اس مکھی کو دوبارہ پکڑ لاؤں۔''

ہنری کی یہ باتیں سن کر میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ مجھے انسپکٹر کی باتوں میں صداقت معلوم ہونے لگی۔ میں کھانے کی میز سے اٹھا اور سیدھا اوپر کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ہر طرف مکھی کو تلاش کیا، کونہ کونہ چھان مارا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔

میں نے اپنے بھائی اور بھابھی کی برسوں پرانی رفاقت پر نظر ڈالی۔ وہ ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی لڑتے نہیں دیکھا۔ ہیلن خوش مزاج تھی، اینڈر بھی ہنس مکھ تھا۔ اسے بچوں اور جانوروں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ وہ بلا کا ذہین اور اپنے کام کا رسیا تھا۔ میں نے آج تک کوئی ایسی حرکت نہیں دیکھی تھی جو اس کے دماغ میں نقص ظاہر کرتی۔ ہیلن کا کردار بھی اعلیٰ اور بے داغ تھا۔ پھر یہ خودکشی یا قتل کیوں؟ میں سوچ سوچ کر تھک گیا۔ انسپکٹر نے جب مکھی کا ذکر کیا، تو میں نے اسے زیادہ وقعت نہیں دی تھی، لیکن ہنری نے سفید سر والی مکھی کا قصہ سنایا تو غور و فکر کی راہیں کھل گئیں۔

میں نے انسپکٹر کو بتائے بغیر خود ہی اس راز پر سے پردہ اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں ہیلن سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں اس نے حکام سے اجازت لے کر چھوٹا سا باغیچہ لگایا ہوا تھا۔ وہ مجھے اسی باغیچے میں لے گئی اور ہم دونوں لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہیلن نے میرے کوٹ کے کالر کو پکڑتے ہوئے بڑی بے چینی سے پوچھا:

''فرانکوائس! خدا کے لیے مجھے ایک بات بتا دو کہ کیا مکھیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں؟''

میں نے چاہا کہ میں ہیلن کو بتا دوں کہ یہی سوال چند گھنٹے پہلے تمھارا لڑکا بھی مجھ سے کر چکا ہے، لیکن خطرہ یہ تھا ہیلن اور زیادہ محتاط ہو جاتی اور جو بات اب کھلنے لگی تھی وہ ہمیشہ کے لیے راز بن جاتی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں مکھیوں کی طویل زندگی کے متعلق تو کچھ نہیں جانتا، البتہ جس مکھی کو تم تلاش کر رہی ہو، وہ صبح میرے مطالعے کے کمرے میں موجود تھی۔''

یہ سنتے ہی ہیلن بے تاب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کبھی مسرت کی سرخی آتی اور کبھی یاس کی زردی چھا جاتی۔ حیرانی سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ لیا اور پھر چیختے ہوئے بولی:

''فرانکوائس! کیا تم نے اس مکھی کو مار دیا ہے؟ وہ جواب سننے کے لیے میرے چہرے کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس مکھی کو نہیں مارا، تو اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

''تو خدارا یہ مکھی مجھے دے دو۔''

ہیلن اس وقت جذبات سے مغلوب تھی۔ وہ مکھی کے لیے اتنی بے چین تھی کہ اس وقت معمولی ذہن کا آدمی بھی اُس سے راز اُگلوا سکتا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا:

''ہیلن، اگر تم اینڈر کے قتل کا صحیح واقعہ بتا دو، تو میں یہ مکھی تمھیں دے سکتا ہوں۔ یہ تفتیش کے پہلے ہی دن سے پولیس انسپکٹر کی تحویل میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم پاگل نہیں ہو، محض اس راز کو چھپانے کے لیے تم نے یہ روپ دھارا ہے۔''

ہیلن نے اپنے سنہری بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا:

''اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اس مکھی کو مار دو گے اور کسی صورت میں بھی اسے زندہ نہیں رہنے دو گے، تو میں اس راز سے پردہ اٹھا دیتی ہوں، لیکن یاد رکھو یہ تمھارے مقتول بھائی کی آخری خواہش ہے۔ اگر اس مکھی کو تم نے نہ مارا، تو اینڈر کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

یہ کہہ کر ہیلن نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پاگل خانے کے بالائی کمرے میں گئی اور بھورے رنگ کا ایک لفافہ دیتے ہوئے بولی:

''اسے رات کو پڑھنا، یہ تمھارے لیے نہیں، پولیس انسپکٹر کے لیے لکھا تھا۔ اگر وہ مکھی مارنے کا وعدہ کر لے تو یہ اسے بھی پڑھنے کے لیے دے دینا۔''

ہیلن جب اپنے کمرے کی طرف لوٹی تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔

گھر آ کر میں نے ملازموں کو بتایا کہ میں آج رات صرف ہلکا سا کھانا کھاؤں گا اور اسے میرے مطالعہ کے کمرے ہی میں پہنچا دیا جائے۔ میں نے لفافے کو میز پر رکھا اور دروازوں، کھڑکیوں کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد بڑی احتیاط سے کمرے کا جائزہ لیا۔ نوکر کھانا میز پر رکھ کر چلا گیا اور میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

لفافہ چاک کرتے ہی میں نے بے چینی سے خط پڑھنا شروع کیا، اس میں لکھا تھا:

''میں نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے، لیکن میں قاتل نہیں۔ میں نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ان کا سر اور دایاں ہاتھ برقی شکنجے میں کچل دیے ہیں۔ اپنی موت سے ایک سال پہلے میرے شوہر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ وزارتِ فضائیہ کے لیے عجیب و غریب تجربات میں مشغول ہے۔ آوازیں اور تصویریں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہیں لیکن وہ ٹھوس مادی اشیا کو آواز کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بہت جلد ایک ایسا ٹرانسمیشن بنا لیں گے جس کے ذریعے خوراک، اشیا اور انسان کو ہوا میں تحلیل کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ آواز سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پہنچایا جا سکے گا۔ اس وقت سفر کے لیے نہ بسوں اور جہازوں کی ضرورت ہو گی اور نہ ہی دنیا سٹیشنوں، بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کی محتاج ہو گی۔ پوری دنیا کے سفر کے لیے سٹیشن بنا دیے جائیں گے اور اس مقصد کے لیے خاص ٹرانسمیشنوں کو استعمال کیا جائے گا۔ نیویارک سے لندن جانے کے لیے نیویارک کے ٹرانسمیشن میں مسافر بیٹھیں گے، بٹن دبایا جائے گا اور تمام مسافر ایک دم ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو جائیں گے اور لمحہ بھر میں لندن کے ریسیونگ سٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔

اینڈر نے اپنی لیبارٹری میں ٹرانسمیشن سے چند فٹ کے فاصلے پر ریسیونگ سیٹ نصب کیا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلا کامیاب تجربہ ایش ٹرے پر کیا۔ اس نے ایش ٹرے میری گود میں پھینک دی اور کہا کہ اسے ٹرانسمیشن مشین میں رکھ دو اور جب میں بٹن دباؤں گا، تو ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے اندر یہ ریسیونگ سیٹ پر پہنچ جائے گی۔

میں نے ایش ٹرے ٹرانسمیشن میں رکھی اور اینڈر نے بٹن دبایا۔ ٹرے ہوا میں تحلیل ہو کر ایٹمی ذرے بن گئی اور پھر سیکنڈ سے بھی کم مدت میں یہ ذرے یکجا ہو کر ایش ٹرے کی صورت میں ریسیونگ سیٹ پر پہنچ گئے۔

میں نے ایش ٹرے ہاتھ میں اُٹھائی، بالکل وہی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے ہنستے ہوئے اینڈر سے کہا ''تم یہ تجربہ کہیں مجھ پر نہ کر بیٹھنا اور میں بھی کہیں ایش ٹرے کی طرح اُلٹ ہو جاؤں؟''

''اُلٹ ہونے سے تمھارا کیا مطلب ہے؟'' اینڈر نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے اسے ایش ٹرے کا پیندا دکھایا جس پر ساختہ جاپان کے الفاظ اُلٹے آ گئے تھے۔

اینڈر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کا تجربہ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ غصے میں لیبارٹری میں چلا گیا اور اگلی صبح تک باہر نہیں نکلا۔ کچھ دنوں بعد اس نے بتایا کہ وہ اب جاندار اشیا کو فضا میں تحلیل کر کے دوسری جگہ زندہ صورت میں پہنچانے کا تجربہ کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً اپنی بلی آ گئی جو کئی روز سے غائب تھی۔ میرے پوچھنے پر اینڈر نے بتایا کہ بلی ٹرانسمیشن کے ذریعے ہوا میں تحلیل تو ہو گئی لیکن ناکام تجربے کے باعث ریسیونگ سیٹ میں نہیں پہنچی۔ اب معلوم نہیں کہ وہ خلا میں کہاں بھٹکتی پھرتی ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

۲ر روز بعد اینڈر نے ایک کتے کے پلے کو آٹھ بار ٹرانسمیشن کے ذریعے ہوا میں تحلیل کیا اور آٹھوں بار مکمل صورت میں ریسیونگ سیٹ پر زندہ پہنچ گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ میری اور اینڈر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایٹم کی اس دنیا میں ایک نیا انقلاب آنے والا تھا۔ میرے شوہر نے جو تجربہ کیا تھا، وہ انسان کی زندگی بدل سکتا تھا۔

میں نے تجویز پیش کی کہ وزارت فضائیہ کے اعلیٰ حکام کو دعوت دی جائے اور اینڈر ان کے سامنے اپنا تجربہ دہرائے، لیکن اینڈر نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی اس تجربے میں خامیاں ہیں اور ٹرانسمیشن کے بہت سے پرزے ایسے ہیں جو خود ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئے اور جب تک وہ خود اپنی ذات پر تجربہ نہیں کر لیتا، وہ اس راز کو فاش نہیں کرے گا۔

اور پھر وہ ہولناک دن آیا جس نے مجھ سے شوہر، ہنری سے باپ اور فرانکوائس سے اس کا بھائی چھین لیا۔ اس صبح اینڈر اس خطرناک تجربے کے لیے اپنی لیبارٹری میں گیا اور دوپہر کو کھانے پر واپس نہیں آیا۔ میں نے خادمہ کو کھانا دے کر بھیجا لیکن وہ واپس آ گئی۔ اس نے ایک رقعہ دیا جو لیبارٹری کے دروازے پر باہر کی جانب لگا ہوا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں کام میں بہت مصروف ہوں، کوئی بھی مخل نہ ہو۔

اُن کا معمول تھا کہ جب وہ بہت زیادہ مصروف ہوتے، تو دروازے پر اس قسم کے نوٹس پن سے لگا دیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں قہوہ پی رہی تھی کہ ہنری ناچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مٹھی میں ایک مکھی پکڑی ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا ''امی! یہ دیکھو سفید سر کی مکھی ہے، اس کی ٹانگیں بھی عجیب طرح کی ہیں۔''

''ہنری! اسے چھوڑ دو۔ مکھی پکڑنا کوئی اچھی عادت نہیں۔'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ ہنری کا باپ جانوروں پر ظلم برداشت نہیں کرتا اور اُسے جونہی معلوم ہوگا کہ ہنری نے مکھی کو ڈبیا میں بند کر رکھا ہے تو وہ ناراض ہوگا۔

شام کے کھانے پر بھی جب اینڈر نہیں آیا، تو مجھے تشویش ہوئی اور میں دوڑتی ہوئی لیبارٹری پہنچی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہیں ملا، لیکن اندر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازے سے باہر ایک چٹ گری جو ٹائپ کی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا تھا:

''ہیلن! میں اس وقت سخت تکلیف میں ہوں۔ ہنری کو سلا دو اور پھر ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤ۔''

میں سہم گئی۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں، لیکن اینڈر نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں گھر لوٹ آئی، ہنری کو سلا دیا اور بے چین ہو کر لیبارٹری کے دروازے پر لوٹ آئی، وہاں ایک اور چٹ پڑی تھی:

''ہیلن تم اپنے اعصاب پر قابو رکھو اور جو کچھ میں کہتا ہوں، وہی کرو۔ اس تکلیف میں صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔ میں اس وقت زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔ مجھے پکارنا اور مجھ سے کچھ کہنا بے کار ہے۔ میں جواب نہیں دے سکتا۔ میں بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ اگر تم میری مدد کرنا چاہتی ہو تو دروازے پر ۳ر بار دستک دو۔ میں سمجھوں گا کہ تم مدد کے لیے تیار ہو۔ میں نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ دودھ کا ایک گلاس لا دو۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

میں نے دروازے پر ۳ر بار دستک دے کر پورے تعاون کا یقین دلایا اور خوف و ہراس کے عالم میں دودھ لانے کے لیے دوڑی، میں ۵ر منٹ ہی میں واپس آ گئی۔ دروازے پر ایک اور چٹ لگی تھی:

''ہیلن! میری ہدایات پر احتیاط سے عمل کرو۔ تم جب دستک دو گی، میں دروازہ کھول دوں گا۔ تم سیدھی میز کی طرف جاؤ، وہاں دودھ کا گلاس رکھ دو اور پھر دوسرے کمرے میں، جہاں ریسیونگ سیٹ ہے، چلی جاؤ، وہاں ایک مکھی کو تلاش کرو۔ میں بہت ڈھونڈ چکا ہوں، نہیں ملی۔ اب مجھے چھوٹی چیزیں نظر بھی نہیں آتیں۔ جب تم کمرے میں داخل ہو تو مجھے دیکھنے کی کوشش مت کرنا اور نہ ہی بات کرنے کی۔ اور اب تم ۳ر بار پھر دستک دو تاکہ میں دروازہ کھول دوں۔''

میں نے ۳ر بار دستک دی، دروازہ کھل گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ اینڈر دروازے کے پیچھے کھڑا ہے۔ میں نے میز پر دودھ کا گلاس رکھا اور سیدھی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے اس کمرے میں کوئی طوفان آیا ہوا ہے، بہت سے کاغذات جلے ہوئے تھے، کرسیاں اور ٹیسٹ ٹیوبیں بکھری پڑی تھیں اور کھڑکیوں کے پردے اُترے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کرلیا کہ یہاں مکھی کی تلاش بے کار ہے۔ یہ وہی مکھی ہے جو ہنری پکڑ کر لایا تھا اور میں نے جسے اُڑا دیا تھا۔

اینڈر جب دودھ پی رہا تھا، اس کے منہ اور گلے کی دھیمی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے دودھ پینے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔

''اینڈر، مجھے مکھی نہیں مل رہی۔ میں تمھارے پاس آنا چاہتی ہوں۔ میں بے چین ہوں۔ تمھیں آخر کیا ہوگیا ہے؟ تم بتاتے کیوں نہیں؟ یہ کہہ کر میں آگے بڑھی۔ اینڈر نے اپنے بازو، چہرے اور سر کو مخمل کے اس ٹکڑے سے ڈھانپ رکھا تھا جو عموماً کھانے کی میز پر بچھا رہتا تھا۔

''ہنری نے آج صبح ایک مکھی پکڑی تھی، وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا لیکن میں نے اُسے اڑوا دیا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں لیکن ہنری کہتا ہے کہ اس کا سر سفید تھا۔ تمھیں کہیں اس مکھی کی تو تلاش نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اینڈر نے ٹھنڈی سانس لی اور اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹک گیا۔ میں نے خوف اور دہشت کے مارے اپنے ہونٹوں کو کاٹ لیا۔ اُف خدایا! میرے اینڈر کا بازو لمبی انگلیوں اور گوشت کا بنا ہوا تھا۔ وہ گھٹنوں سے نیچے لٹک رہا تھا اور ایک سُوکھے درخت کی شاخ معلوم ہو رہا تھا جس میں بہت سی خشک جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

میں یہ منظر دیکھ کر تڑپ گئی۔ میں نے عاجزی کے ساتھ اینڈر سے حقیقتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے اس خوفناک ہاتھ کے اشارے سے مجھے باہر جانے کا حکم دیا۔ میں باہر آگئی۔ اینڈر نے دروازہ بند کر

مصنوعی دماغ

معروف انٹرنیٹ کمپنی گوگل نے پہلا مصنوعی دماغ بنانے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دماغ ۱۶ر ہزار پروسیسرز پر مشتمل ہے اور یہ یوٹیوب کی ۱۰ر ملین تصاویر پر انحصار کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنے کام کا آغاز بلی کو پہچاننے سے کیا ہے۔

لیا۔ ٹائپ مشین چلنے لگی اور ایک منٹ بعد اینڈر نے دروازے سے باہر ایک چٹ پھینکی:

''ہیلن! تم کل صبح واپس آنا۔ میں اس واقعے کی پوری وضاحت ٹائپ کرلوں گا۔ تم نیند لانے والی ایک ٹکیہ کھا کر سو رہو۔ میں صبح تمھیں تازہ دم دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے ۸ بجے کا الارم لگا دیا، لیکن جب آنکھ کھلی تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، غالباً خواب آور گولیوں کی وجہ سے آنکھ نہیں کھلی۔ میں جلدی سے باورچی خانے میں گئی، ایک ٹرے میں قہوہ، ڈبل روٹی اور مکھن رکھا اور لیبارٹری کی جانب بڑھنے لگی۔ دروازہ بند تھا۔ ۳ر بار دستک دینے سے اینڈر نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے ٹرے کو میز پر رکھا اور ٹائپ رائٹر کے پاس سے کاغذات اٹھا کر پڑھنے لگی۔ اینڈر نے دوسرا دروازہ کھولا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ تنہا رہنا چاہتا ہے۔ میں کاغذات لے کر اس کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کرلیا اور قہوہ پینے لگا۔

میں نے ٹائپ کیے ہوئے کاغذات پڑھنے شروع کیے:

''تمھیں ایش ٹرے کا تجربہ یاد ہوگا جس کے حروف اُلٹ گئے تھے۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہے۔ میں نے پچھلی رات یہ تجربہ اپنے اوپر کیا اور خود کو ٹرانسمیٹر کے ذریعے تحلیل کرلیا لیکن بدقسمتی سے اس وقت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ٹرانسمیشن میں ایک مکھی بھی تھی جسے میں نے نہیں دیکھا تھا، وہ بھی میرے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ اب میری صرف یہ خواہش ہے کہ ایک بار اس مکھی کے ساتھ دوبارہ تحلیل ہو جاؤں۔ خدارا تم اسے ڈھونڈو، اگر وہ نہ ملی تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا اور شاید میری جان بھی۔''

میں نے اس سے کہا کہ میں مکھی کو ڈھونڈنے میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گی، لیکن اگر تمھاری شکل و صورت بدل گئی ہو تو بھی خوف کی کیا بات ہے۔ تم میرے شوہر ہو، کسی رُوپ میں بھی ہو، میں تمھیں پیار کرتی رہوں گی۔ تم دل برداشتہ نہ ہو، خدا کے لیے مجھے اپنا چہرہ دکھا دو، میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ جب تک تم اپنی اصل صورت میں نہیں آجاتے، میں کسی سے بھی ذکر نہیں کروں گی۔''

لیکن اینڈر نے اس بات کا جواب نہیں دیا اور اشارے سے مجھے مکھی تلاش کرنے کا حکم دیا۔

میں نے گھر آتے ہی تمام ملازمین کو حکم دیا کہ پروفیسر صاحب کی لیبارٹری سے ایک مکھی بھاگ گئی ہے، سب اُسے تلاش کریں اور زندہ پکڑ کر لائیں۔ وہ سب اس بات پر ہنسنے لگے۔ بعد میں پولیس کو انھوں نے جو بیانات دیے، ان میں اس مکھی کا ذکر تھا اور شاید یہی بات مجھے تختۂ دار سے بچا گئی۔

میں دن بھر مکھیاں پکڑتی رہی۔ میں نے جام، چٹنی، گوشت اور شہد یعنی ہر وہ چیز جس پر مکھیاں ٹوٹ سکتی تھیں، کئی جگہ بکھیر دیں، لیکن جو مکھی ہنری لایا تھا اور جسے میں نے اُڑوا دیا تھا، وہ دوبارہ نہیں ملی۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہیں تھی، میرا اضطراب بڑھنے لگا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا؟

شام کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ میں لیبارٹری گئی، ساتھ کچھ مکھیاں بھی لے گئی، لیکن اینڈر نے ان تمام کو واپس کر دیا۔ انھوں نے ابھی تک اپنے چہرے اور بازوؤں کو مخمل کے ٹکڑے سے چھپا رکھا تھا۔ وہ ہر بات کا جواب لکھ کر دیتے یا میز پر ہاتھ مار کر۔ میں نے انھیں دلاسا دینا چاہا کہ اگر مکھی نہ ملی، تو وہ زندگی سے مایوس نہ ہوں، انھیں زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ننھا ہنری ابھی قدم قدم پر باپ کی اعانت کا محتاج ہے۔ خود میری زندگی ویران ہو کر رہ جائے گی۔

میں نے ان سے کہا ''آپ زندہ ہیں، آپ کا دماغ موجود ہے، آپ سوچ سکتے ہیں، آپ کی روح بھی ہے، اگر شکل بدل گئی ہے، تو کیا ہوا...... میں اور میرا لڑکا آپ کو اسی روپ میں دیکھ کر خوش رہیں گے۔''

اینڈر نے فوراً ٹائپ کرنا شروع کیا اور ایک منٹ بعد ٹائپ کی ہوئی چٹ میری جانب پھینک دی۔ اس پر لکھا تھا:

''میں زندہ ہوں، یہ درست ہے، لیکن اب میں مکمل طور پر انسان نہیں رہا۔ میرا دماغ ماؤف ہو جائے گا اور میری روح بے کار ہو جائے گی۔''

میں نے کہا کہ میں دوسرے سائنسدانوں کو بلاتی ہوں، وہ آپ کو دوبارہ اصلی حالت پر لانے کی جدوجہد کریں گے، لیکن اینڈر نے زور زور سے میز پر مکّے مار کر اپنی ناراضی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے لیے قطعاً آمادہ نہیں تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

میں نے ایک تجویز پیش کی ''آپ ایک بار اور ٹرانسمیشن میں بیٹھ کر خود کو ہوا میں تحلیل کریں۔ ممکن ہے اس بار آپ اپنی اصل حالت میں آجائیں۔''

''میں ۷ بار یہ تجربہ دہرا چکا ہوں اور آٹھویں بار اُسی مکھی کے ساتھ ٹرانسمیشن میں جانا چاہتا ہوں، لیکن تمھارے کہنے سے میں آخری بار ٹرانسمیشن میں جاتا ہوں۔ تم میری طرف پشت کر کے کھڑی ہو جاؤ۔''

میں نے کمرے میں چندھیا دینے والی روشنی دیکھی اور ٹرانسمیشن کے چلنے کی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ اینڈر ہوا میں تحلیل ہونے کے بعد ریسوریسیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کا سر اور مونڈھے اب بھی مخمل میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بازو کو چھوتے ہوئے بے چینی سے پوچھا:

''تم کیسے ہو؟ کیا تم میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی؟ کیا تم مکمل طور پر انسانی شکل میں آگئے ہو؟''

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور پاس پڑے ہوئے ایک سٹول سے اُلجھ کر گر پڑا۔ مخمل کا ٹکڑا اس کے سر اور شانوں سے سرک گیا تھا۔ اُف! میری آنکھوں نے اسی وقت جو ہولناک منظر دیکھا، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ مجھ پر خوف اور دہشت کے مارے غشی طاری ہونے لگی، لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں دھاڑیں مار کر رونے لگی، میں نے اپنے ناخنوں سے اپنے منہ کو نوچ لیا۔ میرے ہاتھ میرے ہی خون سے سُرخ ہو گئے۔ میری آنکھیں اینڈر کے چہرے کو دیکھ سکتی تھیں اور نہ ہی میں انھیں بند کر سکتی تھی۔ اگر میں یہ منظر کچھ دیر اور دیکھتی رہتی، تو یقیناً موت کی آغوش میں چلی جاتی۔

اینڈر نے اس مخمل کے ٹکڑے سے دوبارہ اپنے منہ کو ڈھانپ لیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں جب تک زندہ ہوں، وہ دہشت ناک منظر کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ اُس کے سفید بالوں والے سر کے دونوں طرف ۴ر بڑے بڑے بلی کے کان اُگے ہوئے تھے، ناک بھی بلی ہی کی تھی۔ آنکھوں کی جگہ کالی کالی چھوٹی سی طشتریاں بنی ہوئی تھیں اور منہ کے بجائے بلی کی سونڈ لگی ہوئی تھی۔

اینڈر دوسرے کمرے میں کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ دو منٹ کے بعد اس نے میرے کمرے میں ایک چٹ پھینکی، جس میں لکھا تھا:

''میری ہیلن، یہ آخری تجربہ تو اور بھی خطرناک ثابت ہوا۔ پہلے ٹرانسمیشن میں مکھی بیٹھی تھی اور تحلیل ہوتے وقت اس کے کچھ اعضا میرے جسم سے چپک گئے تھے اور اب آخری بار تحلیل ہونے پر اُس بلی کے کان اور آنکھیں بھی میرے منہ پر لگ گئے ہیں جسے میں نے کئی ہفتے پہلے تجربے کے طور پر ٹرانسمیشن کے ذریعے ہوا میں تحلیل کیا تھا۔ اب میں تمھیں آخری بار ہدایت کرتا ہوں کہ تم برقی شکنجے کے ذریعے ان غیر فطری اعضا کو کچل دو۔ بلی اور مکھی کے یہ حصے میرے نہیں ہیں۔ یہ ایٹم میں تحلیل ہو کر مجھ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ یہ میری آخری خواہش ہے، خدا کے لیے اسے رد نہ کرنا۔''

اینڈر نے اپنے بازو کو برقی شکنجے میں رکھا اور مجھے اشارے سے بتایا کہ بٹن کو دباؤ۔ جونہی بٹن کے دباؤ سے سوئی صفر پر پہنچے گی شکنجہ میرے بازو کو کچل دے گا۔ نامعلوم جذبے اور خوف کے ساتھ میں نے کسی تامل کے بغیر بٹن دبا دیا۔ سوئی صفر پر پہنچی تو شکنجے میں حرکت پیدا ہوئی، اینڈر کا بازو کچل کر گوشت بن گیا۔ اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ دوسری بار اپنے سر کو برقی شکنجے میں دے دیا اور میں بٹن دوبارہ دبانے پر مجبور ہو گئی۔ سوئی صفر پر پہنچی اور میرا اینڈر ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو گیا۔

میں نے یہ قتل اپنے پیارے شوہر کی آخری خواہش کی تکمیل میں کیا ہے۔ اس لحاظ سے میں قاتل ضرور ہوں۔

ہیلن کی یہ کہانی پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں نے پولیس انسپکٹر کو ٹیلی فون پر شام کو چائے پینے کی دعوت دی۔ شام کو چائے کے بعد میں اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے آیا اور اُسے ہیلن کا خط دکھایا، وہ اسے بغور پڑھتا رہا۔ ۲۰ر منٹ بعد اس نے یہ خط مجھے واپس کر دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈال دیا۔

میں نے انسپکٹر کو بتایا کہ آج صبح جب میں قبرستان میں گیا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

انسپکٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''اس وقت تم اپنے بھائی کی قبر پر دیا سلائی کی ایک ڈبیا جلا رہے تھے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اور اس ڈبیا میں ایک مکھی تھی۔'' انسپکٹر نے مجھے یہ بتا کر اور بھی حیران کر دیا۔ ''لیکن یہ مکھی زندہ تھی یا مر چکی تھی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''میں جب قبرستان آیا، تو سفید سر والی یہ مکھی، مکڑی کے ایک جالے میں پھنسی ہوئی تھی اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اُسے پکڑ لیا اور ایک پتھر پر رکھ کر دوسرے پتھر سے اس کا سر کچل دیا اور پھر اسے دیا سلائی کی ڈبیا میں بند کرنے کے بعد اسے آگ لگا دی...... آخر میرے بھائی کی موت کی ذمے دار یہی تو تھی۔''

چین کی لوک کہانی

خوش رنگ پھول

قدیم چین کے ایک ولی عہد نے اپنی دُلھن کی تلاش کے لیے انوکھا فیصلہ کیا تھا

کرن خالد

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

چین کی ایک قدیم لوک کہانی ہے۔ ایک ریاست کے کنوارے ولی عہد کو عنان حکومت سنبھالنے سے پہلے ریاست کے قانون کے مطابق شادی کرنا تھی۔ شہزادے نے اپنے وزیر باتدبیر کے مشورے سے شریک حیات کے انتخاب کے لیے انوکھا طریقہ اپنایا۔ اعلان کیا گیا کہ شہر کے تمام اعلیٰ نسب گھرانوں کی خوبصورت لڑکیاں مقررہ دن محل کے احاطے میں آجائیں تاکہ شہزادہ اپنے لیے شریک حیات کا انتخاب کرسکے۔ محل کے اندر کام کرنے والی ایک غریب عورت کی بیٹی نے بھی یہ اعلان سنا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی غربت اور کم صورتی کے باوجود اس روز ان خوبصورت اور امیر گھرانوں کی لڑکیاں کی قطار میں ضرور کھڑی ہوگی تاکہ شہزادہ جسے وہ اپنے دل میں چاہتی تھی، ایک نظر اس پر ضرور ڈالے۔ مقررہ دن محل کے احاطے میں ملکہ بننے کی خواہش مند شہر بھر کی ایک سے ایک حسین اور امیر لڑکی

شہزادے کی نظر انتخاب کی منتظر تھی۔ انھی کی قطار میں محل کی نوکرانی کی غریب اور کم صورت لڑکی کھڑی تھی۔ سیکڑوں لڑکیوں کے درمیان انتخاب مشکل تھا۔ اس موقع پر پھر وزیر باتدبیر کا مشورہ کام آیا۔ تمام لڑکیوں کو ایک ایک مٹی کا برتن اور پھولوں کا ایک ایک بیج دیا گیا۔ انھیں کہا گیا کہ ۲ر مہینے کے بعد وہ سب اپنے اپنے گملے کے ساتھ دوبارہ محل میں آئیں جس کا پھول زیادہ خوش رنگ، زیادہ کھلا ہوا ہوگا شہزادہ اسی خوش قسمت لڑکی کو ملکہ بنائے گا۔ کم صورت غریب لڑکی بیج اور مٹی کا گملا لیے اپنے خستہ حال مکان میں لوٹ آئی۔ بیج مٹی میں بویا، پانی دیا، دھوپ چھاؤں کا دھیان رکھا لیکن اس کے گملے میں سبزے کی رمق نہ پھوٹی کجا کہ کوئی خوش رنگ تازہ پھول اپنی بہار دکھاتا۔ اپنی کم قسمتی پر راضی۔ وہ لڑکی مقررہ دن پھر محل کے احاطے میں پہنچی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس معاملے میں بھی وہ کم نصیب واقع ہوئی ہے، ہر خوبصورت لڑکی اپنے ہاتھ میں پکڑے مٹی کے گملے میں ایک بہترین، مشکبار پھول لیے فخر و انبساط سے کھڑی تھی جبکہ وہ اپنا خالی گملا لیے سر جھکائے ایک جانب اپنی سوچ میں گم چپ چاپ کھڑی تھی۔ شہزادہ آیا، اس کی نگاہِ انتخاب ایک چہرے اور ایک خوش رنگ پھول سے ہوتی ہوئی دوسرے پھول اور دوسرے خوب صورت چہرے پر پھسلتی رہی مگر شہزادے نے اپنے لیے اس لڑکی کا انتخاب کیا جو اپنی کم صورتی اور کم قسمتی پر راضی، مٹی کا خالی گملا ہاتھ میں اٹھائے چپ چاپ ان قطاروں کے آخر میں کھڑی تھی۔ مجمع انگشت بدنداں تھا اور اس فیصلے کی وجہ جاننے کو حیران کھڑا تھا۔ شہزادے نے بتایا کہ اس کم صورت لڑکی کے گملے میں دیانت اور سچائی کا خوش رنگ گلاب کھلا ہوا ہے اس لیے کہ ایک ایک بیج جو سب لڑکیوں میں تقسیم کیا گیا تھا وہ بنجر تھا اور روئیدگی کے قابل نہ تھا۔ اس کے بنجر وجود سے سبزہ نہیں پھوٹ سکتا تھا۔ صرف اس لڑکی نے دیانت اور سچائی سے اس بنجر بیج کی آبیاری کی جبکہ باقی تمام نے جھوٹ اور بددیانتی سے بنجر بیج کی جگہ دوسرے بیج مٹی میں بوئے۔ ■

سالانہ خریداروں کے لیے خصوصی آفر

معزز قارئین......!

اردو ڈائجسٹ کی قیمت میں اضافے کے ناگزیر فیصلے کے باوجود ادارے نے اپنے سالانہ خریداروں کی سہولت کے لیے یہ طے کیا ہے کہ وہ پرانی قیمت -/750 روپے سالانہ کی ادائی کرکے اپنی خریداری جاری رکھ سکتے ہیں۔

اگر آپ ابھی سالانہ خریدار نہیں ہیں تو فی الفور اس خصوصی آفر کا فائدہ اٹھایئے اور پایئے خصوصی بچت اور سہولت۔

آپ اردو ڈائجسٹ کے نام -/1440 کے بجائے -/750 روپے کا منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھجوا کر سال بھر کے لیے گھر بیٹھے پرچہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اس دوران قیمت میں ردوبدل کا آپ پر اثر نہیں پڑے گا۔ آپ ۲ر سال کے لیے خریداری بھی کرسکتے ہیں۔

یہ آفر صرف ۳ر ماہ کے لیے ہے

سرکولیشن مینیجر

ایک ماں کی بے قراری کا ماجرا
راج دُلارا
اُس نے بہت دِنوں بعد
ایک ماں کا دُکھ سمجھا تھا
نذیر انبالوی

”توبہ

ہے بہن...... توبہ، توبہ۔“ کلثوم نے ہاتھ کو ملتے ہوئے رضیہ سے کہا۔

”قیامت کی نشانی ہے، قیامت کی۔“ رضیہ بولی۔

”اللہ معاف کرے۔“

”اللہ گاؤں کو کسی عذاب سے محفوظ رکھے۔“

”میرے پردادا کے زمانے میں بھی ایسا واقعہ ہوا تھا۔“

”تو پھر کیا ہوا تھا؟“

”اُس سال اتنا سیلاب آیا تھا کہ سب کچھ بہا کر لے گیا تھا۔ میرا بڑا بھائی بھی سیلاب لے گیا تھا۔ ثریا بہن کچھ صدقہ کرو۔“ کلثوم نے شوکت حجام کی بیوی کو مخاطب کیا تھا۔

”شوکت کو بلانے کے لیے کرامت کو بڑی سڑک پر بھیجا ہے۔ ابھی آجائے گا وہی کچھ آکر کرے گا۔“

”ہائے میں مرگئی، اللہ توبہ......“ یہ آواز جمیلہ کی تھی۔

”یہ بچے گا نہیں۔“ کلثوم بولی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ رضیہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اللہ ہمارے گاؤں پر کوئی عذاب نازل نہ کرنا۔“

شوکت کے ہاں عجیب الخلقت بچھڑے کی پیدائش کا سن کر کھیتوں میں کام کرتے مرد بھی آگئے تھے۔ شوکت جب آیا تو اس کے گھر میں میلہ لگا ہوا تھا۔ گائے تماشائیوں سے بے نیاز اپنے بچے کو اپنی زبان سے چاٹ رہی تھی۔

”دیکھو گائے کو اپنے عجیب و غریب بچے پر کتنا پیار آ رہا ہے۔“ جمیلہ نے کہا۔

”آخر ماں جو ہوئی، شوکت بھائی صدقہ دو صدقہ، اس بچھڑے کا ہونا نیک شگون نہیں ہے۔“

”میں شام کو میٹھے چاول پکوا کر بچوں میں بانٹ دوں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”شوکت بھائی یہ بچھڑا تو بس مہمان ہے مہمان۔“ بابا سراج نے کہا۔

”کیا مطلب چاچا؟“ شوکت بولا۔

”ایسی مخلوق زیادہ زندہ نہیں رہتی، سارے گاؤں کو توبہ کرنی چاہیے۔“ بابا سراج کی بات ابھی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ کرامت نے اشارے سے شوکت کو برآمدے میں بلا لیا۔

”بول کیا بات ہے؟“

”ابا! کیوں لوگوں کی باتوں میں وقت ضائع کر رہا ہے۔“

”تو پھر کیا کروں؟“

”پیسے کما پیسے۔“

”کیسے پیسے کماؤں؟“

”ابا! تجھے یاد ہے کئی سال پہلے بکروں کا ایک بیوپاری گاؤں سے ایک بکرا خرید کر شہر لے کر گیا تھا۔“

”ہاں...... ہاں یاد آیا جس پر لفظ اللہ لکھا ہوا تھا۔“

”بالکل وہی کر، اس بیوپاری نے پہلے تو شہر میں ٹکٹ لگا کر پیسے کمائے تھے اور پھر وہی بکرا ۱۰۰۰ ہزار میں بیچ دیا تھا۔“

”میں اب سمجھا تو کیا چاہتا ہے۔“

”ابا تو وقت برباد نہ کر، جلدی کر کہیں یہ بچھڑا مر نہ جائے، ہم اس کو شہر لے جاتے ہیں۔“

”ہاں تُو ٹھیک کہتا ہے، مگر بچھڑے کو شہر کس طرح اور کس کے پاس لے کر جائیں گے۔“

”تُو اس کی فکر نہ کر، جمیل کس دن کام آئے گا۔ اس کا شہر میں مکان ہے۔ وہ اس وقت اپنی کمپنی کے ٹرک کے ساتھ گاؤں میں موجود بھی ہے۔“

”کیا وہ مان جائے گا؟“

”کیوں نہیں مانے گا، اس کو کچھ دے دلا دیں گے۔“

انھوں نے ثریا کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ شام کے وقت بچھڑے کو شہر لے جایا جانے لگا تو گائے بے قرار ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہ مسلسل اپنے بچے پر تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنے بچے کی طرف بڑھی، مگر گلے میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پڑی رسی اس کو جکڑ لیتی۔ اپنے بچے کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک بولتی رہی مگر یہاں اس کی کون سننے والا تھا۔ شہر میں گائے کے عجیب الخلقت بچھڑے کی موجودگی کا علم اخبار والوں کو بھی ہو گیا تھا۔ اگلے دن اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ جلال نگر میں ایک حجام کے ہاں گائے نے ایک ایسا بچھڑا جنا ہے جس کے ۴؍ کان اور ۸؍ ٹانگیں ہیں۔ حجام شوکت یہ بچھڑا لے کر شہر آیا ہوا ہے۔ یہ خبر چھپنے کی دیر تھی کہ سارا شہر اس بچھڑے کو دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ ۱۰؍ روپے ٹکٹ لگانے سے بہت سا پیسا شوکت کی جیب میں آ گیا تھا۔ اتنا پیسا تو وہ سارا سال بھی نہیں کماتا تھا۔

۲؍ دن بعد دوپہر کے وقت ۲؍ شخص کلف لگے کپڑے پہنے ہوئے، بچھڑے کو دیکھنے آئے۔

”استاد! بہت کام کی چیز ہے۔“ رب نواز بولا۔

”کیا خیال ہے سودا کر لیں۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”خیال بُرا نہیں ہے۔“

”کہیں یہ بچھڑا جلد مر نہ جائے۔“

”نہیں مرتا یہ بچھڑا، پہلے بھی تو ایک سال سے ایسا ہی ایک بچھڑا ہماری سرکس میں ہے۔“

”چلو بھئی چلو وقت ختم ہو گیا...... چلو...... چلو“ شوکت نے آواز لگائی۔

”اس بچھڑے کا مالک کون ہے؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”میں ہوں جی۔“

”اچھا تو تم ہو اس بچھڑے کے مالک۔“ شہزاد نے شوکت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی...... جی...... میں ہی ہوں اس بچھڑے کا مالک...... کیا ہوا ہے؟“ شوکت گھبرا سا گیا۔

”گھبراؤ مت کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ کیا یہ بچھڑا بیچو گے؟“

یہ سوال سن کر شوکت سوچ میں پڑ گیا۔

”ہم تمھیں اس بچھڑے کے معقول پیسے دیں گے۔“

”کتنے پیسے دو گے؟“

”ہم تمھیں اس بچھڑے کے ۲؍ لاکھ روپے دے سکتے ہیں۔“

”یہ تو بہت کم ہیں۔“

”چلو دس پندرہ ہزار روپے اور بڑھا لو۔“

”میں یہ بچھڑا اتنے پیسوں میں نہیں بیچوں گا۔“

شہزاد اور رب نواز کافی دیر تک باہر نہ آئے تو کرامت جو باہر لوگوں سے پیسے وصول کر رہا تھا اندر آ کر بولا۔

”پا......! کیا بات ہے؟“

اس کے جواب میں شوکت نے اسے ساری بات بتائی تو کرامت بولا۔

”ہم تو اس بچھڑے کے ۳؍ لاکھ روپے لیں گے۔“

”ہم تمھیں ۲؍ لاکھ ۲۰؍ ہزار روپے دے سکتے ہیں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو اگر ارادہ ہو تو رابطہ کر لینا۔“ شہزاد نے کارڈ شوکت کو دیتے ہوئے کہا۔

ایک ہفتے میں انھیں ۳۰؍ ہزار روپے کی آمدنی ہو چکی تھی۔ اب دیکھنے والوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔ گاؤں واپس جانے سے قبل وہ بچھڑا سرکس کے مالک کو ۲؍ لاکھ ۷۰؍ ہزار روپے میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شوکت نے شہر سے ثریا کے لیے بہت سے نئے کپڑے خریدے اور بھائی کے ہمراہ گاؤں چل پڑا۔

”بچھڑا کہاں ہے؟“ دونوں خالی ہاتھ گھر پہنچے تو ثریا نے سوال کیا تھا۔

”بچھڑا تو سرکس والوں کو بیچ دیا ہے۔“

”کتنے میں؟“

”۲؍ لاکھ ۷۰؍ ہزار روپے میں۔“ شوکت نے سرگوشی کی۔

”۲؍ لاکھ ۷۰؍ ہزار روپے میں، کہاں ہیں روپے؟“

”میرے پاس، کسی کو ان پیسوں کی کانوں کان خبر نہ ہو، ہم نے جمیل کو بھی بتایا ہے کہ بچھڑا ۵۰؍ ہزار روپے میں بیچا ہے۔“

”اس کرامت کو بھی سمجھا دینا تھا کہیں گاؤں میں ان

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پیسوں کا ڈھنڈورا نہ پیٹ دے۔''

''بھائی! تم فکر ہی نہ کرو، ان پیسوں سے ہم اپنا مکان ٹھیک کریں گے، یا اپنی پکی دُکان بنائے گا۔''

''اور میں سونے کی چوڑیاں بناؤں گی۔'' ثریا نے کرامت کی بات بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔

''ہاں...... ہاں بنوا لینا سونے کی چوڑیاں۔'' شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تینوں بہت خوش تھے۔ اداس تھی تو بچھڑے کی ماں۔ جس دن سے بچھڑا گیا تھا۔ اس نے کھانا پینا کم کر دیا تھا۔ ہر وقت اداس اداس دیوار کے ساتھ بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو اس کے دل کی کیفیت کی چغلی کھاتے تھے۔ اس کے دودھ کی مقدار بھی کم ہو گئی تھی۔ ثریا ہی اس کو چارہ ڈالتی تھی۔ جب گائے چارہ نہ کھاتی تو وہ اس کو مخاطب کرتی۔

''کھا لے...... کھا لے...... کب تک بدصورت اور عجیب و غریب بچے کا سوگ مناؤ گی...... چارہ کھا لے...... اللہ اور دے گا۔ ۴ر کانوں اور ۸ر ٹانگوں والا بچہ تمھارے ساتھ کیا اچھا لگتا...... اداس مت ہو...... لے ہرا ہرا چارہ کھا لے۔'' گائے تھوڑا سا چارہ کھاتی اور پھر دیوار کے ساتھ بیٹھ جاتی۔

پچھلے کمرے کو گرا کر نیا پکا کمرا بنانے کا کام شروع ہوا تو گاؤں والوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ شوکت نے بچھڑا بیچ دیا ہے۔ ہر کوئی اس کی قیمت کا اندازہ اپنے اپنے انداز میں لگا رہا تھا۔ ثریا کی سونے کی چوڑیاں گاؤں کی عورتوں کے لیے موضوعِ بحث بنی ہوئی تھیں۔ جب ایک دن بے اختیار ثریا کی زبان سے بچھڑے کی اصل قیمت نکلی تو کلثوم بولی۔

''تم لوگوں نے اس بے زبان گائے پر ظلم کیا ہے۔ اس کا بچہ بیچ کر آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ تمھیں اپنے عذاب سے بچائے۔''

''کلثوم ایسی بات مت کرنا۔'' ثریا بولی۔

''اگر تو خود ماں ہوتی تو بچے کی جدائی کا احساس ہوتا۔'' کلثوم کی یہ بات سن کر ثریا خاموش ہو گئی کیوں کہ شادی کے ۱۰ر سال بعد بھی اس آنگن میں کوئی پھول نہ کھلا تھا۔ گائے دن میں کبھی کبھار ہی بول کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھی ورنہ وہ کسی گہری سوچ میں گم دیوار کے ساتھ دیوار بنی رہتی تھی۔ وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی تھی۔ جب گاؤں میں جانوروں کے علاج کا موبائل ہسپتال آیا تو شوکت نے گائے کو ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اس نے گائے کو انجکشن لگانے کے بعد کہا تھا کہ یہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ گائے کو کوئی جسمانی بیماری ہوتی تو وہ علاج کے بعد تندرست ہو جاتی۔ اس کے تو دل پر گہرا زخم لگا تھا، اپنے بچے کی جدائی کا غم۔ ایسا گہرا زخم جو ایک سال گزرنے کے بعد بھی نہ بھر سکا تھا۔ ایسے زخم بھلا کب جلدی بھرتے ہیں۔ سال بعد پھر گاؤں کے لوگ شوکت کے گھر جمع تھے۔ سب توبہ توبہ کرتے کانوں کو ہاتھ لگا

عبداللہ بن جعفر حج کے لیے مکہ معظمہ گیا۔ اُس کے ساتھ خدم و حشم کی ایک بڑی تعداد تھی۔ یہ لوگ رات کو وہاں پہنچے۔ صبح عبداللہ نے مکہ کے بعض زوسا سے کہا:

''اے اہلِ مکہ! ہم نے ایک ہی رات میں تمھارے نیکوں اور شریروں کو جان لیا ہے۔''

اُنھوں نے کہا ''ایسا کیونکر ممکن ہے؟''

عبداللہ نے کہا ''ہمارے ساتھ نیک لوگ بھی تھے اور بد بھی۔ جب ہم رات کو یہاں پہنچے تو ہمارے نیک لوگ تمھارے نیک لوگوں کے پاس چلے گئے اور ہمارے بُرے لوگ تمھارے بُرے لوگوں کے پاس چلے گئے۔

سو ہم نے جان لیا کہ کون نیک ہے اور کون بد۔''

رہے تھے۔ شوکت کے ہاں ایک عجیب الخلقت بچے نے جنم لیا تھا۔ جس کے ۴ کان اور ۴ ٹانگیں تھیں۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بچھڑے کو گائے سے جدا کرنے کی سزا دی ہے۔ ثریا بچے کو محبت سے چوم رہی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے گائے اور اس کا بچھڑا آ گیا تھا۔ اس نے کلثوم کے کان میں کچھ کہا تو وہ باہر چلی گئی۔ وہ کچھ دیر بعد واپس آ کر بولی۔

''گائے اس طرح خاموش دیوار کے ساتھ بیٹھی ہے۔ چارہ بھی اُسی طرح پڑا ہے۔''

''اپنا بچہ دیکھ کر تمھیں ڈر نہیں لگا؟'' رضیہ نے پوچھا۔

''کیسا ڈر، یہ میرا بچہ ہے، میرے جگر کا ٹکڑا، میرا لعل، میری آنکھوں کا تارا میرا راج دُلارا۔'' ثریا اپنے بچے پر قربان ہوتی جا رہی تھی۔ ثریا کا یہ راج دُلارا اگلے دن ہی دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اب گائے اور ثریا کا درد مشترک ہو گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بچھڑا زندہ حالت میں ماں کی آنکھوں کے سامنے سے رخصت ہوا تھا اور بچہ مردہ۔ ثریا بھی اداس تھی اور گائے بھی۔ گائے کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور ثریا کی آنکھوں میں بھی۔ عجیب الخلقت بچے نے ثریا میں ممتا کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اب گائے کی اداسی اُس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ نئے کپڑے، نیا کمرا اور سونے کی چوڑیاں اس کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ بچھڑے کو اس گھر میں واپس آنا چاہیے۔ اس نے جب شوکت سے بچھڑے کی واپسی کا کہا تو وہ بولا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے، سرکس والا کب بچھڑا واپس کرے گا۔''

''تم کوشش تو کرو۔''

''اگر سرکس والا بچھڑا واپس کرنے پر راضی بھی ہو گیا تو پیسا کہاں سے آئے گا۔ پیسے تو ہم خرچ کر چکے ہیں۔''

''میں یہ سونے کی چوڑیاں بیچ دوں گی۔''

''یہ تو صرف ایک لاکھ روپے کی ہیں، باقی روپے کہاں سے آئیں گے۔''

''ہم اپنی زمین بیچ دیں گے۔''

''مجھ سے گائے کی اداسی نہیں دیکھی جاتی، دیکھو ہڈیوں کا پنجر بن گئی ہے۔''

''سرکس کے مالک کا کارڈ میرے کاغذوں میں پڑا ہے، میں ابھی اس کو فون کرتا ہوں اگر وہ بچھڑا واپس کرنے پر رضامند ہو گیا تو پھر دیکھتے ہیں کہ پیسوں کا بندوبست کس طرح کرنا ہے۔''

''شوکت اس کام میں دیر مت کرو۔''

''میں کارڈ تلاش کر لوں پھر فون کرتا ہوں۔''

شوکت نے جب پی سی او سے سرکس کے مالک شہزاد کو فون کیا تو وہ گائے کی حالت اور بچھڑے کی واپسی کا جان کر بولا۔

''تم نے بہت اچھے موقع پر فون کیا ہے، تم ابھی آ کر بچھڑا لے جاؤ۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں بالکل سچ، بس دیر مت کرو فوراً سبز دربار آ جاؤ وہیں ان دنوں ہماری سرکس لگی ہے۔''

''سبز دربار تو ہمارے گاؤں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں جلد آ جاؤ۔''

''میں کرامت کے ساتھ آ رہا ہوں۔'' شوکت بولا۔

اُنھوں نے بڑی سڑک سے ایک پک اپ کرائے پر لی اور سبز دربار کی طرف روانہ ہو گئے۔ شوکت راستے بھر شہزاد کی تعریف کرتا رہا کہ وہ بغیر پیسوں کے بچھڑا انھیں واپس کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ دونوں بھائیوں کی بچھڑے سمیت گاؤں واپسی ہو گئی تھی۔ گائے کا بچہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ گائے والہانہ انداز میں اپنے بچے کو زبان سے چاٹ رہی تھی۔ وہاں پر موجود ہر آنکھ اشکبار تھی۔ آنسو تو گائے کی آنکھوں میں بھی تھے مگر وہ اس کے باوجود پُرسکون تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ اس کی ممتا کو قرار آ گیا تھا، اس کی ممتا کو قرار کیوں نہ آتا اُس کی آنکھوں کا تارا اُس کا راج دُلارا زندہ نہ سہی مردہ حالت میں اس کے پاس آ گیا تھا۔ ■

اک پتنگے نے یہ اپنے رقص آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے، روشنی بن جائیے

جس سلیم احمد کا یہ شعر ان کی لوح مزار پر کندہ اور زندہ ہے، ان سے ہم آپ میں سے اکثر شخصی طور پر اس لیے نہیں مل پائے کہ وہ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کو صرف ۵۹ سال کی عمر میں رخصت ہوگئے تھے۔

وہ زندگی بھر اس ادھورے معاشرے میں اپنی شاعری، تنقید، ڈرامہ نویسی اور کالم نگاری میں پورے آدمی کی تلاش میں رہے۔ یوں اس مطلوبہ انسان کی بہت سی خوبیاں بے نیازی و بہادری، خودداری و بذلہ سنجی، وسعت قلب و وسعت ظرف ان کی اپنی شخصیت میں دھیرے دھیرے سماتی چلی گئیں۔

عالی نے انھیں "جامع الکمالات" لکھا۔ ڈاکٹر آصف فرخی تو ایک قدم اور آگے ہو لیے۔ "مذہب عشق کی طرح اگر ادب کا کوئی مذہب ہوتا ہے تو سلیم احمد اس مذہب ادب کے پیغمبر تھے۔"

ادبی حلقوں میں اپنی وفات کی تین دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ان کے نظم و نثر، تنقید، شاعری اور اسلوب پر بات کرنے والے ایک نہیں بیسیوں ہیں۔

نصر اللہ خاں کی "کیا قافلہ جاتا ہے" آغا ناصر کی "گمشدہ لوگ" ساقی فاروقی کی "پاپ بیتی" اور طاہر مسعود کی "یہ صورت گر" کے بعد خواجہ رضی حیدر کی "سلیم احمد، مشاہدے، مطالعے اور تاثرات کی روشنی میں" ان کا تذکرہ مسلسل جاری ہے۔

سلیم احمد کا کام، انداز اور ان سے کی جانے والی محبت انھیں زندہ رکھے گی۔ ایسی محبت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے کہ اطہر نفیس جیسا شاعر جسے "شاخِ وفا کا گل تر" کہا گیا، وصیت کرکے گیا کہ بوقت تدفین "بیاض" میرے سینے پر رکھ دی جائے۔ جب سلیم احمد نے یہ کہہ کر مرنے والے کی خواہش پوری نہ ہونے دی تھی کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

(مدیر)

ہمیں پورے سلیم احمد کو اپنے مطالعے کا موضوع بنانا چاہیے

ان کی موت کا زخم تین دہائیوں کے بعد بھی بھرنے میں نہیں آیا

ڈاکٹر طاہر مسعود

سلیم بھائی کی یادیں

جسارت سے علیحدگی کا اصل سبب وہ انٹرویو تھا جو میں نے صلاح الدین صاحب کے کہنے پر کیا

اردو

ادب کے سلیم احمد اور ہم لوگوں کے سلیم بھائی کو بچھڑے ہوئے تین دہائیاں ہونے کو آرہی ہیں۔

اتنے برسوں میں گہرے سے گہرا زخم بھی بھر جاتا ہے۔ لیکن سلیم بھائی کی موت کا زخم ایسا ہے کہ بھرنے میں نہیں آتا۔ خواجہ رضی حیدر نے اپنی کتاب کے ذریعے اس زخم کو اور ہرا کر دیا ہے۔ کچھ اپنے حافظے، کچھ اپنی ڈائری اور کچھ سلیم بھائی کے احباب سے گفتگو کے ذریعے انھوں نے اپنے جو مشاہدات رقم کیے ہیں، وہ اتنے وقیع ہیں کہ ان میں سبھی کچھ آگیا ہے۔ سلیم بھائی کی حیات، ان کے خیالات، ان کا اسلوب زندگی، ان کی شخصیت، شخصیت کے مختلف رنگ و روپ۔ غرض یہ کہ اردو ادب کے سلیم احمد اور ہم سب کے سلیم بھائی اس کتاب میں اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح کہ وہ تھے۔ کبھی آگ اور کبھی پانی۔ کبھی شعلہ اور کبھی شبنم۔ سچ پوچھیے تو سلیم بھائی پر ایک مفصل کتاب ان کے ادیب دوستوں پر ایک قرض تھا۔ خواجہ رضی حیدر نے سب کی طرف سے یہ قرض چکانے کی کوشش کی ہے اور بلاشبہ اس فرض کفایہ میں وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔

پرانے دنوں کو آواز دیتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ جب پہلی بار میں ان کی محفل میں شریک ہوا تھا تو وہ گود میں تکیہ لیے، سیدھے ہاتھ کی مٹھی میں سگریٹ جکڑے، زور زور سے کش لیتے ہوئے اپنے بستر پر آسن جمائے فروکش تھے، گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے اور جب برسوں بعد ان سے آخری ملاقات ہوئی تو بھی وہ اسی انداز میں اپنے بستر پر بیٹھے تھے۔ ان دونوں باتوں کے دھیان سے مجھے ایسا لگا جیسے وہ اپنے بستر سے کبھی اٹھے ہی نہ ہوں۔ مہاتما بدھ کی طرح وہ سچائی اور روشنی کے متلاشی تھے۔ ادب، مذہب، فلسفہ، تصوف اور نفسیات میں سچائی کی تلاش۔ وہ ہر خیال، ہر فکر کو تنقید کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ بنے بنائے خیال کو جوں کا توں قبول کرنے سے انکاری تھے۔ وہ کسی خیال کو قبول بھی کرتے تھے تو اس کی قبولیت کی دلیل ان کی اپنی ہوتی تھی۔ وہ سقراط کی طرح سوال اٹھاتے تھے اور ان کا ہر سوال ایک نئے تنازعے کا باعث بن جاتا تھا۔ لیکن وہ تنازعات سے گھبراتے نہیں تھے اور نہ ہنگامہ ہائے ہو کے آگے سپر ڈالتے تھے۔ وہ بحث کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کرتے تھے اور ایسا انھیں ہی کرنا پڑتا تھا کیوں کہ ہم سب سوچنے اور سچ بولنے سے ڈرتے ہیں۔ تشکیک سے یقین تک کے اس سفر میں انھیں جن ذہنی صعوبتوں سے گزرنا پڑتا تھا، اس کا حال تو وہی بہتر جانتے تھے۔ مسلسل غور و فکر، مسلسل اضطراب، مسلسل بے چینی آخرکار انھیں نروس بریک ڈاؤن کے اندوہناک تجربے سے گزرنا پڑا۔ لیکن ان کی تخلیقی تپش پھر بھی کم نہ ہوئی اور وہ اسی انہماک اور سرگرمی سے لکھتے رہے، بولتے رہے اور سوچتے رہے۔

ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۵ء میں ہوئی جب میں کراچی یونیورسٹی میں صحافت کا طالب علم تھا اور میں سلیم بھائی کو علامہ اقبالؒ کے سلسلے میں ایک مذاکرے میں مدعو کرنے ان کے گھر گیا تھا۔ اس زمانے تک سلیم بھائی نے جلسوں میں زبانی خطاب کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اس میں ایک حجاب سا محسوس کرتے تھے۔ میری دعوت پر فرمایا ''بھئی میں تو گفتگو کا آدمی ہوں۔ تقریر وقریر تو میں نے کبھی کی نہیں۔''

میں نے عرض کیا ''چلیے گفتگو ہی سہی۔''

لیکن وہ نہیں مانے اور تقریب میں آئے بھی نہیں۔

لیکن میں نے ان کے پاس گاہے گاہے جانا شروع کر دیا۔ جب بھی میری غیر حاضری طویل ہو جاتی اور ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہو جاتی تھی تو کہتے ''کیا بات ہے، بہت دنوں سے آئے نہیں۔ آؤ۔'' اس آخری لفظ ''آؤ'' میں اتنا پیار اور اپنائیت ہوتی تھی کہ میں کھنچ کر ان کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ جہاں پہلے ہی کچھ شاعر و ادیب بیٹھے ہوتے تھے۔ چائے آجاتی تھی اور پھر یہ محفل اس وقت تک جمی رہتی تھی جب تک پنواڑی کی دکانیں بند اور سڑکیں سنسان نہیں ہو جاتی تھیں۔

میں سلیم بھائی کے پاس اس لیے جاتا تھا کہ ان سے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کچھ سیکھ سکوں۔ ایک دوپہر میں پہنچا تو اکیلے بیٹھے تھے۔ گفتگو شروع ہوئی تو میں نے کہا ''سلیم بھائی! میں آوارہ خوانی کرتا رہتا ہوں۔ مشورہ دیجیے کہ کیا پڑھوں؟''

بولے ''اگر لکھنا سیکھنا چاہتے ہو تو داستانی ادب پڑھو طلسم ہوشربا وغیرہ کا مطالعہ کرو۔ اس سے زبان آئے گی۔ تم یہ جان سکو گے کہ تحریر کے ذریعے خوشی، غم اور دوسرے جذبات کی عکاسی کیسے کی جاتی ہے۔''

وہ اپنے سے چھوٹوں پر بہت مہربان رہتے تھے اور نہایت شفقت فرماتے تھے۔ ساتھ ہی ان کی تربیت سے غافل بھی نہیں رہتے تھے۔ ان دنوں میں ''جسارت'' سے وابستہ تھا اور رپورٹنگ کے ساتھ کالم نگاری کا شغل بھی جاری تھا۔ ایک کالم میں نے مشاعروں کے خلاف لکھا۔ سلیم بھائی سے ملاقات ہوئی تو بہت خفا تھے۔ فرمایا:

''مشاعرہ ہمارا تہذیبی ادارہ ہے۔ اس تہذیبی ادارے کے خلاف تمھیں ہرگز نہیں لکھنا چاہیے۔ رہے وہ نام نہاد جدید شعراء جو مشاعروں کے خلاف ہیں تو وہ متروک شاعر نہیں، مردود مشاعرہ ہیں۔''

میں نے ان کی بات گرہ سے باندھ لی اور پھر کبھی مشاعرے کے خلاف نہیں لکھا۔ وہ خود بھی ''جسارت'' سے وابستہ تھے اور اس میں کالم لکھا کرتے تھے۔ لیکن ایک افسوس ناک تنازع کے نتیجے میں ان کی اس اخبار سے علیحدگی عمل میں آئی۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن مدیر جسارت محمد صلاح الدین نے مجھے بلا کر کہا کہ تم نے ادبی صفحے پر ادیبوں کے انٹرویوز کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، تو ایک انٹرویو سلیم احمد صاحب کا کر لو۔ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

میں اگلی صبح سلیم بھائی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بات ان کے خیالات پر لوگوں کے اعتراضات سے شروع ہوئی اور اسلامی ادب، ادب میں عریانی و فحاشی، اسلامی ریاست میں ادب کا مقام اور اسی نوع کے موضوعات پر میں سوال کرتا رہا اور وہ ہر سوال کا تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہر جواب اتنا تشفی بخش، اتنا مدلل اور اتنا لاجواب کر دینے والا تھا کہ جیسے انھوں نے ان سارے سوالوں کی پیشگی تیاری کر رکھی ہو۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا اسلامی ریاست میں منٹو کو بُو اور عصمت چغتائی کو لحاف لکھنے کی آزادی ہوگی؟ ان کا جواب اثبات میں تھا اور اس کی وجوہ پر انھوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انٹرویو ''جسارت'' میں چھپنا تھا کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جسارت کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب محمود اعظم فاروقی نے مجھے فون کیا اور غصے سے پوچھا ''تم نے یہ انٹرویو کس کی اجازت سے کیا؟'' عرض کیا ''مدیر جسارت کی اجازت سے۔''

فرمایا ''کیا اب جسارت میں منٹو اور عصمت کا دفاع کیا جائے گا؟''

میں نے کہا ''یہ سلیم احمد صاحب کے خیالات ہیں، ادارے کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔''

فرمایا ''سلیم احمد صاحب ہمارے کالم نگار ہیں، لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ ادارے کے خیالات ہیں، اس انٹرویو کو نہیں چھپنا چاہیے تھا۔'' غرض کہ فاروقی صاحب دیر تک اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے رہے۔ اس کے بعد کم از کم ایک ماہ تک ''جسارت'' کے ادبی صفحے پر سلیم بھائی کے خیالات کی تردید میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ اس میں بعض اچھے اور دل آزار مضامین بھی شامل تھے۔ میں سلیم بھائی کے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی مضمون ایسا نہیں جس کا جواب دیا جا سکے۔ غالباً ابھی یہ تنازع چل ہی رہا تھا کہ سلیم بھائی نے ایک کالم میں لکھ دیا کہ کارل مارکس کے طبقاتی شعور کو سمجھے بغیر ملک میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ منٹو، عصمت اور کارل مارکس کی حمایت! بھلا کارپردازانِ جسارت کہاں ہضم کر سکتے تھے۔ چنانچہ سلیم بھائی اور جسارت کا تعلق ٹوٹ گیا۔ حالاں کہ جسارت وہ اخبار تھا جس میں لکھنے کے لیے انھوں نے اپنی سرکاری ملازمت کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ ریڈیو کے ملازم تھے اور جسارت اپوزیشن کا اخبار تھا۔ جسارت سے وابستگی پر ان کے استاد حسن عسکری ناراض تھے اور انھوں نے اپنے استاد کی خفگی کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ بہرکیف، سجاد میر جو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

حریت کے نئے نئے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے، انھوں نے سلیم بھائی کا کالم نہایت اچھے معاوضے پر حریت سے شروع کرادیا۔ یہ الگ بات کہ ان کے انتقال پر سب سے اچھا ادبی صفحہ جسارت ہی نے نکالا اور ان کے وہ دو کالم جو حریت کے لیے لکھے گئے تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے سرہانے سے ملے تھے، ''بندلبوں کا شکوہ'' کے عنوان سے جسارت کے ادبی صفحے پر شائع ہوئے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سلیم بھائی نے اپنے خیالات کا کبھی سودا نہیں کیا، وہ کبھی کسی خوف، لالچ اور مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔

حسن عسکری کو سلیم بھائی اپنا استاد کہتے تھے یہ الگ بات کہ عسکری صاحب سلیم بھائی کو اپنا شاگرد نہیں مانتے تھے۔ عسکری صاحب اگر استاد تھے تو وہ نہایت سخت گیر استاد تھے۔ وہ اکثر اوقات اپنے شاگرد کی توہین و تضحیک سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ اس سلسلے میں دو واقعات سلیم بھائی نے مجھے سنائے تھے۔ ایک دن عسکری صاحب سلیم بھائی کے گھر آئے اور پوچھا کہ کیا تم نے کوئی نئی غزل لکھی ہے۔ سلیم بھائی نے اثبات میں جواب دیا اور نئی لکھی ہوئی غزل ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ عسکری صاحب نے غزل پڑھی اور ہوں ہوں کر کے خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سلیم بھائی اٹھ کر جانے لگے تو عسکری صاحب نے پوچھا ''کہاں جا رہے ہو؟ سلیم بھائی نے کہا بیت الخلا جا رہا ہوں۔ عسکری صاحب نے کہا اپنی غزل بھی ساتھ لیتے جاؤ۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار وہ احمد مشتاق کو ساتھ لے کر سلیم بھائی سے ملوانے لائے۔ ملاقات کے بعد عسکری صاحب بولے ''احمد مشتاق! سلیم سے تمھیں ملوانے اس لیے لے کر آیا ہوں کہ تمھیں معلوم ہو سکے کہ آدمیوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے۔''

سلیم بھائی عسکری صاحب کے ان منفی فقروں کو صبروشکر سے جھیلتے رہے لیکن اپنی ارادت مندی میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ لیکن یہی حسن عسکری جماعت اسلامی اور جسارت کے معاملے میں ان سے ناراض ہوگئے۔ سلیم بھائی نے اس وقت بھی کہا تھا کہ ''اس مسئلے کو حل کرنے کے دو راستے ہیں یا تو عسکری صاحب مجھے حکم دیں تو میں جسارت میں لکھنا چھوڑ دوں یا پھر وہ مجھے قائل کرلیں۔''

سلیم بھائی ہمہ وقت ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار رہتے تھے۔ بہ قول ڈاکٹر منظور احمد کوئی چیز ان کے اندر جلتی رہتی تھی جو انھیں بے چین کیے رکھتی تھی اور یہ جلنے والی چیز وہ اضطراب انگیز سوالات تھے جو معاشرہ، ادب، مذہب اور تہذیب کے حوالے سے ان کے اندر جنم لیتے رہتے تھے اور وہ ان پر غوروفکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ وہ نرے ادیب نہ تھے ایک مفکر اور مصلح بھی تھے۔ پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین تھی اور اس کے محفوظ مستقبل کے لیے تشویش اور پریشانی سے گزرتے رہتے تھے۔ افسوس کہ زیادہ تر سلیم احمد کو صرف شاعر اور نقاد ہونے کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ ہمیں پورے سلیم احمد کو اپنے مطالعے کا موضوع بنانا چاہیے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی شخصیت کے تمام امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے پاکستان کی پہلی جاسوسی فلم ''راز'' لکھی، ''تعبیر'' جیسا مقصدی ڈراما سیریل لکھا۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو پر مذہبی موضوعات پر تقریریں کیں، ریڈیو کے لیے فیچر تحریر کیے۔ اخبارات میں کالم نویسی کی اور سیاسی، تعلیمی، تہذیبی، ادبی، مذہبی غرض کہ تمام ہی موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ ان کے اخباری کالموں کا صرف ایک مجموعہ مرتب ہو کر سامنے آیا ہے حالانکہ ان کے تمام ہی کالم مستقل اہمیت کے حامل ہیں اور انھیں یکجا ہو کر کتابی صورت میں چھپنا چاہیے۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

وہ عسکری سے کہتے "دیکھیے میں اسے چڑا آیا"
انتظار حسین کی ہر بار خوف سے گھگھی بندھ جاتی ہے

سلیم احمد

بہ پائے جستجو چوں آبلہ خوں گشت منزل ہا

سلیم احمد کے حضور عہد حاضر کے منفرد پاکستانی دانشور سراج منیر کا خراج تحسین

راویانِ

روایت کا کہنا ہے کہ واقعہ میرٹھ میں پیش آیا جہاں کے قینچی، کباب اور کرار حسین مشہور ہیں۔ فسادات کا زمانہ تھا۔ عسکری، انتظار حسین اور سلیم احمد چلے جا رہے تھے۔ شہر میں سکھ شرنارتھیوں کے گروہ وارد ہونا شروع ہو چکے تھے اور قتل و غارت کا آغاز ہو گیا تھا۔ یکا یک ایک جٹا دھاری سکھ ہاتھ میں کرپان لیے آتا دکھائی دیا۔ عسکری صاحب نے کہا "کیوں بھئی کوئی اس سے بات کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔" انتظار حسین کی تو خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ البتہ سلیم احمد نے کہا میں اس سے خطرناک بات کہہ کر واپس آ سکتا ہوں۔ یہ کہا اور سکھ کے پاس پہنچ گئے۔ اس کی کرپان کا بغور معائنہ فرمایا اور کہنے لگے "کیوں بھئی، یہ کرپان بیچتے ہو۔ کتنے کی ہے؟" ایک تو سکھ اوپر سے شرنارتھی، آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ سلیم احمد نے کہا۔ "معاف کرنا یار ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی۔" یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔ اُس وقت سے آج تک سلیم احمد کا طور بدلا نہیں۔ ادبی تنقید میں آ گئے۔ جہاں کوئی سکھ کرپان لیے دکھائی دیا، اس کے پاس پہنچ گئے۔ "کیوں بھئی بیچتے ہو۔" ادھر اُس کے منھ سے کف جاری ہوا اور آپ واپس عسکری صاحب کے پاس۔ "دیکھیے میں اُسے چڑا آیا۔" ہر بار انتظار حسین کی خوف سے گھگھی بندھ جاتی ہے۔

مجھے پہلے فقرے میں میرٹھ کے مشاہیر ثلاثہ گنوانے کی ضرورت نہ پڑتی اگر یہ چیزیں سلیم احمد کی شخصیت میں یکجان نہ ہو جاتیں۔ فولادی قینچی کی کاٹ، کباب کی تیز مرچیں اور کرار صاحب کی نکتہ آفرینی اور تجزیاتی مہارت۔ یہ ہیں سلیم احمد کی شخصیت کے ابعاد ثلاثہ۔ میں نے یہ بات اتنی سہولت سے کہہ دی جیسے اس کے ذریعے سلیم احمد کی پوری شخصیت گرفت میں آ جائے گی۔ حالانکہ اس شخص نے اپنے آپ کو اس قدر بکھیر رکھا ہے کہ چند صفحوں میں کیا کتابوں میں سمیٹنا محال ہے۔ بکھیرنے کی اصطلاح بھی میں نے ان کے دردمند دوستوں سے مستعار لی ہے جو اُن

کی غیر موجودگی میں ایک اندوہ کے ساتھ سر ہلا ہلا کر اس لفظ کا ورد کرتے ہیں، ورنہ سلیم احمد سے زیادہ منظم آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ اخبار کے کالم سے شعر تک، ڈرامے سے تنقیدی مضمون تک، سیاسی مضامین سے مابعد الطبیعیاتی مباحث تک۔ ہر چیز یا تو ایک اصول کے تحت مربوط ہے یا ہو رہی ہے۔ اس شخصیت کے اندر ایک زبردست مرکز گریز اور اتنی ہی قوی مرکز جو قوت، بیک وقت عمل پیرا ہے اور ہر لمحے ان کے درمیان ایک نئے لفظ' توازن کی دریافت کا نام سلیم احمد ہے۔ سوچنے والے کے لیے پرانے پٹاخے کی طرح سیل جانا یا بم کی طرح پھٹ کر تباہی پھیلا دینا، دونوں چیزیں آسان ہوتی ہیں۔ وہ جو ادب میں بہت طمطراق سے داخل ہوئے تھے اور اب عرصے سے یوں ہیں کہ ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں، وہ پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جو یوں آئے جیسے برق خاطف کرتی ہے، مگر لمحے بھر بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا، وہ دوسری قسم سے ہیں۔ اصل میں مشکل کام اٹیمی ری ایکٹر بنے رہنا ہے۔ تابکار رہنا اور تابکاری پھیلاتے رہنا۔ اس میں شخصیت ٹوٹتی رہتی ہے اور جڑتی رہتی ہے۔ ذرہ ذرہ ٹوٹتا ہے اور پھر جڑتا ہے۔ اتنی حدت پیدا ہوتی ہے کہ لوہے کو گیس بنا دے لیکن اس کا براہِ راست ظاہر ہونا ممنوع ہے۔ یہ اپنی آگ میں خود کو بار بار پگھلانے اور بار بار ڈھالنے کا عمل ہے۔ ایسا عمل کہ "زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک۔" فی زمانہ یہ کام، خودگری اور خودشکنی کا نامختتم عمل، سلیم احمد کے حصے میں ہی آیا ہے ورنہ اکثر کا عالم تو یہ ہے کہ شخصیت کا جو بُت ۱۸ سال کی عمر میں بن گیا تا عمر اسی کے سامنے سربسجود رہے اور اسی کے معبد کے دائرے کو وسیع کرتے رہے۔ مجھے احساس ہے کہ ری ایکٹر والی مثال سے اس تحریر میں ذرا رومانوی خطابت سی پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ اس لیے ضروری ہے کہ تحریر "کلاسیکیت کے سرطان" سے محفوظ رہے۔

ایلیٹ نے اپنی نظم میں آدھی سطر بہت مزے کی لکھ دی ہے:

To fix in a formulated phrase

لکھنے والوں کی رائج الوقت تفریح یہی ہے۔ ترقی پسند، رجعت پسند، کلاسیکی، رومانی، جدیدیت پرست، روایت پسند۔ کیا کیا مہریں ہیں جو الگ الگ لفافوں پر لگی ہوئی ہیں اور یہ سب لفافے اپنے اپنے پوسٹ بکسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ لفافے کے اندر کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا کیا ہے۔ نگاہ صرف پوسٹ بکس نمبر دیکھتی ہے اور ہاتھ مہر لگاتے ہیں۔ اس صورت حال میں اگر کسی کو Formulated phrase میں متعین نہ کیا جا سکے تو ایک لمحے کو سارا عمل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کا پتھریلا پن اور ہاتھوں کی میکانکی حرکت، دونوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ مہر بے کار ہو جاتی ہے اور ذہن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کون ہے۔ اس کی شناخت کیا ہے، اسے کس خانے میں رکھوں۔ اگر ایک قدم اور آگے بڑھ جائے تو اگلا سوال ہو گا۔ میں کون ہوں؟ یہی شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنے والا معاملہ ہے۔ آدمی یہاں تک پہنچنے کے خوف سے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مہر لفافے پر رسید کر دیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط کر رہا ہے، مگر دوسرا راستہ شناخت کی طرف جاتا ہے۔ عذاب کی طرف جاتا ہے۔ ایک لفافے نے مشینی آہنگ سے جاری یکسانیت کو توڑ دیا۔ مہریں لگانے والا زیر لب گالیاں دیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ۔ ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو...... Crystallise نہیں ہونے دیتے، زندگی کی طرح متحرک رہتے ہیں، متغیر، ہمہ وقت نئے امکانات کے جویا، وہ معاشرے کے لیے شناخت کا مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جلاد اگر ایک لمحے کو پوچھ لے کہ تختے پر کون ہے تو دوسرا سوال اس کے اپنے بارے میں ہو گا۔ میں کون ہوں؟ پھر وہ نوکری سے جائے گا۔ ادب میں یہ سوال پوچھ کر آدمی شاعری سے جاتا ہے، تنقید سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ محض یہ جاننے کے لیے کہ میں کون ہوں برسوں کی محنت اکارت نہیں کی جا سکتی۔ آپ دیکھتے نہیں لوگ عسکری صاحب سے کس قدر ناراض رہتے ہیں کہ وہ اپنی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رائے بدل لیا کرتے تھے۔ ان کا ذہنی طور پر زندہ اور متحرک رہنا لوگوں کے لیے شناخت کا مسئلہ پیدا کرتا تھا اور ان کی عیاشی

Fix in a formulated phrase

میں مخل ہوتا تھا۔ سلیم احمد، عسکری صاحب کی طرح رائے نہیں بدلتے لیکن ان سے کہیں زیادہ Elusive ہیں۔ ان کے ہاں متضاد عناصر یکجان ہونے کی کوشش میں ہیں۔ ایک ماورا اور منزہ اصول کے تحت، لفافے والی تشبیہ آگے بڑھایئے، اس لفافے پر سارے پوسٹ بکس نمبر لکھے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان ایک سبزی فیثا غوری کلید ہے لیکن مہریں لگانے والے کو کیا پتا۔ بے چارہ بھونچکا ہو گیا ہے اور اب زور زور سے گالیاں دے رہا ہے، لفافے کو، پوسٹ بکس نمبروں کو اور گاہے گاہے خود کو بھی۔ رائخ نے لکھا ہے کہ جب میں تحلیل نفسی کے ذریعے کسی شخص کو اس کی شخصیت کے مرکز سے قریب کرنے لگتا ہوں تو اس کا پہلا ردعمل شدید غصے کا ہوتا ہے اور اکثر وہ مجھ پر ہی بگڑ بیٹھتا ہے۔ سلیم احمد بھی ہمارے معاشرے کے ماہر نفسیات ہیں۔ پاؤنڈ نے جو کہا ہے نا کہ معاشرہ سب سے زیادہ فنکار کے چلبلے پن سے ڈرتا ہے، وہ اسی لیے کہ چلبلا فنکار اُسے اُس کی مرکزی شخصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ لگام سے کھینچ کر نہیں۔ ہشکار ہشکار کے۔ بعض بزرگ اس میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔

معاشرے کے ماہر نفسیات ہونے کا دعویٰ بہت لوگوں کو ہوتا ہے۔ یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ Paranoid Formation کی قبیل سے۔ خبط عظمت سلیم احمد کو یہ دعویٰ نہیں ہے، وہ تو بس اپنی شخصیت کے تانے بانے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ذات کے گرد ایک حجاب سا بنتے ہیں، پھر اُدھیڑ کر اس کا معاینہ کرتے ہیں۔ انہی دھاگوں سے پھر ایک نیا پیٹرن بناتے ہیں۔ پھر اس میں کچھ اور نقش و نگار رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا دوبارہ اُدھیڑ کر اسے پھر ایک نئے انداز میں بُننا شروع کرتے ہیں۔ یہ Penelope والا طریقہ کار ہے۔ یونانی دانش کی ازلی تلاش Know thyself ذات کے اصل اصول تک پہنچنے سے پہلے پہلے تک یہ چیز جاری رہنی چاہیے۔ جس دن اصل اصول کی بازیافت ہو جائے گی، اس دن چادر بھی مکمل ہو جائے گی۔ چونکہ یہ تانا بانا معاشرے سے، تاریخ وتہذیب سے، ادب سے، شاعری سے فراہم ہوا ہے لہٰذا اس کے مطالعے کے ضمن میں ہر سرچشمہ آجاتا ہے۔ یہاں ہر تنکے کا معاملہ یہ ہے کہ ہوا ریشہ نیستاں کا۔ انسانی تاریخ وتہذیب کی گہرائی میں سفر کرنے کے معنی ہیں اپنی ذات کی تہوں میں اُترنا اور ایک تہہ سے دوسری تہہ تک پہنچنے کا مطلب ہے سنگین دیوار میں در بنانا۔ اپنے آپ کو توڑ کر، کاٹ کر، اُسے سمجھنا اور اُسے ایک شکل دینا۔ یہی سلیم احمد کی بنیادی تلاش ہے۔ اسی مرکزی نقطے سے سارے دائرے پھوٹتے ہیں اور ایک ہی نقطے کے گرد وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ متضاد سمتوں کو سمیٹتے ہوئے، عناصر مختلفہ کو ایک مرکزی حوالہ دے کر مربوط اکائی بناتے ہوئے۔ کسری آدمی سے مکمل آدمی تک سفر ہی اس زمانے کا سلوک عملی ہے۔ دائرہ، مرکز اور محیط کی بالاتوں کے ذریعے Operate کرتا ہے۔ کسری آدمی کی شخصیت کا اصول مستطیل اور مربع ہے۔ مربع کے ساتھ مربع جوڑ دیجیے، ایک اقلیدسی شکل وجود میں آجائے گی لیکن اس کا کوئی مرکزی اصول حیات نہیں ہو گا۔ حیاتیاتی سانچے ہمیشہ دائرے کی شکل میں حرکت کرتے ہیں۔ ''کسری آدمی کا سفر'' سلیم احمد کا معرکہ آرا نظریہ تو ہے ہی، ہمارے زمانے کی اہم ترین کلید بھی یہی ہے۔ کچھ لوگ اس دعوے سے جز بز ہوں گے۔ لیکن ان کی ناراضگی قابل فہم ہے۔ کسریت سے اضافیت پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں اضافیت ذاتی انا کے ذریعے روبہ عمل آتی ہے۔ اضافیت زدہ ذہنی فضا میں Superlative کا استعمال بہت ناگوار ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں مطلق کی مشابہت پائی جاتی ہے جو اضافیت کے لیے مہلک ہے۔ اس خطرے کے باوجود میں اصرار کرتا ہوں ''کسری آدمی کا سفر'' اردو تنقید میں مابعد الطبیعیاتی پیمانے کا نظریہ ہے۔ منظم، مربوط اور اہم ترین۔ ■

نثر زبان کی چہل قدمی اور شاعری زبان کا رقص ہے

سلیم احمد نے نثر کو بھی زبان کا رقص بنا دیا

شاہنواز فاروقی

سلیم احمد پر گفتگو آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ ان سے ملنے والے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ انھیں سر سے پیر تک جانتے ہیں۔ اس آسانی کی تفصیل یہ ہے کہ سلیم احمد کے بلند ادبی قد و قامت اور تمام تر شہرت کے باوجود ان سے ملنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ آپ کسی تعارف کے بغیر محض شاعر یا ادیب یا ادب کے قاری ہونے کی بنیاد پر کسی بھی وقت ان کے گھر پر دستک دے کر ان سے ملاقات کر سکتے تھے۔ فی زمانہ جو شخص اتنا سہل الحصول ہو اس کے بارے میں بے شمار لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ اس شخص میں کوئی عظمت نہیں ہے، عظمت ہوتی تو اس شخص سے ملنا اتنا آسان کیوں ہوتا۔ اس تناظر میں ہم نے سلیم احمد سے ملنے والے بعض لوگوں کو سلیم احمد پر اس طرح گفتگو کرتے ہوئے دیکھا کہ اگر وہ سلیم احمد کو Grace Marks نہیں دیں گے تو شاعری اور تنقید کے پرچے میں سلیم احمد کا پاس ہونا دشوار ہے۔ لیکن سلیم احمد ان لوگوں میں سے تھے جنھیں سمجھنے کے لیے صرف قربت کی نہیں ''محبت آمیز قربت'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سلیم احمد کو سمجھنے کے لیے آدھی بات ہے۔ ان کو سمجھنے کے حوالے سے پوری بات یہ ہے کہ سلیم احمد کو سمجھنے کے لیے قربت اور دوری دونوں ضروری ہیں۔

سلیم احمد پر گفتگو اس لیے بھی دشوار ہے کہ ہمارا زمانہ اکہری شخصیتوں یا Single Dimensional Personalities کا زمانہ ہے اور ہم ایسی ہی شخصیتوں کو دیکھنے، انھیں سمجھنے اور ان پر بات کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مگر سلیم احمد ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔ وہ شاعر تھے، نقاد تھے، ڈراما نگار تھے، کالم نویس تھے، انھوں نے فلمیں لکھیں، مکالمات کی ہزاروں محفلیں برپا کیں، چنانچہ سلیم احمد کی شخصیت اور فکری کلیت کو سمجھنا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلیم احمد کے انتقال کو ۲۸ رسال ہو گئے ہیں مگر ان کی شخصیت بالخصوص ان کے فن پر سراج منیر کے مضمون کے سوا کوئی ڈھنگ کا مضمون موجود نہیں، لیکن بہرحال سلیم احمد کی فنی زندگی میں اصل اہمیت ان کی تنقید اور شاعری کی ہے۔

تنقید کا ذکر آتا ہے تو سلیم احمد کے ساتھ اُن کے استاد محمد حسن عسکری کا حوالہ ضروری آتا ہے۔ عسکری اور سلیم احمد کی تنقید کی اہمیت یہ ہے کہ جس شخص نے عسکری اور سلیم احمد کی تنقید نہیں پڑھی وہ اُردو ادب کے بارے میں کوئی بنیادی بات نہیں جانتا۔ اردو ادب کے بارے میں ثانوی باتیں بتانے والے تو بہت ہیں اور ثانوی باتیں بتانے والے بھی غیر اہم نہیں ہوتے لیکن اردو ادب کے بارے میں جتنی باتیں حسن عسکری اور سلیم احمد نے بتائی ہیں اتنی باتیں کسی اور نقاد نے نہیں بتائیں۔ ان دونوں کی تنقید کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ہماری تہذیب کے معلوم کو محسوس، مجرد کو ٹھوس اور غیب کو حضور بنا دیا ہے۔ عسکری اور سلیم احمد نے اپنی تنقید میں وہ سوالات اٹھائے ہیں جو ہماری تہذیب کے بنیادی سوالات ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ سوالات ہماری تہذیبی ترجیحات اور تہذیبی حسیت یا Cultural Sensibility کے دائرے میں رہتے ہوئے اٹھائے گئے ہیں۔ یہ کام کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ کلیم الدین احمد کی تنقید پڑھنے سے ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد کا شمار اردو ادب کے بڑے نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کا مطالعہ قاموسی تھا مگر ان کے تہذیبی فہم اور ثقافتی حسیت کا یہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

عالم تھا کہ انھوں نے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ غزل سمجھتے تھے نہ وحشی کا شعور رکھتے تھے۔ انھیں صنف کا فہم تھا اور نہ انھیں ہماری تہذیبی روایت میں سخن کے معنی کا ادراک تھا۔ لیکن تنقید میں حسن عسکری اور سلیم احمد کا ذکر ایک ساتھ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں کوئی فرق ہی نہیں تھا۔ عسکری صاحب کی شخصیت کا خمیر علم سے اُٹھا تھا چنانچہ وہ محبت پر گفتگو کرتے تھے تو اسے بھی "علم" بنا دیتے تھے۔ سلیم احمد کا خمیر محبت سے اٹھا تھا چنانچہ انھوں نے علم پر بھی اس طرح گفتگو کی ہے کہ اسے "محبت" بنا دیا ہے۔ نثر زبان کی چہل قدمی اور شاعری زبان کا رقص ہے مگر سلیم احمد نے تنقید میں ایسی نثر لکھی ہے کہ انھوں نے نثر کو بھی زبان کا رقص بنا دیا ہے۔ عسکری صاحب کی تنقیدی نثر "کمال" ہے مگر زبان کے رقص بن جانے کی یہ خوبی عسکری صاحب کی نثر میں بھی نہیں ہے۔

جدید اردو غزل میں "بڑی شاعری" کا امکان صرف دو شاعروں میں تھا، ایک عزیز حامد مدنی میں اور دوسرے سلیم احمد میں۔ مدنی صاحب کا شاعرانہ ہنر یا (Poetic Skill) سلیم احمد سے زیادہ تھا مگر اس کی ایک وجہ ہے۔ مدنی صاحب کے پاس مواد کم تھا۔ کم مواد میں "کمال" پیدا کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سلیم احمد کے پاس اتنا شاعرانہ مواد تھا کہ ان کے معاصرین میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھنا ہو تو کہا جائے گا کہ مدنی صاحب ایک ایسے کمہار تھے جنھیں پانچ کلو مٹی سے صرف پیالے بنانے تھے۔ اس کے برعکس سلیم احمد ایک ایسے "ظروف ساز" تھے جنھیں پچاس کلو مٹی سے پیالے بھی بنانے تھے، گلدان بھی، انھیں صراحیاں بھی بنانی تھیں اور تلواریں بھی۔ چنانچہ ان کے لیے اپنی تخلیق میں حسن پیدا کرنا بہت زیادہ مشکل تھا۔ اس کے باوجود شاعری میں سلیم احمد کی تخلیقی صلاحیت بے مثال تھی۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کا پہلا شعری مجموعہ "بیاض" ہے۔ بیاض گزشتہ پچاس سال کی اردو غزل کا سب سے بڑا "شاعرانہ تجربہ" ہے اور اس کی نوعیت ایک اعتبار سے تاریخی ہے۔ بیاض سے پہلے اردو شاعری کئی تہذیبی، نفسیاتی اور جذباتی مسائل کا شکار ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شاعروں نے الفاظ، موضوعات اور طرزِ احساس کی سطح پر شاعرانہ اور غیر شاعرانہ کی تخصیص کر لی تھی۔ یعنی ان کی نظر میں کچھ الفاظ اور موضوعات اور احساس کی بعض صورتیں شاعرانہ تھیں اور بعض غیر شاعرانہ۔ یہ صورت حال کسی شاعرانہ یا تہذیبی ضرورت کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ شاعروں کا شعور اتنا گہرا اور قوی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ پوری زندگی کے پورے تجربے کو گرفت میں لے سکے۔ یہ ایک ہولناک صورتحال تھی اور اس میں پوری زبان کے شاعرانہ امکانات کے زائل ہونے کا اندیشہ موجود تھا۔ اس صورتحال کے خلاف شاعرانہ جہاد کی ضرورت تھی مگر یہ شاعرانہ زبان کی شعوری تخریب یا...... Conscious Distortion کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا جو زبان کی پوری تہذیب کا شعور بھی رکھتا ہو اور ذوق بھی اور جو مکمل تخریب کو مکمل تعمیر میں بدل سکے۔ سلیم احمد نے عسکری صاحب کی رہنمائی میں یہ کام کیا مگر وہ اس میں پچیس تیس فیصد ہی کامیاب ہو سکے۔ اگر سلیم احمد اس کام میں سو فیصد کامیاب ہو جاتے تو وہ اردو شاعری کی لسانی ساخت اور طرزِ احساس کو بدل کر جدید عہد میں اردو غزل کی پوری کلاسیکیت کو دریافت کر لیتے۔ لیکن سلیم احمد نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا "شاعرانہ تجربہ" تھا، اتنا بڑا شاعرانہ تجربہ کہ جدید اردو شاعری میں کوئی دوسرا شاعر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ظفر اقبال نے سلیم احمد سے متاثر ہو کر اردو غزل کے سانچے کو توڑنے کی کوشش کی مگر وہ زبان کی تہذیب کا شعور رکھتے ہیں نہ ذوق۔ چنانچہ ان کا تجربہ ایک دلچسپ لسانی کھیل کے سوا کچھ نہیں۔

سلیم احمد کا ایک مجموعہ "اکائی" ہے۔ اس مجموعے میں سلیم احمد نے روح اور جسم کے اتصال کو دریافت کر کے روح کو جسم اور جسم کو روح کا آئینہ بنا دیا ہے۔ یہ کام

www.pdfbooksfree.pk

تصوف کی روایت کو جذب کیے بغیر ممکن نہیں تھا۔ مگر اہم بات صرف تصوف کی روایت کو جذب کرنا نہیں ہے۔ یہ کام تو بہت سے صوفی شاعروں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اہم بات تصوف کی روایت کو جذب کر کے اسے عصر کے طرز احساس میں ظاہر کرنا ہے۔ سلیم احمد کا ایک قطعہ ہے۔

بدن ہی گو جدائی کا سبب ہے
بدن ملنے سے جانیں مل رہی ہیں
یہی خط دائرے کے درمیاں ہے
اسی خط پر کمانیں مل رہی ہیں

اکائی میں شامل ایک ثلاثی میں سلیم احمد کہتے ہیں:
بدن میں روح کا در کھلتا ہے
نہیں ہوتی محبت بالا بالا
یہ اکھوا تجھ کے اندر پھوٹتا ہے

سلیم احمد کا ایک شعر ہے۔
بدن کی آگ کو کہتے ہیں لوگ جھوٹی آگ
اس آگ نے مرے دل کو مگر گداز کیا

سلیم احمد کا شعری مجموعہ ''مشرق'' آزاد اور پابند نظم کا ملغوبہ ہے۔ اس شعری مجموعے کی اہمیت یہ ہے کہ اس مجموعے میں مغرب سلیم احمد کے لیے ایک ''وجودی مسئلہ'' بن کر سامنے آتا ہے اور اس مسئلے کی تہذیبی سطح پر ''تخلیقی سعادت'' سلیم احمد ہی کے حصے میں آئی ہے۔ مغرب کا حوالہ سلیم احمد کے کئی معاصرین کے یہاں موجود ہے مگر ان شاعروں کے یہاں مغرب ایک سیاسی، سماجی یا معاشی حقیقت نہیں۔ سلیم احمد نے مشرق میں مغرب کے ساتھ اپنا تعلق تہذیبی سطح پر متعین کیا ہے اور انھوں نے اکبر اور اقبال کی طرح اپنے الفاظ کو علامتی سطح فراہم کی ہے۔

سلیم احمد کا آخری شعری مجموعہ ''چراغ نیم شب'' سلیم احمد کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ایک طرف ان کے تصور اور لاشعور کی ہم آہنگی کا عکاس ہے اور دوسری جانب اس مجموعے میں سلیم احمد نے عصر کے حوالے سے فکر کو اس طرح احساس بنا کر دکھایا ہے کہ جدید اردو شاعری میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ سلیم احمد کی دو غزلوں کے یہ اشعار اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

جانے کس نے کیا کہا تیز ہوا کے شور میں
مجھ سے سنا نہیں گیا تیز ہوا کے شور میں
میں بھی تجھے نہ سن سکا تو بھی مجھے نہ سن سکا
تجھ سے ہوا مکالمہ تیز ہوا کے شور میں
کشتیوں والے بے خبر بڑھتے رہے بھنور کی سمت
اور میں چیختا رہا تیز ہوا کے شور میں
میری زبانِ آتشیں لو تھی مرے چراغ کی
میرا چراغ چپ نہ تھا تیز ہوا کے شور میں

دل کے اندر درد آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیے کہ جزو زندگی بن جائیے
اک پتنگے نے یہ اپنے رقص آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جائیے
دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے
اب ذرا نیچے اتریے آدمی بن جائیے
وسعتوں میں لوگ کھو دیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آئیے اور آگہی بن جائیے
عالم کثرت کہاں ہے اب اکائی میں سلیم
خود میں خود کو جمع کیجیے اور کئی بن جائیے

تخلیقی زندگی کا عام تجربہ ہے کہ شاعر اور ادیب کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ پچیس تیس سال کی عمر میں کہہ لیتا ہے اس کے بعد یا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے یا پھر ساری عمر اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ لیکن سلیم احمد کا کمال یہ تھا کہ وہ ۵۶ سال کی عمر میں بھی تخلیقی طور پر زندہ اور توانا تھے اور اس عمر میں بھی ان کی شخصیت امکانات کی ایک دنیا تھی۔ یہ خیال سلیم احمد کے انتقال کے ۲۸ سال بعد بھی ان کی موت کے دکھ کو کم نہیں ہونے دیتا۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جدید ادب پر قرض تھا جو بخوبی ادا ہوا

ایک کتاب میں سموئی سلیم احمد کی ہمہ جہت شخصیت

خواجہ رضی حیدر کی کتاب ''سلیم احمد'' پر صابر وسیم کی خصوصی تحریر

سلیم احمد

جدید ادب کی ایسی ہنگامہ خیز شخصیت تھے کہ جن کے ذکر کے بغیر گزشتہ نصف صدی کا ادبی منظر نامہ نامکمل رہتا ہے۔ شاعر، ادیب، کالم نویس، ڈرامہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے وہ تین عشروں تک اردو ادب کے افق پر پوری آب و تاب کے ساتھ براجمان رہے۔ علمی و ادبی موضوعات پر نت نئے سوالات اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تنازعات اُن کی زندگی کا حصہ رہے۔ لیکن کسی بھی اختلافی نکتے پر ان کی علمی دیانت اور خلوص کی سچائی سے کبھی کوئی انکار نہیں کرسکا۔ نظم و نثر کی مختلف اصناف میں اُن کی تخلیقی صلاحیتیں اعلیٰ درجے کی حامل رہیں، لیکن نقاد کی حیثیت سے ان کی پوری شخصیت پر چھائی رہی۔ تنقید کی صنف کو چونکہ ادب میں بہت خشک اور بے مزہ موضوع گردانا جاتا ہے لہٰذا نقاد کی شخصیت میں وہ کشش اور دلچسپی نہیں پائی جاتی جو ادب کی کسی اور صنف سے وابستہ افراد میں موجود ہوتی ہے۔ مگر سلیم احمد، اس کلیے سے مبرا تھے۔

اس کا ثبوت خواجہ رضی حیدر کی کتاب ''سلیم احمد، مشاہدے، مطالعے اور تاثرات کی روشنی میں'' سے فراہم ہوتا ہے۔

مشہور اور عوامی شخصیات پر کتاب لکھنا زیادہ دشوار کن مرحلہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں دلچسپی کے بہت سے چٹکلے، واقعات اور کہاوتیں خودبخود شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن کسی علمی و ادبی شخصیت کو کتاب کا موضوع بنایا جائے تو یہ لکھنے والے کے لیے جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ خاص طور سے اُس وقت کہ جب لکھنے والا خود بھی علم و ادب کے کوچے کا مسافر ہو۔ سلیم احمد پر کتاب لکھنا آسان مرحلہ نہیں تھا۔ سلیم احمد کے انتقال کو ۳۰؍ برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ سلیم احمد کے دوستوں، ساتھیوں اور حلقے میں جید ادیب اور اہلِ قلم بھی شامل تھے۔ لیکن اس عرصے میں چند مختصر مضامین کے علاوہ کوئی ایسی جامع اور مفصل تحریر سامنے نہیں آئی جو سلیم احمد کی علمی و ادبی سرگرمیوں، تنقیدی موضوعات اور سیاسی و سماجی نظریات کے ساتھ ساتھ خود ان کی زندگی اور روز و شب کا مکمل احاطہ کرکے ہمارے سامنے پیش کرسکتی۔

سلیم احمد کی حیات و خدمات پر ایک بھرپور کتاب جدید اردو ادب پر ایک قرض تھا جو کئی عشروں سے واجب تھا جواب بخوبی ادا ہوا۔ خواجہ رضی حیدر نے اردو ادب پر واجب اس قرض کو بہت شاندار اور باوقار انداز میں ادا کیا ہے۔

اسلوب کی خوبی نے کتاب کو اہلِ علم کے ساتھ ساتھ عام قاری کے لیے بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے سلیم احمد کی علمی و ادبی زندگی اور ان کا پورا عہد زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ کراچی میں ۶۰؍ اور ۷۰؍ کے عشرے کی ادبی زندگی، اس عہد کی ادبی ہنگامہ خیزی، ادبی چپقلش، علمی و ادبی بحث و مباحث، نئی اور پرانی نسل کا باہمی ربط و تعلق، اختلافی گروہ بندی میں بھی اخلاقی پاس داری اور ادب سے سنجیدہ کمٹمنٹ کے جو مظاہرے اُس دور میں وقوع پذیر ہوئے تھے، وہ سب خواجہ رضی حیدر نے اس کتاب میں اس خوبی سے قلم بند کیے ہیں کہ ایک جیتا جاگتا ادبی معاشرہ متحرک فلم کی طرح چلتا پھرتا ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

سلیم احمد کی شخصیت جتنی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو تھی اس کو ایک کتاب میں سمو دینے کا دشوار کام جس طرح خواجہ رضی حیدر نے انجام دیا ہے وہ یقینی طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

جب پری شان خٹک نے اپنی اور
صدیق سالک کی طرف سے احتجاج کیا

میرے سلیم بھائی

سلیم بھائی نے لکھا تھا: فتح محمد بہت اچھا لکھتا ہے مگر بے ایمان ہے۔ آپ کو برا لگا تو کہنے لگے۔ آپ اپنے آپ سے بے ایمانی کرتے ہو۔''

فتح محمد ملک

اسلام آباد ہوٹل کے ایک کمرے میں احمد ندیم قاسمی کے پاس ادیبوں کا جمگھٹ لگا تھا۔ جائے تنگ و مردماں بسیار کی صورت درپیش تھی۔ لوگ آتے اور جہاں جگہ پاتے ٹک جاتے۔ سلیم احمد تشریف لائے تو میں نے بہ منت انھیں کرسی پر بٹھایا اور خود ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ سلیم احمد کے رخصت ہونے پر پروفیسر پری شان خٹک میرے اس طرزِ عمل پر معترض ہوئے، کہنے لگے:

''میں ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں۔ صدیق سالک صدرِ مملکت کے پریس سیکرٹری ہیں۔ ہم دونوں خوبصورت، لمبے تڑنگے جوان ہیں۔ ہم نے تھری پیس سوٹ پہن رکھے ہیں۔ جب ہم داخل ہوئے تو ملک صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے، لیکن جب میلی سی شیروانی میں ملبوس ایک شخص آیا تو انھوں نے بہ صد اصرار اسے اپنی کرسی پیش کر دی۔ میں اور سالک پلنگ کی پائنتی پر سکڑے رہے ہیں، میں اپنی اور سالک کی طرف سے اس رویہ پر احتجاج کرتا ہوں۔''

اس پر احمد ندیم قاسمی نے حیرت کے ساتھ پوچھا:

''پری شان صاحب آپ واقعتاً اس اُجلی اور منور شخصیت سے متعارف نہیں؟ یہ سلیم احمد تھے۔''

''اچھا! تبھی آپ بھی ہم سب کو بھول کر صرف انھی کے ساتھ باتوں میں محو تھے۔'' پریشان خٹک کی تشفی ہوگئی اور میں یہ واقعہ بھول گیا۔ ایک مدت بعد سلیم احمد کی یاد میں برپا ایک تقریب میں پروفیسر پریشان خٹک نے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے میرے ذہن میں اس واردات کو تازہ کر دیا۔ میرے اور سلیم احمد کے درمیان محبت اور رفاقت کا یہ گہرا اور اٹوٹ ربط اس زمانے سے قائم ہے جب اول تو مجھے کوئی جانتا ہی نہ تھا اور جن چند لوگوں کی نظر سے میرے ابتدائی مضامین گزرے تھے انھیں یہ ماننے میں تامل تھا کہ واقعۃً میرا کوئی وجود ہے۔ وہ کہتے تھے فتح محمد بھی بھلا کسی ادیب کا نام ہو سکتا ہے۔ ہو نہ ہو کوئی پرانا ادیب اس قلمی نام کے ساتھ ادبی مباحث چھیڑ رہا ہے۔ ایسے میں ''ادبِ لطیف'' میں میرا ایک مضمون پڑھ کر سلیم احمد نے انتظار حسین سے پوچھا:

''یہ تم نے فتح محمد ملک صاحب کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟ کون صاحب ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کب لکھنا شروع کیا اور تمھارے ہتھے کیسے چڑھے؟ ان کا مضمون بہت پسند آیا۔ ادبِ لطیف اگر ہر مہینے ایک مضمون ایسا شائع کردے اور سال بھر میں دو ایک آدمی ایسے ڈھونڈ نکالے تو سمجھو کہ بات بن گئی۔''

جنوری ۶۳ء کے ادبِ لطیف میں سلیم احمد کی یہ بے ساختہ اور والہانہ داد پا کر مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی۔ چند روز بعد سلیم احمد کا پہلا خط ملا۔ میں ان دنوں اپنے گاؤں میں مقیم تھا۔ اس احساس نے میری خوشی کو دو چند کر دیا کہ ضلع اٹک کے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں بیٹھے ایک نوآموز اور گمنام مبتدی کی تحریروں کو سلیم احمد اتنی توجہ اور اس قدر محبت کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ میں خوشی میں ایسا سرشار ہوا کہ خط لکھنے میں تاخیر کر دی۔ اس پر سلیم احمد نے لکھا:

''ملک صاحب! میں تو آپ کے جواب سے مایوس ہی ہو چکا تھا، کیونکہ ایک صاحب نے مجھے یہاں بتایا کہ جس مقام کا نام میں نے ''ملہٹی'' لکھا ہے وہ ملہٹی نہیں ''ملہٹی''

ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد کیا امید رہتی ہے۔ ارادہ کر رہا تھا کہ دوسرا خط لکھوں کہ اتنے میں آپ کا جواب آیا۔

''دشتِ وفا'' کے تبصرہ پر آپ کو تو نہیں مگر قاسمی صاحب کو یہی گمان گزرا ہے کہ یہ ان کے فکاہی کالموں کا ردعمل ہے۔ خوب تماشا ہے کہ یہاں دہری جواب دہی کرنی پڑتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں تبصرہ میں قاسمی کی اپنی تعریف کی گئی ہے جس کے وہ مستحق نہیں تھے اور خود قاسمی صاحب کو اس میں مخالفت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر قاسمی صاحب کو آپ کے خط کا اقتباس بھیجوں گا۔

رہ گیا آپ کا یہ کہنا کہ بھائی سلیم احمد تمھیں دوسروں کی رائے سے کیا لینا؟ مجھے دوسروں کی رائے سے کچھ نہیں لینا اسی لیے تو یہ جھگڑا ہے۔ ورنہ دوسروں کی رائے لینے والے تو بس چُپ چاپ رائیں نقل ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ غالب پر کوئی صحیح رائے اس وقت تک دی جاسکتی ہے جب تک ان تمام نقادوں سے نہ لڑا جائے جنھوں نے غالب کی شخصیت پر ہزار بار پردے تانگ دیے ہیں۔ میر، سالک اور ممتاز حسین کی رائیں جو ظاہر ہے کہ ذمہ داری سے ظاہر کی گئی ہیں، قاسمی کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ پڑھنے والے انھیں محترم ادیبوں کی دقیع ادبی رایوں کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ پھر ان پر بات کرنا غلط کیسے ٹھہرا۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان و بیان کی غلطیاں شاعری کے لیے سم قاتل ہیں۔ شاعری کے ''معنی'' پر غیرضروری زور دینے کے سبب یہ خیال عام ہوا کہ زبان و بیان کچھ نہیں۔ لیکن میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ شاعری صرف ''زبان'' ہے اور صرف ''بیان'' ہے۔ چلیے اس میں معنی بھی ڈال دیجیے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ورنہ بیدل نے تو یہ کہا ہے کہ ''شعر خوب معنی ندارد۔''

اچھا ایک بات بتائیے۔ آپ بھی دوسروں کی طرح اس مرض میں کیوں مبتلا ہیں کہ لکھنے والے کی ہر تحریر کو اس کے جذبات کی ''عکاسی'' کے طور پر پڑھیں۔ تحریر، لکھنے والے کی شخصیت اور کردار کا آئینہ سہی، مگر تحریر کوئی گٹر نہیں ہے جس میں آدمی چُپ چاپ سارا کوڑا کرکٹ پھینک دے۔ ''غیرضروری شدت'' کا ذکر بعض لوگوں نے اسی انداز میں کیا ہے۔ جیسے میں نے اپنے دل کی ''بھڑاس'' نکالی ہے اور اب بھڑاس نکالنے کے بعد متوازن ہو جاؤں گا۔ خیر دوسرے لوگوں کا ذکر نہیں لیکن جب مظفر اور آپ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں اس وقت میں بیچارہ کیا کروں۔ ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں میں ایک پوری نسل، پورے رجحان بلکہ باقاعدہ ایک نظریے سے لڑ رہا ہوں۔ تبصرہ میں میرا معاملہ افراد سے ہے۔ اصول ہے کہ ہاتھی کو گرز سے مارا جاتا ہے اور چیونٹی کو چپل سے۔ مجھ میں غیرضروری شدت نہ پہلے موجود تھی نہ اب کم ہوئی ہے۔ بس میں گرز کی جگہ گرز استعمال کرتا ہوں اور چپل کی جگہ چپل۔ یہی اصول لڑائی کا ہے اور یہی اصول صلح کا۔ صلح میں بھی بعض لوگوں کا کام ایک پھول کے تحفہ سے چل جاتا ہے اور بعض لوگوں کے لیے گلستان بھی کم پڑتے ہیں۔

لکھنے کی ضرورت تو نہیں، لیکن دل چاہتا ہے تو کیوں نہ لکھوں، آپ کی تحریریں مجھے پسند ہیں۔ ادبِ لطیف میں آپ کا مضمون ''تمیزدار ہو کی بدتمیزی'' اتنا پسند آیا کہ بے اختیار انتظار کو مبارک باد دینی پڑی کہ اس نے اتنا ضروری، اتنا خیال افروز اور اتنا دل چسپ مضمون شائع کیا۔ اس کے ساتھ آپ کی دوسری تحریروں کا اشتیاق پیدا ہوا۔ آپ کی تحریروں میں ایک عجیب بات پاتا ہوں اور یہ میرا ذاتی تاثر ہے کہ آپ میرے اندر شدید امید پیدا کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد شدید مایوسی۔ خدا جانے گڑبڑ کہاں ہو جاتی ہے۔ میں چونکہ مقبول لوگوں کی غیرضروری شدت کا مارا ہوں اس لیے آپ کے بارے میں کہتا ہوں۔ ''فتح محمد بہت اچھا لکھتا ہے۔ مگر بے ایمان ہے۔'' آپ کو بُرا لگا؟ لگا تو لگے۔ آپ اپنے آپ سے بے ایمانی کرتے ہیں۔ یہ آپ کے ''ممدوحین'' کیا چیز ہیں۔ قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، لاہور کی نئی نسل۔ ان میں کچھ تعریف کی باتیں ہیں تو تعریف ضرور کیجیے۔ کیونکہ تعریف نہ کرنے والا بھی بے ایمان ہوتا ہے۔ تعریف ضرور کیجیے مگر اپنی ''قیمت'' پر نہیں۔ آپ ان سب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

سے زیادہ گراں بہا چیز ہیں۔ بشرطیکہ آپ جو کچھ ہیں اس سے روگردانی کر کے کچھ اور بننے کی کوشش نہ کریں۔

جمیل صاحب کا بس سے حادثہ ہوگیا تھا، بچ گئے۔ اب بہتر ہیں۔ ان کی کتاب کتابت کے لیے جا چکی ہے۔ میں نے اس دوران دو ایک مضمون لکھے ہیں۔ آپ کراچی آئیں گے تو دکھاؤں گا۔ آپ کراچی کب آ رہے ہیں؟

آپ کا

سلیم احمد

سلیم احمد نے حسبِ معمول خط پر تاریخ درج نہیں کی۔ مگر لفافہ پر ڈاک کی مہر بتاتی ہے کہ مجھے یہ خط ۱۹ راگست ۶۳ء کو موصول ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم ترقی پسندوں کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ رسالہ ''نیا دور'' میں ''دشتِ وفا'' پر اپنے مفصل تبصرہ میں انھوں نے غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک اور ممتاز حسین کے خیالات کی تردید اور زبان و بیان کے دو ایک اسقام کی نشاندہی کے بعد ندیم صاحب کی شاعری کے اصل حسن کی تحسین کی تھی۔ مگر یار لوگوں کی نگاہ فقط تردید میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ دونوں طرف نیتوں پر شکوک بڑھنے لگے تھے۔ میں نے ندیم صاحب کو سلیم احمد کے قلم سے تحسینی تبصرہ پر مبارک باد دی اور سلیم احمد صاحب سے تردیدی حصہ کی شکایت کی تھی۔ چنانچہ سلیم احمد نے اپنے خط کے ایک حصہ میں میری شکایت کی تو دوسرے حصے میں میری حقیر تحریروں پر اتنی بے لاگ اور اس قدر محبت بھری تنقید کی کہ ''بے ایمان'' کا اسم صفت مجھے ''دشنام'' نہیں انعام معلوم ہوا۔

ہماری باہمی محبت میں جو چیز نادر و نایاب ہے وہ ہے اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کی نیت کی صفائی اور رائے کی دیانت پر اٹوٹ اعتماد۔ احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب اور لاہور کی نئی نسل (ناصر کاظمی، انتظار حسین اور ان کا حلقۂ اثر) آج بھی میرے ''ممدوحین'' میں شامل ہیں۔ اس کے باوجود سلیم احمد کی محبت اور رفاقت کی یاد میرا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ میں کسی معاشرے کی تندرستی اور توانائی کا اندازہ اس میں اختلاف رائے کے پنپنے کے امکانات سے کرتا ہوں۔ کسی معاشرے میں انفرادی اور گروہی اختلاف رائے کے حدود (Range) جس قدر وسیع ہوں گے وہ معاشرہ اسی قدر تندرست و توانا ہوگا۔ بدنصیبی سے تنگ نظری اور کور باطنی کی منحوس گرفت نے ہمارے معاشرے کو ایک بیمار معاشرہ بنا رکھا ہے۔ آج ہمارے ہاں قرض محبت کی قینچی ہو یا نہ ہو، اختلاف رائے ضرور محبت کی قینچی ہے۔ رائے سے اختلاف ذات پر حملہ تصور کیا جانے لگا ہے۔ ایسے میں سلیم احمد کی ذات ہماری معاشرتی توانائی کی علامت تھی۔ وہ جس دلیری اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اسی بہادری کے ساتھ مخالفانہ نقطۂ نظر پر غور کرتے تھے۔ ادب اور سیاست کے چند مسائل پر کبھی کبھار میرے اور ان کے درمیان چھوٹے موٹے اختلاف پیدا ہوئے۔ مگر ذہنی تحفظ کی اس فضا میں بھی ہماری قلبی یگانگت میں سرمو فرق نہ آیا۔ جس وقت بھٹو صاحب کے اسلامی مساوات کے نعرہ نے مجھے مسحور کر رکھا تھا عین اس وقت سلیم احمد نے اسلامی سوشلزم کے تصور کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا اور پھر وہ وقت آیا جب سلیم احمد وزارت اطلاعات کے مشیر مقرر ہوئے اور ''جسارت'' کا نامہ نگار یونیورسٹی سے میری برطرفی کا مطالبہ کرنے لگا۔ ان حالات میں بھی سلیم احمد کی گرم جوشی میں کمی نہ آئی۔ اگر وہ ایک دن کے لیے بھی اسلام آباد آئے تو نظیر صدیقی کو ساتھ لے کر مجھے ڈھونڈتے پھرے۔ دینی عقائد میں اختلاف کا معاملہ ادب اور سیاست سے کہیں زیادہ نازک معاملہ ہے مگر سلیم احمد اس نازک مرحلے کو بھی کس حسن و خوبی کے ساتھ طے کرتے ہیں۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

گوشۂ سلیم کی ان تحریروں کی فراہمی میں عملی مدد و راہنمائی کے لیے جناب نصیر سلیمی کا خصوصی شکریہ۔ ان کا ایک شکریہ ہم پر اور بھی واجب الادا تھا اور اس کا تعلق گوشۂ ضمیر کی تیاری سے تھا۔ حق بہ حق دار رسید۔

(مدیر)

سلیم احمد کی یاد میں

جسے امرتا پریتم نے اپنی کتاب میں شامل کیا

”اُن کی تحریریں صدیوں سے مکالمہ معلوم ہوتی ہیں“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سارہ شگفتہ کی ایک نادر تحریر

ستمبر ۸۳ء میں عہدِ جدید کے زیرک نقاد اور شاعر ہم سے جدا ہوئے تھے۔ سلیم احمد کی یاد میں تیار کیے گئے خصوصی گوشہ میں ایک نادر تحریر شائع کر رہے ہیں۔ یہ تحریر نثری نظم کی جواں مرگ شاعرہ سارہ شگفتہ کی ہے جو مشہور ہندوستانی مصنفہ، امرتا پریتم نے اپنی تصنیف ”ایک تھی سارہ“ میں شامل کی ہے۔ ”ایک تھی سارہ“ سارہ شگفتہ کے فکر و فن پر ہندی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔ امرتا پریتم کی کتاب کے اس باب کو اردو میں منتقلی کے لیے ہم سلیم احمد کے رفیق دیرینہ جناب عطا صدیقی کے ممنون ہیں۔

”نظم ہو یا نثر، قلم کی تخلیق کو ہمارے رشیوں نے اس حسینہ کا نام دیا تھا جس کا دیدار صرف اسے نصیب ہوتا ہے جس کے پاس روح کی آنکھ ہو......

سارہ کے پاس یہ آنکھ تھی اور سارہ کی یہی آنکھ رو دیتی تھی، جب چاروں طرف اسے لفظ فروش دکھائی دیتے تھے......

کہتے ہیں...... سلیم احمد ایک بہت بڑے شاعر تھے، بہت اچھے نقاد اور بہت اعلیٰ انسان اور کسی نے سلیم احمد کے لیے بہت غیر شعوری لفظ استعمال کیے تو سارہ سے رہا نہیں گیا۔ کہنے لگی ”جمیل بھائی! نفرت سے بڑا رزق آپ نے نہیں چکھا اور اسی لذت نے آپ کے اندر خوف کے گہرے کنوئیں کھود رکھے ہیں......

اب سارہ اکادمی سے جب مجھے سارہ کے لکھے ہوئے کچھ مضمون ملے ہیں تو اُن میں سے ایک مضمون

سلیم احمد کے انتقال پر لکھا ہوا ابھی ملا ہے۔ وہ کس پہچان سے لکھا ہوا ہے، سارہ کی اسی آنکھ کی بات کرنے کے لیے اس مضمون کا کچھ حصہ یہاں درج کر رہی ہوں۔

اس مضمون کو سارہ نے نام دیا ہے۔ سلیم احمد اور سارا شگفتہ کی پاگل ڈائری۔

علم کا سمندر مٹی نے اپنے من میں کہیں چھپا لیا ہے۔۔۔۔ یہ کمی ہمیں سے ہمیں کو محروم رکھے گی۔ ظرف اور ضبط کی زمین ہم سے بچھڑ گئی ہے۔

انسانیت ان کا مذہب تھا اور یہی ان کا علم بھی۔ اس کا ذرک انسان کو ہو جائے تو انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی اذیت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کے بہت بڑے نقاد تھے اور ہیں۔ ان کی تجزیاتی اور علمی آنکھیں بڑی زندہ تھیں۔

ان کی تحریریں صدیوں سے مکالمہ معلوم ہوتی ہیں۔ کسی سے مانگی ہوئی زمین نہیں۔

وہ اپنے یہاں لفظ کو سنگسار نہیں کرتے بلکہ لفظوں کے ہاتھوں کو زندہ کرتے ہیں اور لفظ کو انسان کہتے ہیں۔

''ادھوری نمود کے دور سے جب یہ گزرتے ہیں تو تخلیقی عمل میں وہ جذبوں کی پرواز میں کہیں بھی ادھورے نہیں اترتے بلکہ اپنے یہاں کی تخلیق کو مکمل سوچ دیتے ہیں۔

جمالیاتی لہجہ میں وہ کہیں بھی تھکتے ہوئے نظر نہیں آتے خواہ جمالیات کو انھوں نے مدت کے لفظ سے ہی شروع کیا ہو۔

کبھی کبھی تو کہتے نظر آتے ہیں کہ چتا کے دھوئیں سے میں نے انسان بنایا۔

جذبوں کی وہ پیوندی نہیں کرتے بلکہ جذبوں کی قید سہہ کر تخلیق کرتے ہیں۔

تحریروں کی زبان درازی سچے وجدان رکھتی ہے۔ تصور اور حقیقت کی مشکلیں نہیں کہتے بلکہ روانی کو روح کہتے ہیں۔

ابلاغ کے فلسفہ کو انھوں نے اتنی اڑانیں بخشی ہیں کہ نیا لکھنے والا بھی چٹان کو لفظ کرتا آگے بڑھ جاتا ہے، آبشار کی طرح۔

سلیم احمد نے تمام عمر ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ اس کے علاوہ نئی نسل کو جو شعور دیا ہے، اپنی تحریروں سے، اپنی طرز زندگی سے، اسے نئی نسل بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

ان کا وژن اور انسانی رویہ انسان تک پہنچا ہے۔ ان کے چلے جانے سے سارا شہر رویا ہے جیسے ہر سنسان آدمی نے خود کو اپنے آنسوؤں میں ڈھونڈ لیا ہے۔

سلیم احمد نے مجھے اُس وقت سے بیٹی جانا جب میں لفظ لفظ بھی نہ تھی۔۔۔۔

میں جب کسی ہسپتال میں داخل ہوتی، وہ میری مزاج پُرسی کو ضرور آتے۔

میں جب بھی سلیم احمد کے پاس جاتی، وہ چراغ خاموشی سے انھیں دے دیتی۔ وہ مسکرا کر رکھ لیتے اور کہتے کیسی ہو سارا بیٹی! شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے اور خاموش چراغوں کو دیکھا کرتے۔

جس روز سلیم احمد کا انتقال ہوا اس روز میں حسب دستور دو چراغ خریدنے کے لیے گئی۔ چراغوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لیکن سارے چراغ کہیں نہ کہیں سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ میں نے چراغ والے سے کہا۔ کیا کوئی چراغ سلامت نہیں؟

اس نے کہا۔۔۔۔ آج سارے چراغ ٹوٹ گئے ہیں۔

میں نے کہا تو پھر مجھے ٹوٹے ہوئے چراغ ہی دے دو۔

میرے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے چراغ تھے اور میں سوچ رہی تھی، آج سلیم احمد کو ٹوٹے ہوئے چراغ ہی دے دوں گی۔ مسکین عزیز پہنچی تو شامیانہ لگا ہوا تھا اور بے تحاشا لوگ۔۔۔۔ میں سمجھی کوئی تقریب ہے شاید۔ لیکن ابھی گیٹ تک ہی پہنچی تھی کہ فراست رضوی نے پہلے ٹوٹے ہوئے چراغ اپنے ہاتھ میں تھام لیے اور پھر کہا۔ سلیم احمد تو۔۔۔۔ اور میرے اندر وہ سارے چراغ جل بجھ کر شور مچانے لگے۔۔۔۔ مجھے اذیت سے یہ احساس ہوا کہ اب مجھے بیٹی کہنے والا کوئی نہیں۔۔۔۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

دُنیا کے جنونی مُسافر

ہر روز جان ہتھیلی پر رکھ کر سفر کرنے والے مسافروں کا قصۂ عجب

فرحان سلیم

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

یاکوتسک، روس

اگر باہر درجہ حرارت ۲ رورجے سینٹی گریڈ ہو اور ایسی شدید سردی میں سٹاپ پر کھڑے ہو کر سواری کا انتظار کرنا پڑے، تو ایسے عالم میں انتہائی محنتی شخص بھی گرم و نرم بستر طوعاً و کرہاً ہی چھوڑتا ہے۔ یہ صورت حال مدِ نظر رکھ کر ذرا مشرقی سائبیرین شہر، یاکوتسک (Yakutsk) کے بیچارے مسافروں کی حالت ذہن میں لائیے...... انھیں سال کے بیشتر دنوں میں منفی ۴۵ رورجے سینٹی گریڈ ٹھنڈ سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ صبح سویرے اتنی شدید سردی میں کار سٹارٹ کرنا بھی کارے دارد ہے۔ اگرچہ شہر کا ہر مالدار شہری اپنے گیراج میں نظام گرمائش نصب کراتا ہے۔ اس پر ان کے ۳۳ رہزار ڈالر (ساڑھے اکتیس لاکھ روپے) خرچ ہوتے ہیں۔

گاڑیاں رکھنے والے یہ خرچ برداشت کرلیں، تو سڑکوں پر انھیں ایک اور مصیبت درپیش ہوتی ہے۔ دراصل عموماً سڑکوں پر برف کی اتنی موٹی تہہ جم جاتی ہے کہ سردیوں کے لیے مخصوص ٹائر بھی اکثر ان پر چل نہیں پاتے۔ چنانچہ معمولی کوتاہی پر کار پھسل جاتی ہے۔ یوں ہر ہفتے شہر کی سڑکوں پر کئی حادثے ہوتے ہیں۔ ایک اور آفت یہ ہے کہ مسافر طویل عرصہ بس اسٹاپ پر سواری کا انتظار کرے، تو موت کے منہ میں پہنچ سکتا ہے۔ خصوصاً بوڑھے مرد و زن تو بہت جلد امراضِ تنفس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ علاقے کی زیرِ سطحی زمین (Permafrost) مستقل منجمد رہتی ہے۔ لہٰذا وہاں زیرِ زمین ریلوے بھی تعمیر نہیں ہوسکتی۔ بہرحال اگلے سال یاکوتسک قومی شاہراہ اور ریلوے نظام کے ذریعے روس کے تمام بڑے شہروں سے جڑ جائے گا۔ تب مقامی آبادی کو یہ "سہولت" تو مل جائے گی کہ وہاں سے فرار ہوسکیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ینگس روڈ، بولیویا

بولیویا میں یہ سڑک ''ال کامینو ڈی لا موریٔ'' (El Camino de la Muerte) بھی کہلاتی ہے۔ بولیوین زبان کے اس جملے کا مطلب ہے: ''موت کی سڑک'' اور یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ سچائی پر مبنی ہے۔ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہر سال ۲۵۰ر سے زائد مسافر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پہاڑوں میں کسی سانپ کے مانند پیچ وخم کھاتی یہ سڑک اَسّی سال قبل حکومت نے بنوائی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ شمالی بولیویا کے بارانی جنگلات میں رہنے والے شہری دارالحکومت، لاپاز تک رسائی حاصل کر سکیں۔

یہ سڑک محض کھانے کی بڑی میز (ڈائننگ ٹیبل) جتنی چوڑی ہے۔ یہی نہیں، سڑک پر جگہ جگہ انتہائی خطرناک موڑ ہیں اور اس کے بیشتر حصے میں ۹۰۰ر میٹر گہری کھائیاں مسافروں کا دل دہلا دیتی ہیں۔ ان آفتوں کے علاوہ مسافروں کو ہبوط ارض (Land Sliding)، موسلا دھار بارشوں اور مخالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کے خطرات بھی درپیش ہوتے ہیں۔ بعض جگہ سڑک اتنی پتلی ہے کہ آنے جانے والی گاڑیاں چیونٹی کی چال چلتی آر پار گزرتی ہیں۔

۲۰۰۶ء میں بولیوین حکومت نے ''موت کی سڑک'' کا نیا حصہ تعمیر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ینگس روڈ (Yungas Road) کے جو خطرناک حصے ہیں، انھیں ترک کیا جا سکے۔ پھر بھی سڑک پر جگہ جگہ رکھے صلیب کے نشان اور پھولوں کے گلدستے عیاں کرتے ہیں کہ ابھی ''موت کی سڑک'' بہت سا خون نوش کرے گی۔

لوس پائنوس تار، کولمبیا

کئی والدین کو شکایت ہوتی ہے کہ سکول بس میں شرارتی بچے ان کے بچوں کو تنگ کرتے ہیں۔ بعض ایسے والدین تو بے چارے ڈرائیور کو مجرم ٹھہرا کر اس کی جان عذاب میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن کولمبیا کے جنگل میں واقع گاؤں، لوس پائنوس (Los Pinos) کے بچے سکول جاتے ہوئے جن خطرات کا سامنا کرتے ہیں، وہ پاکستانی والدین کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔

دراصل لوس پائنوس ایک ۳۶۵ میٹر گہری کھائی کے باعث قریبی دیہات سے کٹا ہوا ہے۔ ماضی میں گاؤں کے بچوں کو سکول پہنچنے کے لیے ۲ گھنٹے پیدا چلنا پڑتا تھا۔ ان پر ترس کھا کر ایک مخیر شخص نے کھائی کے درمیان لوس پائنوس سے قریبی دیہہ فلوس تک اسٹیل کی معلق تاریں لگوا دیں۔

چنانچہ اب روزانہ صبح سویرے گاؤں کے پندرہ سولہ بچے تار کے قریب جمع ہوتے ہیں۔ ہر بچہ اپنی پلی، رسی اور خصوصاً لکڑی کا ایک ٹکڑا لے کر آتا ہے۔ یہ چوبی ٹکڑا بریک کا کام دیتا ہے ورنہ ۶۵ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اُترتے وقت وہ زمین پر موجود تاروں سے ٹکرا سکتا ہے۔ چھوٹے بچے بوری میں بند کر کے بڑے بچوں کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں۔ یوں روزانہ ان کے خطرناک سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

گاؤں کے ساتھ بڑے بھی روزانہ سٹیل کے تاروں کی مدد ہی سے جاتے آتے ہیں۔ واپسی پر گھریلو سامان بھی ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسٹیل کی تاریں کس حد تک وزن سہار سکتی ہیں۔ تاہم دیہاتی ان کے ذریعے اپنے جانور، بڑے کارٹن حتیٰ کہ فرنیچر تک لا چکے اور ابھی تک تاریں سلامت ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ٹوکیو کا ریلوے نظام

جاپان کا شمار امیر ترین ممالک میں ہوتا ہے اور اس کی حکومت کے پاس وسائل کی بھی کمی نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ ٹوکیو ریل نظام میں زبردست رش پر قابو نہیں پا سکی۔ یہی وجہ ہے، جاپانیوں کے لیے ریل میں سفر کرنا کسی عذاب سے کم نہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس سفر کے لیے ایک ضرب المثل ''تو سکین جیگو کو'' (Tsukin Jigoku) تخلیق کر ڈالی جس کے معنی ہیں ''مسافروں کی دوزخ۔''

ٹوکیو کے مسافر کھچا کھچ بھرے ریل کے ڈبوں میں سفر کرتے ہیں۔ کسی کو صرف کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے، تو شکر کرتا ہے۔ مگر اتنے ہجوم میں نازک مزاج مسافروں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ان کے لیے پھر یہ سفری آفت نہیں، انھیں ''اوشیا'' (Oshiya) سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

یہ خاکی وردی اور سفید دستانوں میں ملبوس وہ ریلوے ملازم ہیں جو ٹوکیو کے ''۸۷ لاکھ'' مسافروں کو ڈبوں میں ٹھونستے ہیں۔ وہ مسافروں کو باقاعدہ دھکے دیتے ہیں تاکہ ریل کا دروازہ بند ہو سکے۔

ٹوکیو کی مقامی حکومت نے حال ہی میں ریلوں کی تعداد بڑھائی ہے۔ تاہم اس قدم سے کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ ٹوکیو دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے اور روزانہ وہاں ہزاروں انسانوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کبھی آپ کا ٹوکیو جانا ہو اور وہاں ریل میں سفر کرنا پڑے، تو اپنا خانہ خراب کرانے کے لیے تیار رہیے۔

بیجنگ، چین

ایک زمانے میں یہ کہاوت مشہور تھی ''بیجنگ میں ۹۰/لاکھ سائیکلیں ہیں۔'' لیکن یہ بات پرانی ہو چکی، کیونکہ اب اس چینی شہر کی سڑکوں پر ۵۰/لاکھ کاریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ بھاگتی دوڑتی اتنی زیادہ کاریں دیکھ کر نازک مزاج لوگوں کو تو خوف آنے لگتا ہے۔

لندن کے ٹریفک جام پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ ایسے عالم میں وہاں کاریں محض ۱۶/کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں لیکن یورپ کے اس سب سے بڑے شہر میں بھی ۳۰/لاکھ کاریں ہیں۔ گویا ہر مربع کلومیٹر میں وہاں ۱۶۶/کاریں ملتی ہیں۔ لیکن بیجنگ میں یہ عدد ۴۷۲/ ہے جو دماغ گھما دیتا ہے۔

پچھلے ۵۰/برسوں میں اس چینی دارالحکومت نے زبردست معاشی ترقی کی ہے، نتیجتاً آج روزانہ ۱۹۰۰/نئی کاریں بیجنگ کی ٹریفک کا حصہ بن رہی ہیں۔ شہری اس لیے بھی کاریں خریدنے پر مجبور ہیں کہ دارالحکومت میں پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام خراب ہے لہٰذا وہ بسوں یا ریلوں میں خوار ہونے کے بجائے کار خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ویسے بھی ایک ارب تیس کروڑ کی آبادی کم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ چینی شہروں میں اب ٹریفک کا زبردست بہاؤ دیکھنے کو ملتا ہے اور اسی لیے چینی شاہراہوں پر ٹریفک جام بھی اکثر جنم لیتا رہتا ہے اور جب یہ جنم لے، تو عالمی خبروں میں جگہ پاتا ہے۔

اگست ۲۰۱۰ء میں بیجنگ کی ایک مرکزی شاہراہ پر ٹریفک جام شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ ۱۰۰/کلومیٹر دور تک پھیل گیا۔ اس کی آخری دم منگولیا کی سرحد تک چلی گئی تھی۔ یہ ٹریفک جام ۹/دن بعد ختم ہوا۔ ایسی صورت میں سائیکل پر سفر کرنا یا پیدل چلنا بہترین طریقہ لگنے لگتا ہے۔

حسینی پُل، پاکستان

ایک شوریدہ سر دریا پر بنے چوبی تختوں پر چلنا بچوں کا کھیل نہیں، کجا یہ کہ یہ دیکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے چلا جائے، کہیں کوئی تختہ ٹوٹا ہوا تو نہیں ہے؟ ایسے عالم میں بڑے بڑے جی داروں کا پِتا پانی ہو جاتا ہے۔ لیکن شمالی علاقہ جات کے ایک گاؤں، حسینی میں مقیم باشندوں کا یہ معمول ہے۔ وہ روزانہ ۱۹۴میٹر انتہائی خطرناک پُل پر چلتے، کام کو جاتے اور واپسی پر گھریلو سامان، جلانے کی لکڑی، مویشی اور دیگر اشیا لاتے ہیں۔ چند سال قبل شدید طوفان نے حسینی پُل کو نشانہ بنایا، تو پہلے اُسے کئی میٹر بلند کیا اور پھر زور سے پانی پر پٹخا۔ اس حادثے نے کئی تختے توڑ ڈالے اور پُل ناکارہ ہو گیا۔ چنانچہ نیا پُل تعمیر کرنا پڑا۔

پچھلے سال اس نئے پُل کو ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہبوطِ ارض کے باعث نیچے بہتا دریائے ہنزہ اتنا بلند ہو گیا کہ پُل کئی ہفتے پانی میں ڈوبا رہا۔ ویسے بھی عام حالات میں دریائے ہنزہ معمولی دریا نہیں۔ مثلاً پُل پر چلتے ہوئے کوئی گر پڑے، تو وہ جان جوکھم میں ڈال کر ہی تیرتا کنارے تک پہنچے گا۔

مقامی باشندے اپنی سی سعی کرتے رہتے ہیں کہ پُل کے تختے صحیح سالم رہیں۔ وہ مضبوط لکڑی سے تختے بناتے ہیں اور اُمید کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ پھر بھی حسینی پُل پار کرتے ہوئے کسی کو دیکھا جائے، تو یہی لگتا ہے کہ مشہور فلم ''انڈیانا جونز اینڈ دی ٹیمپل آف ڈوم'' کا کوئی سنسنی خیز منظر دیکھا جا رہا ہے۔ ■

میراتھن دوڑنے والا ۱۰۱ سالہ بابا

فوجا سنگھ کی داستانِ عجب

جس نے کئی میل لمبی دوڑ میں حصہ لے کر انسانی عزم و ہمت کی نئی مثال قائم کردی

شمیم اختر

ایک انسان اگر ۱۰۰ رسال کی زندگی پا جائے، تو یقیناً وہ ربِ عظیم کا شکرگزار ہوتا ہے۔ گو لوگ اُسے حیرت سے دیکھتے ہیں کہ انتہائی بوڑھا ہوجانے کے بعد بھی وہ سانس لے رہا ہے۔ چونکہ برصغیر پاک و ہند میں اوسط عمر ۶۰/ ۶۵ ربرس ہے لہٰذا کسی کا ۱۰۰ ربرس تک زندہ رہنا ایک کرشمہ ہی ہے۔ لیکن اسی جغرافیائی خطے سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا بابا بھی ہے جو طویل فاصلوں کی دوڑوں (میراتھن) میں حصہ لیتا اور انسانی قوت اور برداشت کے لازوال مظاہرے سے سبھی کو ششدر کر دیتا ہے۔ اس کا نام فوجا سنگھ ہے۔

☆☆

فوجا سنگھ یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو جالندھر کے نزدیک واقع ایک قصبے بیاس پنڈ میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے اُسے صبح کی سیر کی عادت پڑ گئی جو ابھی تک برقرار ہے۔ ۱۹۹۲ء میں جب اس کا بیٹا لندن مقیم ہوا، تو فوجا سنگھ بھی بیٹے کے پاس چلا آیا۔

لندن میں صحت بخش ماحول میسر آیا، تو فوجا سنگھ میراتھن دوڑوں میں حصہ لینے لگا۔ ان میں سب سے طویل لندن میراتھن ہے جو ۲۶ رمیل لمبی ہوتی ہے۔ فوجا سنگھ نے شروع میں ۳ رتا ۱۰ رمیل لمبی دوڑوں میں حصہ لیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ وہ طویل میراتھن بھی دوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ ۸۵ رسال کی عمر میں وہ لندن میراتھن میں دوڑا اور اُسے ۷ رگھنٹوں میں مکمل کرلیا۔

اس سال ۱۰۱ رسالہ فوجا سنگھ اپنی آخری لندن میراتھن میں شریک ہوا۔ اب وہ طویل دوڑوں میں حصہ نہیں لے

گا۔ تاہم مختصر فاصلے کی دوڑوں میں وہ شامل ہوگا۔ دراصل دوڑنا اس کے خون میں شامل ہے۔ کہتا ہے ''میں نے جس دن دوڑنا بند کیا، موت مجھے آدبوچے گی۔ میری تمنا ہے، میں ایسے انسان کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جاؤں جو مرتے دم تک دوڑتا رہا۔''

فوجا سنگھ کی قابلِ رشک صحت کا راز یہ ہے کہ اس نے آج تک سگریٹ اور شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ روزانہ دس میل دوڑتا یا پیدل چلتا ہے۔ کھانے میں اسے سبزیاں و پھل مرغوب ہیں اور وہ منفی خیالات سے دور رہتا، نیز مثبت خیالات اپناتا ہے۔ ان تمام عوامل نے مل کر اُسے بہترین صحت کا حامل بنایا۔

منفرد ریکارڈ

ماضی میں ۹۸ سالہ یونانی دیمتریون یوردینڈس نے مکمل لندن میراتھن دوڑ کر ضعیف ترین دوڑاک یا رنر (Runner) ہونے کا عالمی ریکارڈ بنایا تھا لیکن ۲۰۱۱ء میں ۱۰۰ سالہ فوجا سنگھ نے اُسے توڑ ڈالا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ موصوف کا یہ عالمی ریکارڈ طویل عرصہ برقرار رہے گا۔

ماہرین کہتے ہیں کہ کئی لوگ سبزیاں و پھل کھاتے، سگریٹ و شراب سے پرہیز کرتے اور منفی خیالات سے دور رہتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی کوئی ہی ستر اسی سال تک میراتھن دوڑتا ہے۔ ۱۰۰ سال کی عمر میں حصہ لینا تو دور کی بات ہے۔ اگر محض درج بالا عادات و معمولات ہی انسان کی عمر طویل کرتے، تو آج سڑکوں پر سیکڑوں سو سالہ مرد و زن چل پھر رہے ہوتے۔

طویل عمر کا راز

یہ یاد رہے کہ میراتھن یا طویل دوڑ انسانی بدن پر بڑے سخت اثرات مرتب کرتی ہے۔ نیز انسان جتنا بوڑھا ہو، یہ اثرات بھی اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔ مثلاً دل جسم میں آکسیجن صحیح طرح نہیں پھیلا پاتا۔ ایک تحقیق کے مطابق بیس سالہ نوجوان کی نسبت اس کی صلاحیت ۴۰ فیصد کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور تحقیق سے انکشاف ہوا کہ انسان جب ۷۰ برس کا ہو جائے، تو ہر ۱۰ برس بعد اس کے عضلات (Muscles) کی طاقت ۳۰ فیصد کم ہوتی ہے۔

بڑھاپے میں ہمارے عضلات اور نسیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ معمولی سا حادثہ یا چوٹ بھی اُسے زخمی کر ڈالتی ہے۔ اسی طرح جگر کی بافتیں بھی سکڑتی ہیں اور جسم انسانی کا یہ اہم عضو پھر پہلے کی طرح اپنا کام بخوبی انجام نہیں دے پاتا۔

خوشخبری کی بات یہ ہے کہ انسان اگر جوانی میں صحت مند طرزِ زندگی اپنائے اور خود کو جسمانی سرگرمیوں میں مشغول رکھے، تو بڑھاپے کے کئی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ایسے لوگوں کا گروہ جنم لے چکا جو سمجھتا ہے کہ صحت مند عادات اپنا کر طویل عمر پا سکتا ہے۔

اس گروہ اور بہت سے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دوڑنا طویل عمر پانے کی اہم کنجی ہے۔ چنانچہ ان کے لیے فوجا سنگھ ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے اور فوجا سنگھ نے بھی ثابت کر دیا کہ انسان چاہے تو وہ مروجہ اقدار کو توڑ سکتا ہے۔ ظاہر ہے، اس سے قبل کس کو گمان تھا کہ ایک ۱۰۰ سالہ بابا دوڑ میں حصہ لے گا اور وہ بھی میراتھن میں جو بہت سخت جسمانی مشقت کا تقاضا کرتی ہے؟

برطانیہ کا ایک تربیت کار، کرس گالوے لوگوں کو میراتھن دوڑنے کے سلسلے میں تربیت دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''اگر ایک ۸۰ یا ۹۰ سالہ بوڑھے کی صحت اچھی ہے، تو وہ بھی میراتھن میں حصہ لے سکتا ہے۔ کامیابی کی کلید یہ ہے کہ آہستہ آہستہ دوڑا جائے۔ نیز درمیان میں کئی وقفے کیے جائیں تاکہ ٹانگیں تھکن کا شکار نہ ہوں۔''

فوجا سنگھ انگریزی نہیں بول سکتا، لہٰذا ایک دوست، ہرمیندر سنگھ اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہرمیندر سنگھ کا کہنا ہے ''میں سمجھتا ہوں فوجا کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر بہت مضبوط ہے۔ چنانچہ دوڑنے سے وہ روحانی و جسمانی قوت حاصل کرتا ہے۔ دوڑ نے اسے جینے کا نیا ڈھنگ دے ڈالا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

لاکھوں میں ایک

فوجا سنگھ نے بھی میراتھن دوڑنے کے اسرار و رموز کرس گالوے سے سیکھے۔ کرس دراصل ایسے بوڑھے مرد و زن کو تربیت دینے میں مشتاق ہے جو میراتھن میں حصہ لینا چاہیں۔ تاہم وہ اقرار کرتا ہے کہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے بغیر ۱۰۰ سال کی عمر پانا اور پھر مسلسل دوڑتے رہنا... یہ کارنامہ لاکھوں انسانوں میں سے کوئی ایک ہی انجام دے سکتا ہے۔

کرس گالوے کے نزدیک اگر انسان اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں پورے طور پر استعمال کرے، تو طویل عرصہ چاق و چوبند رہتا اور لمبی عمر پاتا ہے لیکن ۱۰۰ سال تک فوجا سنگھ کی طرح صحت مند رہنا غیر معمولی انسان ہی کا کام ہے۔ چنانچہ وہ بھی ایسا فوق البشر انسان ہے۔

فوجا سنگھ کے فوق البشر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ۱۰۰ سال کی عمر میں ایک بابے کے لیے یہی بہت بڑی بات ہے کہ وہ دس بارہ گز چل لے، میراتھن دوڑنا تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر برگمین الزبتھ برطانیہ میں ممتاز ماہر امراض قلب ہے۔ وہ کہتی ہے ''میں نے آج تک فوجا سنگھ جیسا مضبوط قوت ارادی اور جسمانی طاقت رکھنے والا بوڑھا نہیں دیکھا۔ خصوصاً اس کا دل بہت قوی ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ میراتھن دوڑتے وقت نوجوانوں کے قلب پر بھی انتہائی دباؤ ہوتا ہے جو دل کے دورے سے جنم لیتا ہے۔ اسی لیے عموماً وہ میراتھن کے بعد خاصی جسمانی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحبہ بوڑھے مرد و زن کو مشورہ دیتی ہیں کہ جسمانی طور پر سرگرم عمل رہیں۔ روزانہ چہل قدمی کریں اور تھوڑا بہت وزن بھی اٹھائیں۔ یوں وہ متفرق امراض مثلاً گٹھیا، امراض قلب اور ہڈیوں کی بوسیدگی سے محفوظ رہتے ہیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

گینز ورلڈ ریکارڈ والوں سے تنازع

پچھلے دنوں فوجا سنگھ کے دوست، ہرمیندر سنگھ نے عالمی ریکارڈ مرتب کرنے والے مشہور ادارے، گینز ورلڈ ریکارڈ کو ایک درخواست بھیجی۔ وہ یہ کہ ادارہ فوجا سنگھ کو ضعیف ترین میراتھن رنر قرار دے۔ تاہم گینز والوں نے یہ ریکارڈ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وجہ یہ ہے کہ فوجا سنگھ کے پاس پیدائشی (برتھ) سرٹیفکیٹ نہیں۔ جبکہ گینز ورلڈ ریکارڈز کا قانون ہے کہ عمر مستند ہونے کے لیے پیدائشی سرٹیفکیٹ ہونا لازمی ہے۔ ہرمیندر نے دیگر بھارتی دستاویزات اور برطانوی پاسپورٹ ادارے کو دکھایا مگر یہ چیزیں مستند تصور نہیں کی گئیں۔

ہرمیندر سنگھ کا کہنا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں آج بھی لاکھوں بچوں کا پیدائشی سرٹیفکیٹ نہیں بنتا۔ چنانچہ ۱۰۰ برس قبل تو یہ رواج بہت ہی کم تھا، پھر اس زمانے میں برطانوی ہی ہندوستان کے حاکم تھے۔ چنانچہ اگر فوجا سنگھ کا برتھ سرٹیفکیٹ نہیں بنا، تو برطانوی حکومت ہی اس کی ذمے دار ہے۔ ہرمیندر کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ گینز ورلڈ ریکارڈ والے نسل پرست ہیں۔ اگر فوجا سنگھ کی جگہ کوئی انگریز یا یورپی ہوتا، تو اس کا دعویٰ تسلیم کر لیا جاتا۔

اس تنازع کے متعلق فوجا سنگھ کا کہنا ہے ''بھئی میں تو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ مجھے کسی نے تفصیل سے بتایا تو سمجھ میں آیا کہ گینز ورلڈ ریکارڈ کیا شے ہے۔ میں تو اپنی خوشی کی خاطر دوڑتا ہوں اور اس عمل سے دوسرے بھی حظ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ وہ مجھے ضعیف ترین میراتھن رنر تسلیم نہیں کرتے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

۱۰۱ سالہ فوجا سنگھ کی ذات ان انسانوں کے لیے امید کا منبع ہے جو کسی بیماری سے بہت جلد حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ ■

فیس بُک کا مُحافظ

سکیورٹی فرم "سوفوس"
کے ماہرین جدید آلات
کے ذریعے دُنیائے انٹرنیٹ
میں گھومتے ہوئے مجرموں
تک جا پہنچے

۸۴ کروڑ افراد
پر پھیلی سلطنت کی
حفاظت اتنا آسان
نہیں ہے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رخسانہ فضل

اگر فیس بک کو ایک ملک سمجھا جائے، تو بہ لحاظ آبادی وہ دنیا کا تیسرا بڑا دیس ہوگا اور جو سلیوان کو اس کا تھانیدار بلکہ وزیرداخلہ سمجھیے۔ تاہم دنیا کی سب سے بڑی سوشل ویب سائٹ میں اس کا عہدہ ''چیف سیکورٹی افسر'' ہے۔

جو سلیوان کے دشمنوں یا بقول شخصے ''دہشت گردوں'' کی کوئی کمی نہیں بلکہ اُسے دنیائے نیٹ میں بستے اور دندناتے پھرتے ہمہ اقسام کے مجرموں سے پالا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر روس کا کوب فیس گینگ (Koobface Gang)، جس نے ایسا وارم (Worm) تخلیق کیا جو فیس بک استعمال کرنے والے کے کمپیوٹروں کو اپنا غلام بنا لیتا تھا۔

اسی طرح پچھلے دسمبر میں نامعلوم سپیمروں (Spammers) نے فیس بک کو فحش اور متشدد تصاویر سے بھر ڈالا۔ پھر ایسے دھوکے بازوں کی بھی کمی نہیں جو فیس بک استعمال کنندگان کو جھانسہ دے کر مخصوص لنک پر کلک کراتے اور مختلف کمپنیوں سے رقم کماتے ہیں۔ یہی لوگ سروے کرا کر بھی کمائی کرتے ہیں۔

راہ سے بھٹکے مرد فیس بک کے ذریعے نوجوان بچے بچیوں کو پھانستے ہیں۔ اسی طرح اسکریپروں (Scrapers) کی سعی ہوتی ہے کہ استعمال کنندگان کی نجی وخفیہ معلومات چُرا کر اپنے مذموم مقاصد پورے کریں۔ پھر مجرموں میں ہیکرز اور نوجوان لڑکیوں کو تنگ کرنے والے بدنہاد بھی شامل ہیں۔ چنانچہ سلیوان اور ان کی فوج کو ایسے تمام مجرموں سے رات دن، ۲۴ گھنٹے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

دُنیائے فیس بک میں ملزمین و مجرمین کی کمی نہیں لہٰذا ان کی کھوج میں پولیس بھی اکثر آ پہنچتی ہے۔ روزمرہ کاموں میں سلیوان کی ایک اہم ذمے داری یہ ہے کہ طلب کرنے پر زیرتفتیش استعمال کنندگان کی کتنی معلومات پولیس کو دی جا سکتی ہیں۔ دنیائے فیس بک کے وزیرداخلہ کی حیثیت سے سلیوان ۵۰ رکنی ٹیم کا سربراہ ہے۔ وہ خاصی حد تک امریکی انتظامیہ کو مطلوبہ معلومات دے دیتا ہے۔ تاہم انتظامیہ حد سے بڑھے، تو ان کی مانگیں پوری نہیں کرتا۔ چنانچہ چند بار اس کی اعلیٰ پولیس افسروں سے منہ ماری بھی ہو چکی ہے۔

امریکی شہریوں کو یہ آئینی تحفظ حاصل ہے کہ حکومت ان سے بے معنی تفتیش نہیں کر سکتی اور نہ ہی گھر کی تلاشی لے سکتی ہے۔ تاہم دنیائے فیس بک میں وہیں کے اصول وقوانین چلتے ہیں۔ ان کی رو سے استعمال کنندگان کا فرض ہے کہ وہ دیگر ارکان کو تنگ نہ کریں، جعلی اکاؤنٹ نہ بنائیں، فحش مواد وتصاویر اپ لوڈ نہ کریں اور کاپی رائٹ حقوق کے منافی مواد نہ دیں۔ تاہم قوانین میں یہ درج نہیں کہ فیس بک انتظامیہ کب پولیس کا کردار ادا کرتے ہوئے مطلوبہ معلومات حکومتوں کے سپرد کر سکتی ہے۔

اسی طرح فیس بک نئے استعمال کنندہ کو یہ انتباہ بھی نہیں کرتی کہ وہ سائٹ پر جو کچھ پوسٹ کرے گا، کسی بھی وقت اس کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے۔ ازروئے قاعدہ فیس بک سرکاری درخواست پر استعمال کنندہ کا یوزرنیم، ای میل پتا اور خصوصاً آئی پی ایڈریس دیتی ہے جس کی مدد سے مطلوبہ شخص تک پہنچنا ممکن ہے۔ لیکن سلیوان کا دعویٰ ہے کہ استعمال کنندہ کی بقیہ چیزیں...... پاس ورڈ، تصاویر، اسٹیٹس اپ ڈیٹ، نجی پیغامات، دوستوں کی فہرست، گروپ ممبرشپس، پوکس وغیرہ کے متعلق معلومات پولیس یا امریکی حکومت کو فراہم نہیں کی جاتیں...... انھیں حاصل کرنے کے لیے وارنٹ کا ہونا ضروری ہے۔

۴۳ سالہ جو سلیوان اپنے دفتر میں عموماً ٹی شرٹ اور جینز پہنے نظر آتا ہے۔ اپنے لمبے سنہرے بالوں اور تیکھے نقوش کے باعث وہ سابق وکیل نہیں بلکہ کسی میوزک گروپ کا رکن لگتا ہے۔ اسی لیے اجنبی کو یہ جان کر کچھ حیرت ہوتی ہے کہ وہی فیس بک کے تقریباً ساڑھے چوراسی کروڑ استعمال کنندگان کے حقوق کی حفاظت کرتا اور ساتھ ساتھ انھیں چھان بین کا نشانہ بھی بناتا ہے۔

سلیوان کا دفتر فیس بک ہیڈکوارٹرز میں ہے جو امریکی ریاست، کیلی فورنیا کے شہر مینلو پارک میں واقع ہے۔ اس کے ماتحت بھی اس کے آس پاس ہی بیٹھتے ہیں۔ یہ انتہائی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پیشہ ور سراغ رساں استعمال کنندگان کی پسند و ناپسند سے بھی خوب واقف ہیں۔ سال رواں کے آخر میں فیس بک اسٹاک ایکسچینج میں اپنے حصص فروخت کرے گی۔ تب اُمید ہے کہ وہ ۱۰۰ارب ڈالر (۹۰۰۰ارب روپے) مالیت کی کمپنی بن جائے گی۔ ماہرین کی رو سے فیس بک کی عظیم الشان کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے کروڑوں استعمال کنندگان کو حد سے زیادہ سرکاری تفتیش اور مجرموں، دونوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

جو سلیوان امریکی ریاست، میساچوسٹس کے شہر کیمبرج میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مصور اور مجسمہ ساز تھا۔ ماں استانی تھی۔ ۱۹۹۳ء میں اس نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور ریاست میامی کے محکمہ داخلہ سے منسلک ہوا۔ اسی نے اپنے افسروں پر دباؤ ڈال کر محکمے میں پہلا انٹرنیٹ کنکشن لگوایا۔ بعدازاں وہ بحیثیت سیکورٹی افسر مختلف نیٹ کمپنیوں میں ملازمت کرتا رہا۔ ۲۰۰۹ء میں فیس بک میں شمولیت اختیار کی۔

پچھلی نیٹ کمپنیوں میں سلیوان کے قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلقات عمدہ تھے۔ چنانچہ وہ انھیں مطلوب معلومات آزادی سے فراہم کرتا تھا۔ لیکن فیس بک پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ یہاں استعمال کنندگان کی نجی زندگی (پرائیویسی) کی کڑی حفاظت ہوتی ہے۔ سلیوان کا دعویٰ ہے کہ جب فیس بک سرکاری درخواست ماننے سے انکار کردے، تو ''۹۹.۹ فیصد'' معاملات میں حکومت پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

سلیوان آزادیِ رائے اور فرد کی پرائیویسی میں دخل اندازی نہ کرنے کا بڑا حامی ہے۔ لیکن جب معاملہ دھوکے بازوں یا بچوں کی بے حرمتی کرنے والوں کا آئے، تو وہ صبر و برداشت بالکل نہیں دکھاتا۔ جب بھی معلوم ہوا کہ فلاں استعمال کنندہ کسی بھی قسم کی دھوکے بازی یا بدکاری میں ملوث ہو، تو اُسے فوراً دنیائے فیس بک سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔

فیس بک کے ہیڈکوارٹر میں سلیوان اور اس کی ٹیم کے لیے ایک حصہ مخصوص ہے۔ اس وسیع ہال میں بھی ۱۰افراد علیحدہ بیٹھتے ہیں۔ وہ امریکی حکومت کی طرف سے آنے والی درخواستیں دیکھتے اور سنبھالتے ہیں۔ ٹیم کے پانچ افراد ڈبلن، آئرلینڈ میں فیس بک کے یورپی ہیڈکوارٹر میں تعینات ہیں۔ وہ ہر یورپی زبان بولتے اور مختلف یورپی، ایشیائی اور افریقی حکومتوں کی طرف سے آنے والی درخواستوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

پچھلے سال وکی لیکس کے مشہور زمانہ راہنما جولین اسانج نے فیس بک کو دنیا کی بہترین جاسوسی مشین قرار دیا تھا کیونکہ وہ ۲ارب انٹرنیٹ استعمال کنندگان میں سے ۴۰فیصد تک رسائی رکھتی ہے۔

پچھلے ماہ آسٹریا کے ایک ۲۴سالہ طالب علم نے ''رسائی کے حق'' (Right to Access) والے قانون کا سہارا لیا۔ اس یورپی قانون کے باعث ہر کمپنی کی ذمے داری ہے کہ درخواست پر وہ کسی شہری سے متعلق تمام معلومات رکھنے والی تفصیل فراہم کرے۔ وہ طالب علم اپنی فیس بک فائل کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ۳سال سے اس کا رکن تھا۔ طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی فائل ۱۲۲۲صفحات طویل تھی۔

جب اسانج نے فیس بک کو ''جاسوسی مشین'' کہا، تو یہ خطاب سلیوان کو قطعاً پسند نہ آیا۔ وہ کہتا ہے ''ہمارے ہاں ڈیٹا کی ایسی پائپ لائن کا کوئی وجود نہیں جو سی آئی اے تک جارہی ہو۔ اگر کسی کو فیس بک پر تلخ تجربات ہوئے ہیں، تو اسے چاہیے کہ اس کو خیرباد کہہ دے۔''

وقت کے ساتھ ساتھ امریکیوں (اور غیرملکیوں کی بھی) کی اکثریت فیس بک پر خاصا وقت گزارنے لگی ہے۔ پھر سائٹ پر ان کی نجی زندگی سے متعلق خاصی معلومات بھی موجود ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے محض ثبوت ہی نہیں تفتیش میں بھی فیس بک سے مدد لینے لگے ہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

پچھلے ماہ امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر میامی میں ایک ۲سالہ بچی اغوا ہوگئی۔ ماں نے جن افراد پر شک ظاہر کیا، ان کی معلومات پولیس کے ریکارڈ میں دستیاب

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نہیں تھیں لیکن ان میں سے بیشتر نے فیس بک میں اکاؤنٹ کھول رکھے تھے۔ چنانچہ پولیس نے سلیوان سے رابطہ کیا، اُسے صورتِ حال بتائی اور مطالبہ کیا کہ سائٹ مشکوک افراد سے متعلق جتنی بھی معلومات رکھتی ہے، وہ اُسے فراہم کر دی جائیں۔

چونکہ ۲ سالہ بچے کی زندگی و موت کا معاملہ تھا، لہٰذا سلیوان نے قانونی تقاضوں کے طویل عمل کو پس پشت ڈالا اور ساری معلومات پولیس کے حوالے کر دیں۔ پولیس آئی پی ایڈریسوں کے ذریعے جلد ہی ملزموں تک جا پہنچی اور ۲ گھنٹے بعد بچہ برآمد ہو گیا۔

دراصل فیس بک کے کئی استعمال کنندگان کو خبر نہیں کہ اب ایسے خصوصی سافٹ ویئر ایجاد ہو چکے جو مسلسل ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ گویا اب جاسوسی کرنے کے لیے انسانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی مثلاً پچھلے برس فیس بک نے مائیکروسافٹ کے تیار کردہ پروگرام ''فوٹو ڈی این اے'' کو اپنایا تھا۔ جب بھی فیس بک کا استعمال کنندہ کوئی تصویر اپ لوڈ کرے، تو فوٹو ڈی این اے اُسے اسکین کرتا ہے۔ اگر وہ تصویر فحش ہو، تو فیس بک سیکورٹی ٹیم فوراً اسے ڈیلیٹ کر دیتی ہے۔

سلیوان کا کہنا ہے ''ہمارے ذخیرے میں ہزارہا اقسام کی فحش تصاویر موجود ہیں۔ یہ ذخیرہ ایف بی آئی کے ذخیرے سے بھی بڑا ہے۔ اگر اپ لوڈ ہونے والی تصویر ذخیرے کی کسی تصویر سے میل کھا جائے، تو ہمیں فوراً پتا چل جاتا ہے۔ مزید براں ہم نے استعمال کنندگان کو فلیگنگ اور یوزر رپورٹ کی سہولت بھی دی ہوئی ہے۔ (ان دو اپلی کیشنوں کے ذریعے استعمال کنندگان فیس بک انتظامیہ کو متنازع امور کے متعلق آگاہ کرتے ہیں۔) اگر کوئی شکایت ملے، تو ہم پھر استعمال کنندہ کی تمام البموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی قابلِ اعتراض تصویر ملے، تو اسے اپنے ذخیرے میں شامل کرتے اور پھر ختم کر دیتے ہیں۔''

سلیوان کی پولیس البتہ بعض قابلِ اعتراض سرگرمیوں پر نگاہ رکھتی ہے۔ مثلاً بچوں اور بالغان کے تعلقات نظر میں رہتے ہیں۔ کوئی مرد ۸۰ فیصد تک خواتین کو فرینڈ بنانا چاہے، تو وہ مشکوک استعمال کنندگان کی فہرست میں آجاتا ہے۔ اسی طرح کوئی استعمال کنندہ اکثر اپنی تاریخ پیدائش تبدیل کرے اور وہ سترہ اٹھارہ سال کا ہے، تو اس پر بھی سرخ دائرہ لگ جاتا ہے۔ جعلی اکاؤنٹ بنانے والوں کی تلاش میں مختلف سافٹ ویئر فیس بک ٹیم کی مدد کرتے ہیں۔

فیس بک کے استعمال کنندگان کو شاید خبر نہیں، سولیوان کی پولیس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ غنڈوں اور بدمعاشوں کو نکال باہر کرے۔ دراصل دنیائے فیس بک کو مہذب، شائستہ اور باتمیز رکھنے کے لیے ایسے اقدامات کرنا ضروری ہیں۔ تاہم فیس بک انتظامیہ کی بھرپور کوشش ہے کہ عام استعمال کنندگان کی پرائیویسی کسی طور متاثر نہ ہو۔ حال ہی میں فیس بک کے پروفائل صفحے کو ''ٹائم لائن'' کی شکل دی گئی ہے۔ اس پر کئی استعمال کنندگان نے احتجاج کیا، کیونکہ ٹائم لائن سے ان کی پچھلے کئی برس کی تاریخ (ہسٹری) دیکھی جا سکتی ہے۔

جب جو سلیوان نے فیس بک کی سیکورٹی کا انتظام سنبھالا، تو اس نے مجرموں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نئی حکمت عملی اپنائی۔ عام سوشل ویب سائٹوں کی سعی ہوتی ہے کہ دفاع مضبوط بنایا جائے تاکہ حملے کم سے کم ہوں۔ لیکن سلیوان چاہتا ہے کہ مجرمین کا پیچھا کر کے اُنھیں عدالت کے کٹہرے تک پہنچایا جائے۔ وجہ یہی ہے کہ سلیوان شعبہ وکالت سے بھی تعلق رکھتا ہے چنانچہ وہ ملزم کو سزا دلوائے بغیر چھوڑنے کو تیار نہیں۔

سلیوان کو شکایت ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے زیادہ تر انھی لوگوں کا پیچھا کرتے ہیں جو کاپی رائٹ حقوق کی خلاف ورزی کریں۔ جبکہ وائرس، مال ویئر، سپام وغیرہ تخلیق کرنے والوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے جو دنیائے انٹرنیٹ میں بدمعاشی مچاتے پھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلیوان نے معاملات اپنے ہاتھوں میں لیے اور ملزموں کو عدالتوں میں گھسیٹنے لگا۔ وہ کہتا ہے ''کئی کمپنیاں مثلاً کریڈٹ کارڈ کے ادارے فراڈ کی شناخت اور اپنے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دفاع پر کثیر رقم خرچ کرتے ہیں، لیکن وہ مجرموں پر مقدمہ قائم نہیں کرتے۔ اب ہم یہ کھوج لگانے میں بڑا وقت صرف کرتے ہیں کہ کون دوسری طرف بیٹھا جرم کرنے میں مصروف ہے۔''

کوب فیس کے مجرم

کچھ عرصہ قبل ۵ روسیوں نے کوب فیس نامی وارم بنایا۔ اس نے ہزارہا کمپیوٹروں کو متاثر کیا۔ اس کی بدولت روسی مجرموں نے تقریباً ۶۰ لاکھ ڈالر (۳۶ کروڑ روپے) کمالیے۔ ہوتا یہ تھا کہ گینگ نے فیس بک پر ایک پوسٹ ''You have to watch this crazy video'' چسپاں کردی۔ جو بھی اس پوسٹ پر کلک کرتا، اُسے کہا جاتا کہ ویڈیو دیکھنے کے لیے ایک اَپ ڈیٹ انسٹال کرو۔ وہ اَپ ڈیٹ دراصل ایسا سافٹ ویئر تھا جس کے ذریعے استعمال کرنے والے کا کمپیوٹر گینگ کا غلام بن جاتا لیکن استعمال کرنے والے کو اس کا علم نہ ہوتا۔ پھر گینگ ارکان کمپیوٹر سے قیمتی راز چوری کرتے، بدمعاش ویب سائٹوں یا کمپنیوں کو بیچتے یا خود فائدہ اٹھاتے۔

جب کئی فیس بک استعمال کنندگان کوب فیس وارم سے متاثر ہوئے، تو سلیوان نے مجرموں تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پھر ایک سیکورٹی فرم، سوفوس (Sophos) کے ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ یہ ماہرین جدید ترین آلات کے ذریعے دنیائے انٹرنیٹ میں گھومتے ہوئے مجرموں کے کمپیوٹروں تک جا پہنچے۔ اس کھوج میں فیس بک نے اپنے ذرائع مثلاً آئی پی ایڈریسوں اور تصاویر سے بھی مدد لی۔ سیکورٹی ماہرین گینگ کی تصاویر ڈھونڈنے میں کامیاب رہے۔ ان میں وہ سوئٹزرلینڈ میں چھٹیاں منا رہے تھے۔

جب ہر طرح سے سلیوان اور سوفوس کے ماہرین کو یقین ہوگیا کہ وہ کوب فیس کے خالقوں تک پہنچ چکے، تو سارے ثبوت ایف بی آئی کو فراہم کر دیے گئے لیکن ایک سال گزر گیا، امریکی تحقیقاتی ادارے نے کوئی کارروائی نہ کی۔ چنانچہ سلیوان نے معاملہ خود سنبھالا اور کوب فیس گینگ کی مجرمانہ کارروائی کی تفصیل نیویارک ٹائمز میں شائع کرا دی۔ تب روسی قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آئے اور انھوں نے اپنے ملزم گرفتار کر لیے۔

اس مثال سے عیاں ہے کہ فیس بک عالمی سطح پر جرائم کے خلاف اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ تاہم سلیوان کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ٹیم بہت چھوٹی ہے، چنانچہ ۸۴ کروڑ افراد پر پھیلی سلطنت کی حفاظت کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ یہی مسئلہ مدنظر رکھ کر فیس بک نے یہ اسکیم شروع کی ہے کہ جو کوئی بھی سائٹ کی سیکورٹی میں سقم یا کمزوری دریافت کرے، وہ ۵۰۰ ڈالر (۴۵ ہزار روپے) تک کے انعام کا مستحق بن سکتا ہے۔ اس ضمن میں سلیوان کہتا ہے ''ہم چاہتے ہیں کہ اپنے استعمال کنندگان کو چوکیدار اور سپاہی بنادیں۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

تحقیق

۳۰ فیصد بیماریوں کا تعلق ہمارے غیرفطری طریق نیند سے ہے

چین کی نیند

رات کو اُٹھ کر واک کرنے سے ذہنی تناؤ کم کیا جاسکتا ہے

ڈاکٹر کاشف اصغر

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رضوان میرا بڑا اچھا دوست ہے۔ ایک ہفتہ پہلے دورانِ گفتگو اس نے بتایا ''جب بھی رات کو میری آنکھ کھل جائے، تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ پریشانی یہ ہوتی ہے کہ نیند نہ آئی، تو تھکن دور نہیں ہوگی۔ یوں اگلا دن سست و بوجھل حالت میں گزرے گا اور کام صحیح طور پر انجام نہیں پائیں گے۔''

یہ مسئلہ صرف رضوان ہی کو درپیش نہیں، سیکڑوں لوگ اس تشویش میں گرفتار رہتے ہیں۔ انھیں خطرہ ہوتا ہے کہ رات کے عین درمیان آنکھ کھلی اور نیند نہ آئی، تو پھر اگلے دن کاموں کا ہرج ہوگا۔

لیکن اب ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ رات کے درمیانی حصے میں جاگنا کوئی بری بات نہیں بلکہ اس سے صحت پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ۸ر گھنٹے کی مسلسل نیند لینا غیر فطری عمل ہے...... قدیم انسانوں نے کبھی اس قسم کی نیند نہیں لی۔

انوکھا تجربہ

۱۹۹۰ء میں برطانیہ کے ماہر نفسیات، تھامس ویہر نے ایک انوکھا تجربہ کیا۔ اس نے ۲۰ر مرد و زن لیے اور انھیں ایک ماہ تک روزانہ ۱۴ر گھنٹے تاریکی میں رکھا۔

تجربے کے اوائل میں سبھی مرد و زن میں نیند کا معمول متاثر ہوا لیکن چوتھے ہفتے سے ان کی نیند کا معین معمول سامنے آ گیا۔ ہوا یہ کہ وہ پہلے ۴ر گھنٹے کی نیند لیتے۔ اس کے بعد ایک ۲ر گھنٹوں کے لیے جاگ جاتے اور مختلف کام انجام دیتے۔ پھر نیند کا دوسرا دور شروع ہوتا اور وہ ۴ر گھنٹے سوتے رہتے۔ یوں اس تجربے سے ثابت ہوا کہ مسلسل ۸ر گھنٹے سونا کوئی فطری عمل نہیں۔

نیند پر تحقیق کرنے والے سائنس دان اور ڈاکٹر اس تجربے سے خاصے متاثر ہوئے۔ تاہم عوام الناس میں یہی نظریہ مقبول رہا کہ ۸ر گھنٹے مسلسل سونا اچھی صحت کے لیے ضروری ہے اور یہ کہ درمیان میں آنکھ کھل جانے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔

تاریخ سے ثبوت

۲۰۰۱ء میں امریکی یونیورسٹی، ورجینیا ٹیک سے تعلق رکھنے والے تاریخ داں، راجر ایکرچ نے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اہم مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے میں راجر نے تاریخی حقائق سے ثابت کیا کہ قدیم انسان رات کو ۲ر ادوار یا مرحلوں میں سوتے تھے۔ یہ حقائق اس نے ۱۶ر برس کی شبانہ روز محنت و جستجو کے بعد اکٹھے کیے تھے۔

ان حقائق و شواہد کی بنیاد پر پھر راجر ایکرچ نے ایک کتاب ''At Day's Close: Night in Times Past'' تحریر کی جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ کتاب میں نیند کے دو ادوار پر ''۵۰۰'' حقائق موجود ہیں جو قدیم طبی کتابوں، روزناموں، شاہی درباروں کی دستاویزات اور ناولوں و افسانوں سے لیے گئے۔ ان میں ہومر کی اوڈیسی سے لے کر نائیجیریا کے جدید قبائل سے تعلق رکھنے والی دستاویزات شامل ہیں۔

تھامس ویہر کے تجربے کی طرح ان حقائق کا بھی لب لباب یہی ہے کہ پہلے زمانے میں انسان شام کو دو تین گھنٹے سو جاتے تھے۔ پھر وہ ایک دو گھنٹے کے لیے اٹھتے اور اس کے بعد مزید تین چار گھنٹے سونے میں گزارتے۔ گویا ہر رات دو ادوار میں ان کی نیند پوری ہوتی۔ یہ تب معمول کی بات تھی۔

پروفیسر راجر کا کہنا ہے کہ رات کے درمیانی حصے میں اٹھ کر لوگ متفرق سرگرمیاں انجام دیتے تھے مثلاً کوئی تمباکو نوشی کرتا، تو دوسرا حوائج ضروریہ سے فارغ ہو جاتا۔ جو لوگ مطالعے کے شوقین ہوتے، وہ موم بتی جلا کر کتاب پکڑ لیتے۔ کچھ لوگ تو گپ شپ لڑانے پڑوسیوں کے گھر چلے جاتے۔ اسی طرح لکھنا اور عبادت کرنا بھی مرد و زن کا معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب میں ایسی عبادتیں (مثلاً تہجد) اور دعائیں ملتی ہیں جو دونوں ادوار نیند کے درمیان ادا کی یا پڑھی جاتی تھیں۔

ادب میں ذکر

نیند کے ۲ر ادوار کا ذکر کئی ادبی کتب میں ملتا ہے۔ مثلاً ''اولڈ رابن آف پورٹنگیل'' (Old Robin of

(Portingale) ایک ہزار سالہ برطانوی بیلڈ (داستانی گیت) ہے۔ اس میں ایک جگہ درج ہے ''جب تم پہلی نیند سے جاگو تو گرم مشروب ضرور نوش کرو۔ یوں جب دوسری نیند سے جاگو گے تو تمھاری ساری پریشانیاں بھاگ چکی ہوں گی۔''

۱۶۱۵ء میں ہسپانوی ادیب، سریوانتیس نے اپنا مشہور ناول ''ڈان کیخوتے (Don Quixote) قلم بند کیا۔ اس میں موصوف نے ایک مہم جو کے کارنامے بیان کیے ہیں۔ ناول میں ایک جگہ درج ہے ''ڈان کیخوتے فطرت پسند تھا۔ چنانچہ جب وہ پہلی نیند سے تازہ دم ہو جاتا، تو عموماً دوسری (نیند) نہیں لیتا تھا لیکن سانچو (اس کے دوست) کو دوسری نیند کی ضرورت نہ پڑتی، کیونکہ اس کی پہلی نیند ہی رات سے لے کر صبح تک چلتی تھی۔''

یوں رفتہ رفتہ رات کو جاگنا یا باہر نکلنا ایک جائز سرگرمی بن گئی۔ یہ سرگرمی پھر بڑھتی چلی گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ وقت کم ہو گیا جو انسان آرام کی خاطر نکالتا تھا۔

کریگ کوسلوفسکی ایک اور ممتاز برطانوی مؤرخ ہے۔ اس نے بھی نیند کی تاریخ پر ایک کتاب ''ایوننگز ایمپائر'' (Evening's Empire) لکھی ہے۔ اس میں کریگ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ انسانوں کی شبینہ زندگی کا آغاز کیونکر ہوا۔

وہ لکھتا ہے ''۱۷ ویں صدی سے قبل رات کو گھروں سے باہر رہنا اچھا نہ سمجھا جاتا۔ عام خیال تھا کہ رات جرائم پیشہ لوگوں، طوائفوں، شرابیوں اور اسی قبیل کے مرد و زن کا ٹھکانا ہے۔ حتیٰ کہ جو امرا موم بتیاں خرید سکتے تھے، وہ بھی اپنی رقم دیگر مفید اشیا پر خرچ کرنا پسند کرتے تھے، چنانچہ رات باہر گزارنے سے کسی قسم کا عزت و احترام یا معاشرتی اقدار وابستہ نہیں تھیں۔''

''۸ گھنٹے کی مسلسل نیند لینا غیر فطری عمل ہے قدیم انسانوں نے کبھی اس قسم کی نیند نہیں لی''

PAKSOCIETY VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

چارلس ڈکنز برطانیہ کے مشہور ادیب ہیں۔ انھوں نے ۱۸۴۰ء میں بارنبی رج (Barnaby Ridge) نامی ناول لکھا۔ اس میں ایک جگہ ڈکنز لکھتے ہیں ''جب اس نے بڑی پریشانی میں پہلی نیند کا آغاز کیا، تب بھی اُسے علم تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس نے خواب دیکھا تو جاگ کر کھڑکی کی طرف یوں جوتا کھینچ مارا جیسے کسی بھوت کو بھگا رہا ہو۔''

نیند کا نمونہ کیوں بدلا؟

پروفیسر راجر کا کہنا ہے کہ جب ہر جگہ، سڑکوں، بازاروں اور گھروں میں بتیاں جلانے کا رواج شروع ہوا، تو انسانوں کی نیند کا نمونہ بھی بدلنے لگا۔ اس تبدیلی میں ان ریستورانوں، قہوہ خانوں اور شراب خانوں نے بھی اہم کردار ادا کیا جو رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔

لیکن یورپ میں تحریک اصلاح کلیسا (ریفارمیشن) اور اس کی مخالف تنظیموں نے جنم لیا تو پہلی تبدیلی آئی۔ تب پروٹسٹنٹ اور ان کے دشمن کیتھولک راتوں کو اپنی خفیہ میٹنگیں کرنے لگے۔ یوں پہلے رات جرائم پیشہ افراد سے متعلق تھی، تو اب معززین اور امرا بھی تاریکی سے فائدہ اٹھانے اور جاگنے لگے۔

جب یورپ میں مذہبی مناقشہ ختم ہوا، تب بھی طبقہ بالا میں راتوں کو جاگنے کا رجحان برقرار رہا، تاہم اس سہولت سے وہی فائدہ اٹھاتے تھے جو مالی طور پر مستحکم ہوں اور موم بتیاں خرید سکیں۔ لیکن جب گلیوں بازاروں میں بتیاں لگیں، تو معاشرے کے نچلے طبقے میں بھی رت جگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اور گلیاں روشن ہو گئیں

۱۶۶۷ء میں پیرس پہلا شہر بن گیا جس کی گلیاں بتیوں سے روشن ہوئیں۔ تب گلیوں میں شیشے سے بنے لیمپ رکھے گئے جن میں موم بتیاں رکھی تھیں۔ اس کے ۲ سال بعد ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) میں تیل سے روشنی پیدا کرنے والے لیمپ گلیوں میں نصب ہوئے۔

۱۶۸۴ء میں لندن کے بازار اور چوراہے بھی رات کو روشن ہونے لگے۔ سترھویں صدی کے آخر تک یورپ کے ۵۰ بڑے شہروں میں لیمپ لگ چکے تھے۔ رفتہ رفتہ رات کو باہر نکلنا فیشن بن گیا۔ لوگ ان مردوزن کا مذاق اُڑانے لگے جو رات کو بستر پر لیٹے وقت ضائع کر دیتے۔

پروفیسر راجر بتاتا ہے "اٹھارہویں صدی میں لوگوں کو وقت کی اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ پھر کام کو موثر انداز میں انجام دینے پر بھی زور دینے لگے۔ بعدازاں ۱۹ویں صدی میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا، تو درج بالا روتوں نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تبھی پہلی اور دوسری نیند کے خلاف احتجاج بھی شروع ہوا۔"

مثال کے طور پر ۱۸۲۹ء کے ایک طبی رسالے میں والدین کے لیے یہ ہدایت لکھی ملتی ہے "بچوں کے لیے پہلی اور دوسری نیند مفید نہیں، چنانچہ ماں باپ کو چاہیے کہ وہ انھیں ایسی نیند سے زبردستی دور رکھیں۔"

نیند سے متعلق مسائل

یوں ڈاکٹروں کی ہدایت اور والدین کی زبردستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسل میں ۸ گھنٹے کی نیند عام ہوگئی۔ آج دنیا بھر میں یہی نیند چلن بن چکی، مگر اس سے قباحتیں بھی وابستہ ہیں۔ ۲ ادواری نیند کو فطری سمجھنے والے ماہرین طب کا کہنا ہے کہ انسان جب ۸ گھنٹے مسلسل سونے لگا، تو نیند سے متعلق کئی بیماریوں نے جنم لیا۔ ایک وجہ مصنوعی روشنی کا ہر جگہ موجود ہونا بھی ہے۔

مثال کے طور پر آج سونے سے وابستہ ایک طبی خلل "نیند استقرار بے خوابی" (Sleep maintenance insomnia) عام ہے۔ اس خلل میں مبتلا خواتین و حضرات جب رات کو ایک بار جاگ جائیں، تو پھر دوبارہ سونے میں بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ یہ طبی خلل پہلی بار ۱۹ویں صدی کے آخر میں افسانوں و ناولوں میں نمودار ہوا اور اسی وقت ۲ ادواری نیند کا خاتمہ ہو رہا تھا۔

گریگ جیکبس امریکا کا ماہر نفسیات ہے۔ وہ کہتا ہے "زمانہ ارتقا کا بیشتر عرصہ انسان مخصوص انداز میں سویا ہے۔ چنانچہ رات کو جاگنا عام انسانی نفسیات و عضویات کا حصہ ہے۔ لہٰذا یہ سوچ تباہ کن ہے کہ ہمیں ہر حال میں رات کو سونا چاہیے۔ اگر کوئی نہ سو سکے، تو عموماً پریشانی اسے چمٹ جاتی ہے۔ یہ پریشانی خود نیند کی قاتل ہے۔ بلکہ بعدازاں انسان کی زندگی میں داخل ہو کر اُسے مسلسل تشویش میں مبتلا رکھتی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں عضویاتی سائنس کا پروفیسر

> "روایتی ڈاکٹروں کی اکثریت اب بھی یہی سمجھتی ہے کہ ہر رات ۸ گھنٹے کی مسلسل نیند لینا لازم ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج ۳۰ فیصد بیماریاں بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے غیر فطری طریق نیند سے تعلق رکھتی ہیں"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

نیند کے ۴ مراحلے

ہم سوتے ہوئے ہر ۹۰ تا ۱۰۰ منٹ کے دوران نیند کے ۴ مرحلوں سے گزرتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں انسان جاگنے اور سونے کے درمیان حالت غنودگی میں رہتا ہے۔ تب وہ ہولے ہولے سانس لیتا ہے۔ عضلات پُرسکون ہو جاتے اور دل دھڑکنے کی رفتار بھی سست پڑ جاتی ہے۔

دوسرے مرحلے میں نیند ذرا گہری ہوتی ہے تاہم آپ جاگنے کی کیفیت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ سوئے ہوتے ہیں لیکن آپ کو اس کا احساس نہیں ہو پاتا۔

تیسرے اور چوتھے مرحلے میں انسان گہری نیند میں چلا جاتا ہے۔ ان مراحل کے دوران مشکل ہی سے آنکھ کھلتی ہے کیونکہ انسانی جسم کے تمام نظام سست پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ تب ہمارے بدن میں سب سے کم سرگرمی جنم لیتی ہے۔

گہری نیند کے بعد ہم چند منٹ دوسرے مرحلے میں گزارتے اور پھر ''تنویمی نیند'' (Dream Sleep) میں داخل ہو جاتے ہیں۔ طبی اصطلاح میں یہ نیند ''دوران نیند خواب بینی'' (Rapid Eye Movement) کہلاتی ہے۔ اسی مرحلے سے گزرتے ہوئے ہم خواب دیکھتے ہیں۔ اگر ایک انسان مسلسل سات آٹھ گھنٹے سوتا رہے، تو پہلے وہ نیند کے تمام ۴ مراحل سے گزرتا ہے۔ پھر دوسرے تیسرے مرحلے سے گزرتا ہوا تنویمی نیند میں داخل ہو جاتا ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

''رات کو بعض لوگوں کی آنکھ کھل جائے تو وہ گھبرا جاتے ہیں رات کو بیدار رہنا انسانی جسم کے لیے معمول کی بات ہے''

رسل فوسٹر بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''بعض لوگوں کی آنکھ رات کو کھل جائے، تو وہ گھبرا جاتے ہیں۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، راتوں کو بیدار ہونا انسانی جسم کے لیے معمول کی بات ہے۔''

گریگ سمجھتا ہے کہ فطرت نے انسان کو یہ سکھایا کہ وہ رات کے وقت اُٹھ کر سیر و تفریح کرے تاکہ ذہنی تناؤ (Stress) سے بچ سکے۔ یوں ماضی کے انسان فطری طور پر تناؤ کا مقابلہ کر لیتے۔ یہی وہ وقت تھا جب بہت سے لوگ عبادت اور سوچ بچار بھی کرتے۔

لیکن آج انسانوں کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ رات کو اُٹھ کر اپنا ذہنی یا جسمانی تناؤ دور کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں کروڑوں لوگ ڈیپریشن، تناؤ، پریشانی، نفسیاتی امراض اور منشیات کا شکار ہیں۔

چنانچہ اب بھی آپ رات کو جاگ جائیں تو پریشان مت ہوں، بلکہ سوچیے کہ آپ کے اجداد تو راتوں کو اُٹھ کر سیر و تفریح کرتے تھے۔ لہٰذا رات کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ جاگنا آپ کی صحت کے لیے مفید ہے۔ ■

اوئے...! توہن آیا ایں!

وصی شاہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

"اوئے تو آندا ایں......"

"شہزاد صاحب! میں بس اسی ہفتے حاضر ہونے کی کوشش کروں گا......"

یہ ہے وہ مکالمہ جو ہر ملاقات پر میرے اور شہزاد صاحب کے درمیان ہوا کرتا اور میں ہمیشہ کی طرح پھر کاروبارِ دنیا میں مصروف ہوجاتا اور شہزاد صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہو پاتا۔ یوں مہینا پندرہ دن گزر جاتے اور کسی مشاعرے، کسی ٹی وی پروگرام، کسی مذاکرے یا شہر میں کسی دعوت یا کسی تقریب میں میری ملاقات پھر شہزاد صاحب سے ہوتی اور مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ملاتے ہوئے وہ ہمیشہ اپنا یہی جملہ دہراتے "اوئے تو آندا ایں" میں جواباً وہی عزم دہراتا "بس شہزاد صاحب! اسی ہفتے حاضر ہونے کی کوشش کروں گا" اور شہزاد صاحب جواب میں انتہائی شفیق انداز میں مسکرا دیتے۔

پچھلے کئی برسوں سے یہ ۲ جملے میرے اور شہزاد صاحب کے درمیان "کوڈ نیوٹی" سی بن گئے تھے۔ حالانکہ اس دوران میں مجھے کئی مرتبہ اپنے پروگرام میں انھیں دعوت دینے کے لیے یا کبھی کسی کلاسیکی لفظ، اس کے کلاسیکی برتاؤ، استعمال اور وزن کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون کرنا پڑتا تو شہزاد صاحب کے پاس ہمیشہ میرے لیے وقت ہوتا...... بہت وقت...... وہ بڑی وضاحت سے جو میں پوچھتا، اس کے بارے میں آگاہ کرتے...... میں نے انھیں بیسیوں مرتبہ کچھ جاننے اور پوچھنے کی غرض سے فون کیا ہوگا اور انھوں نے ہمیشہ اپنے مشفقانہ انداز میں میری راہنمائی فرمائی...... میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ کچھ بتانے کے عمل کے دوران شہزاد صاحب کو کبھی کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔

شہزاد صاحب اپنے ہم عصر شعراء سے تھوڑا سا مختلف تھے۔ انتہائی باعلم، باصلاحیت اور محنتی ہونے کے باوجود وہ روپے پیسے، افسری، طاقت اور شہرت کی کوئی خاص خواہش نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ان چاروں چیزوں کے لیے کبھی کوئی خاص تگ و دو نہیں کی۔ کم از کم میں نے اپنے ۱۷، ۱۸ سالہ تعلق میں یہ بات کبھی محسوس نہیں کی...... وہ کئی شعراء اور ادیبوں کے برعکس عوامی مزاج کے مطابق نہیں بلکہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق ادبی و علمی کام کیا کرتے تھے۔ یہی رویہ ان کا مشاعروں کے حوالے سے بھی تھا، کوئی انھیں مدعو کرتا تو وہ ضرور جاتے مگر میں نے کبھی شہزاد صاحب کو مشاعروں میں شرکت کی خاطر کسی قسم کی لابنگ یا کوشش کرتے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر وقت شاعری کے ساتھ ساتھ نفسیات، فلسفہ اور سائنس جیسے سنجیدہ موضوعات پر کتابوں کے تراجم کرتے یا ان موضوعات پر کچھ لکھتے پڑھتے گزرتا۔ ان کے آخری دنوں کے کام میں خصوصاً شاعری میں فلسفہ، نفسیات اور سائنس کے مضامین کی آمیزش واضح محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان مضامین کی آمیزش سے ان کی شاعری میں ایک نئی جہت ضرور آئی مگر ابتدائی دنوں کی شاعری میں جو چاشنی تھی اس میں کچھ کمی بھی واقع ہوئی۔ لیکن انھیں اس کی چنداں پروا نہیں تھی۔ وہ داد و تحسین سے بے پروا، اپنے مزاج کے مطابق تخلیقی کام کرکے لطف حاصل کرنے والی شخصیت تھے۔

میں نے ایک مرتبہ شہزاد صاحب سے پوچھا "آپ نے ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور پی ٹی وی کے

سکرپٹ سیکشن کے انچارج بھی رہ چکے ہیں، اب ٹی وی کے لیے ڈراما کیوں نہیں لکھتے، جب کہ اب اس شعبے میں معاوضہ بھی پہلے سے کہیں بہتر ہے۔"

مجھے شہزاد صاحب کا فوری آنے والا جواب حرف بہ حرف یاد ہے۔ شہزاد صاحب نے پنجابی میں مجھ سے کہا "ڈرامے تو اور بھی بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں لیکن جن علمی، نفسیاتی، سائنسی اور سنجیدہ موضوعات پر میں کام کر رہا ہوں یہ کون کرے گا...... مجھے یہی کرنے دو۔"

میں نہیں جانتا کہ میری ان سے ۱۷، ۱۸ سالہ رفاقت میں یہ بے تکلفی کب پیدا ہوئی مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ چاہے امجد اسلام امجد ہوں، عطاء الحق قاسمی، خالد احمد، احمد عقیل روبی یا شہزاد صاحب ان سب سینیئرز میں ایک بات مشترک رہی ہے کہ یہ غیر محسوس طور پر اپنے جونیئرز کے دوست بن جایا کرتے ہیں۔ شہزاد صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ نہیں خبر یہ کب ہوا مگر ان سے بالکل قریبی اور بے تکلف دوستوں والا تعلق پیدا ہو گیا تھا، اور یقیناً اس میں شہزاد صاحب کی محبت اور شفقت کا دخل تھا کہ میں ان کا احترام بھی کرتا تھا مگر بے تکلفی سے ان سے ہر قسم کی گفتگو کا بھی حوصلہ پاتا تھا اور وہ تمام لطائف جو قریبی دوستوں میں سنے اور سنائے جاتے ہیں وہ شہزاد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا کرتا۔ جواباً شہزاد صاحب کی زنبیل میں بھی جو ہوتا وہ شیئر کرتے۔ آج جب شہزاد صاحب کی قربت میں گزاری گئی محفلوں کا خیال آ رہا ہے تو فوری طور پر دو تین چیزیں یاد آتی ہیں۔ علم، شگفتہ گفتگو، لطائف سے بھرپور قہقہوں بھری محفل۔ شہزاد صاحب کے ساتھ گزاری سینکڑوں محفلوں میں سے کوئی بھی محفل ایسی یاد نہیں جس میں عطاء الحق قاسمی، شہزاد احمد، خالد احمد اور دیگر شعراء بھی ہوں اور محفل بوجھل پن کا شکار ہو گئی ہو۔ میں ہمیشہ ان لوگوں کی محفل اور قربت سے خوب ہنس کر، خوش ہو کر اور کچھ سیکھ کر ہی اٹھا ہوں گا۔

شہزاد صاحب کو محفل کو سحر میں مبتلا کر دینے والی گفتگو کا بھی ملکہ حاصل تھا۔ میرے ٹی وی پروگرام "رات گئے" میں جن پروگرامز کی بہت ہائی ریٹنگ آئیں، ان میں شہزاد صاحب کے ساتھ کیے گئے تینوں پروگرام شامل تھے۔ شہزاد صاحب کی شاعری، نفسیات، فلسفہ، سائنس اور ڈاکٹر عبدالسلام پر ان کے کیے گئے کام کو سمجھنے اور اس کی حقیقت پہچاننے کے لیے بہت وقت اور محنت درکار ہو گی، کہ شہزاد صاحب کی شاعری اور ان کا دیگر علمی و ادبی کام ان تخلیقی اثاثوں میں سے ہے، کہ ہر آنے والے دن جس کے نئے معانی دریافت ہوا کرتے ہیں اور پڑھنے والوں پر نیا جہان وا کرتے اور انھیں حیران کر دیتے ہیں۔

> ڈرامے تو اور بھی بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں لیکن جن علمی، نفسیاتی، سائنسی اور سنجیدہ موضوعات پر میں کام کر رہا ہوں یہ کون کرے گا مجھے یہی کرنے دو

بے حس و حرکت سفید چادر میں لپٹے ہوئے شہزاد صاحب کے سرہانے کھڑے چند لمحوں میں ۱۷، ۱۸ برسوں کی رفاقت میں سے کیا کچھ نہ یاد آ گیا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی کی آواز آئی "آگے چلتے جائیے......" میں آگے بڑھنے لگا تو جیسے شہزاد صاحب کی ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی مشفقانہ آواز نے میرا دامن تھام لیا ہو......

یوں لگا جیسے شہزاد صاحب کہہ رہے ہوں "اوئے تو ہُن آیا ایں...... ہُن رکیہ فائدہ......"

میری آنکھوں میں اس شفیق، لڑکوں جیسے زندہ دل بزرگ اور اس کی باتوں کو یاد کر کے آنسو آ گئے۔ شہزاد صاحب کے ساتھ ہی میری ان کی "کوٹی نیوٹی" بھی ختم ہو گئی، میں اس بار یہ بھی نہ کہہ سکا...... "بس شہزاد صاحب اسی ہفتے حاضر ہونے کی کوشش کروں گا......!!!" ■

PAKISTANVIRTUALLIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پنسل کی کہانی

ایک لڑکا اپنی دادی اماں کی طرف دیکھ رہا تھا جو ایک خط لکھ رہی تھیں۔ لڑکے نے کچھ دیر بعد دادی سے کہا:

کیا آپ میرے متعلق کوئی کہانی لکھ رہی ہیں؟'' دادی نے خط لکھنا چھوڑ دیا اور پوتے سے کہنے لگیں:

''میں تمھارے بارے میں لکھ رہی ہوں لیکن جو پنسل میں استعمال کر رہی ہوں وہ ان لفظوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو اس پنسل کی طرح ہو گے۔'' لڑکا حیرانی سے اس پنسل کی طرف دیکھنے لگا۔

لڑکے نے کہا ''یہ تو ایک عام سی پنسل دکھائی دیتی ہے۔'' دادی کہنے لگیں ''عام سی پنسل میں بھی ۵ ایسی خوبیاں ہیں جب تم انھیں اپنا لو گے تو اچھے انسان بن جاؤ گے۔

1 پہلی خوبی یہ ہے کہ تم بہت بڑے بڑے کام کر سکتے ہو لیکن یہ خیال رہے کہ ایک ہاتھ تمھیں کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح خالق کی راہنمائی کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

2 دوسری خوبی یہ کہ کچھ عرصہ بعد مجھے رُک کر اسے تیز کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد پنسل زیادہ بہتر لکھنے لگتی ہے۔ اسی طرح تمھیں یہ سیکھنا ہوگا کہ زندگی میں دکھ اور تکالیف آتی ہیں لیکن یہی دُکھ اور تکالیف ہمیں بہتر انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔

3 تیسری خوبی یہ کہ اگر لکھتے ہوئے کوئی غلطی ہو جائے تو پنسل سے لکھے کو مٹایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ ہمیں سیدھے راستے پر رکھتی ہے۔

4 چوتھی خوبی یہ کہ اس کی بیرونی سطح اہم نہیں بلکہ اس کے اندر موجود گریفائٹ زیادہ اہم ہے۔ اس لیے اپنے اندرونی وجود پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

5 پانچویں خوبی یہ کہ پنسل ہمیشہ اپنا نشان چھوڑتی ہے۔ تم بھی یہ یاد رکھو جو کچھ بھی تم زندگی میں کرو گے یہ اپنا نشان چھوڑ جائے گا۔ اس لیے اپنے ہر عمل میں اس حقیقت کو سامنے رکھو۔

۲۶۴

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مستقل سلسلہ

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضر ہے

صفیرہ بانو شیریں

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

کالے بال

میرے بالوں کا رنگ بدل رہا ہے۔ میرے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ ہیئر کلر سے الرجی ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں میری ملازمہ نے کالا پتھر پیس کر بالوں میں لگایا۔ بالوں کا رنگ بہت اچھا آیا۔ میں نے بھی لگا لیا۔ ایسی الرجی ہوئی کہ مجھے ایمرجنسی میں جانا پڑا۔ کوئی ایسا ٹوٹکا بتائیں جس سے بال کالے ہو جائیں اور الرجی نہ ہو۔ (ف۔ ہاشمی)

بی بی! ہر ٹوٹکا کارآمد ثابت نہیں ہوتا اور یہ کالا پتھر بھی الرجی کر دیتا ہے۔ آپ خضاب کے بجائے وسمہ اور مہندی کے پتے پیس کر لگائیں۔ وسمہ کے پتے زیادہ ہونے چاہئیں۔ یا مٹھی بھر آملے ثابت رات کو لوہے کی کڑاہی میں بھگو دیں۔ صبح اس پانی کو چھان کر ایک ٹکڑا دنداسہ کا ملائیں۔ اس میں ایک بڑا چمچہ چائے کی پتی ڈال کر پانی پکا لیں۔ دوبارہ چھان کر مہندی ملائیں۔ ڈیڑھ چمچہ سرسوں کا تیل ملا کر سر میں مہندی لگانے سے اچھا رنگ آتا ہے۔ ہندوستان میں بال کالے کرنے والا تیل ملتا ہے مگر اس میں یہ بات ہے کہ بستر اور تکیہ بھی کالا ہو جاتا ہے۔ یہ تیل روزانہ لگانا پڑتا ہے۔ بال سیاہ رہتے ہیں۔ جہاں لگانا چھوڑا بال دوبارہ سفید نظر آتے ہیں۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمدﷺ مہندی کو پسند فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے ”مہندی کا خضاب لگاؤ کہ یہ جوانی کو بڑھاتی ہے۔ حسن میں اضافہ کرتی اور طاقت کو بڑھاتی ہے۔“ پیارے رسولؐ خود بھی مہندی لگاتے تھے۔ زخم اور کانٹا چبھنے پر مہندی لگائی جاتی تھی۔ آملہ اور ہرڑ کا مربہ استعمال کرنے سے بال جلدی سفید نہیں ہوتے۔ سفید اور گرے بال اچھے لگتے ہیں، آپ مہندی لگائیں۔ کالے بالوں کا خیال چھوڑ دیجیے۔ ایسے سیاہ بالوں کا کیا فائدہ جو آپ کو ایمرجنسی میں پہنچا دیں۔

قرآن پاک

میرے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بیوہ اور ۳ بچے ہیں۔ ان کے سسرال والے کہتے ہیں مسجد سے بچوں کو بلوا کر قرآن پاک ختم کراؤ۔ حالانکہ میں اور بھابھی روز قرآن پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتے ہیں۔ کیا مولوی صاحب کے بغیر ایصالِ ثواب نہیں ہو سکتا؟ بتائیے۔ (ماہ جبیں)

ہمارے ہاں مسجد سے بچوں کو بلوا کر قرآن خوانی کرانا رواج بن چکا ہے۔ بعض بچے باقاعدہ وضو بھی نہیں کرتے۔ صفحات پلٹ دیتے ہیں۔ ان کو کھانے پینے کا لالچ ہوتا ہے۔ آپ لوگ خود پڑھ رہے ہیں یہ اچھی بات ہے۔ جو کچھ بھی پڑھ سکیں ضرور پڑھیے۔ اس میں ثواب ہے۔ لہٰذا آپ خود قرآن پڑھیں، بچوں کو ساتھ بٹھائیں۔ آپ کے بھائی کو ضرور یہ تحفہ پہنچے گا اور آپ کو بھی قلبی سکون حاصل ہوگا ان شاء اللہ۔

گرمی دانے

میرے جسم پر گرمی دانے نکلے۔ خارش ہوتی تھی۔ ہاتھوں پر کھجایا تو چھل کر زخم بن گئے۔ اسی طرح ہمارے پاس کے گاؤں میں بھی اکثر لوگوں کے گرمی دانے زخموں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ علاج نہیں کرا سکتے۔ کوئی آسان سی دوا بتائیں تاکہ آرام آجائے۔ (باغ حسین)

سب سے آسان ٹوٹکا یہ ہے کہ آپ نیم کے پتے توڑ کر سائے میں سکھا کر پاؤڈر بنا کر رکھ لیں اور تازہ پتے مع ٹہنی کے ۲ ؍کلو پانی میں خوب پکا کر چھان کر رکھ لیں۔ اس پانی سے دن میں ۲ ؍بار زخم دھوئیں۔ خشک ہونے پر نیم کا پاؤڈر چھڑک دیں۔ برسات کے موسم میں نمکولیاں پک جاتی ہیں۔ آپ چار پانچ نمکولیاں روزانہ بچوں کو، بڑوں کو کھلا دیں تو پھوڑے پھنسیاں نہیں نکلیں گے۔ نیم دافع عفونت ہے اور اس کی نمکولی پک کر میٹھی ہو جاتی ہے۔ ڈیڑھ دو ہفتہ نمکولی روزانہ کھانے سے جسم کی حدت ٹھیک رہتی ہے۔ دانے نہیں نکلتے۔ نیم کے پانچ پتے چھوٹے اور ۲ ؍عدد کالی مرچیں لے کر، انھیں پیس کر گولی بنا کر صبح کھالیں۔ اس سے فائدہ ہوگا۔

پنساری کے ہاں نرکچور مل جاتا ہے۔ اسے پیس لیں۔ ایک چھوٹا چمچ مکھن میں تین چٹکی پسا ہوا نرکچور ملا کر زخموں پر لگائیں۔ مگر پہلے زخموں کو نیم کے پانی سے دھو کر صاف کر لیں۔ شہر میں رہنے والے ایک حصہ سفوف پانچ حصے ویزلین میں ملا سکتے ہیں۔ یہ دوا صبح شام زخموں پر لگائیں۔ نیم کو گھر کا حکیم بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں۔ اس درخت کے سائے میں بیٹھنا اور لیٹنا بھی فائدہ مند ہے۔ پہلے زمانے میں نیم کی ٹہنیاں گھر میں لٹکائی جاتی تھیں تاکہ ہوا صاف رہے۔ بخار کے مریضوں کے بستر پر نیم کے پتے بچھا دیے جاتے۔ آج بھی ہندوستان میں جوگی یوگی اپنے تھیلے میں نیم کی ٹہنیاں ضرور رکھتے ہیں۔ چلتے پھرتے مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔ نیم کا تیل، نیم کا مرہم، نیم کا عرق، نیم کی گولیاں، نیم کی مسواک، نیم کا منجن بنتا ہے اور اس کا صابن بھی پھوڑے پھنسی کے لیے مفید ہے۔ نیم صابن، نیم ٹوتھ پیسٹ باہر کے ممالک میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ نیم کا پاؤڈر گھر میں ضرور رکھیں۔ دانے، کیل، مہاسے، پھوڑے، پھنسی زخموں پر لگائیں۔ حیرت انگیز طور پر فائدہ ہوگا۔ اب تو نیم کی چائے بھی ملنے لگی ہے۔ جسے لوگ کڑوا ہونے کے باوجود شوق سے پیتے ہیں۔

منہ کی بدبو اور ہونٹ

میرے منہ میں بدبو رہتی اور قبض کی شکایت ہے، جس سے میں سخت پریشان ہوں۔ غرارے کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرے ہونٹ پھٹ جاتے اور خشک رہتے ہیں۔ دوائیاں استعمال کرنے سے اب میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ کوئی گھریلو ٹوٹکا بتائیں۔ (شبانہ ارم)

آپ قبض کا علاج کریں۔ پانی زیادہ پیا کریں۔ انجیر کھانے سے قبض دور ہوتا ہے۔ کچھ لوگ پانچ انجیر ایک بڑے گلاس دودھ میں ابال کر رات کو پیتے ہیں۔ انجیر کھاتے ہیں۔ قبض دور ہو جاتا ہے۔ ناشتے میں پیٹ بھر کر امرود کھائیں۔ منہ کی بدبو بھی ختم ہوگی اور بھوک بھی لگے گی۔ آپ ایک بوتل خالص عرق گلاب لیں۔ ایک چمچ عرق ایک گلاس پانی میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ڈال کر صبح شام غرارے کریں۔ رات کو سوتے وقت تھوڑے سے تیل میں روئی کا پھایا ڈبو کر ناف میں رکھیں۔ صبح نکال دیں۔ چند روز ایسا کرنے سے ہونٹ ملائم ہو جائیں گے۔

۴ چمچے گلاب کا عرق لیں۔ اس میں ایک چمچہ شہد ملائیں۔ چند قطرے زیتون کا تیل ملا کر فریج میں رکھ لیں۔ دن میں جب موقع ملے ہونٹوں پر لگائیں۔ ہونٹ نرم ملائم رہیں گے۔ سیب کے بیج پیس کر عرق گلاب میں ملا کر لگانے سے پھٹے ہونٹ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ کہیں جانا ہو تو سونف اور ایک چھوٹی الائچی منہ میں ڈال لیں اور آہستہ آہستہ چبائیں۔ بدبو میں فرق پڑ جائے گا۔

اعصاب جواب دے رہے ہیں

چند ہفتوں سے میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔ بچوں پر غصہ اُتارتی ہوں۔ چڑچڑی ہو گئی ہوں۔ دوا کھاتی ہوں تو گرمی لگتی ہے۔ گرم چیز کھا نہیں سکتی۔ اعصاب پر بوجھ پڑ رہا ہے اور میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے ہیں۔ مجھے بتائیں کیا کروں؟ (کرن خالد، لاہور)

کام کاج کی زیادتی سے ذہنی دباؤ کا مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ ۲ امرود لیں۔ ان پر نمک، کالی مرچ، ایک لیموں کا رس نچوڑ لیں۔ اس میں آدھا سیب کاٹ کر ملائیں۔ تھوڑا سا ہرا دھنیا ڈالیں اور ایک کینو، ایک مالٹا بھی کاٹ لیں۔ ان سب کو ملائیں اوپر سے نیازبو کے ۱۰ پتے دھو کر ڈال دیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تقریباً ۴ بجے آپ یہ سلاد کھا لیں۔ آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ آئے گا اور طبیعت بحال ہو گی۔ دس پندرہ دن یہ سلاد کھائیں تو اعصاب مضبوط ہو جائیں گے۔ نیازبو کی چٹنی بھی فائدہ دے گی۔ ۵ پتے نیازبو کے، ۲ لہسن کے دانے، ۳ کالی مرچ، ایک ہری مرچ، معمولی سا نمک لے کر مٹی کی کونڈی میں ڈنڈے سے رگڑ لیں۔ کھانے کے ساتھ یہ چٹنی استعمال کریں۔ دل کے مرض سے محفوظ رہیں گی۔ چڑچڑاپن دور ہو جائے گا۔ روزانہ صبح نیازبو کے ۳ چھوٹے پتے کھانے سے دن بھر تازہ دم رہیں گی، تھکن نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے گوناگوں فوائد پودوں میں رکھے ہیں۔ آپ بھی آزمائیے۔

مثانے کی تکلیف

میری عمر ۶۰ سال ہے۔ پچھلے دنوں معاینہ سے پتا چلا کہ مجھے پراسٹیٹ کا مسئلہ ہے۔ ابھی شروعات ہے۔ آپ کا رسالہ میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ کہیں کدو کے بیج کا پڑھا تھا۔ آپ نے کسی کو مشورہ دیا تھا۔ مجھے بھی بتائیں۔ (جواد قریشی)

واقعی پراسٹیٹ میں کدو کے بیج مفید ہیں۔ مٹھی بھر چھلے بیج روزانہ غذا میں شامل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان میں بے پناہ فوائد رکھے ہیں۔ اس عمر میں عموماً مرد حضرات کو یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کیلشیم کی کمی سے ہڈیاں بھی بھربھری ہونے لگتی ہیں۔ بہرحال آپ کدو کے بیج کھائیں۔ اس سے عام جسمانی نظام درست ہو گا اور پراسٹیٹ میں بھی فائدہ ہو گا۔ تکلیف میں کمی آئے گی۔ اس کے کھانے سے خون میں کولیسٹرول کی سطح میں کمی آتی اور درد میں بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ باہر کے ممالک میں یہ بیج سادہ بھی ملتے ہیں اور تلے ہوئے ہلکے نمکین بھی۔ لوگ انھیں شوق سے کھاتے ہیں۔

اِس کالم کے خطوط کا مسئلہ

آپ لوگ خط لکھ کر سمن آباد نہ بھجوایا کریں۔ اپنی ڈاک الگ کاغذ پر، مکمل نام، پتا اور فون نمبر کے ساتھ 325/G-III جوہر ٹاؤن پر بھیجا کریں۔ جواب چاہتے ہیں تو ٹکٹ لگا ہوا لفافہ مکمل پتا کے ساتھ ہمراہ بھجوائیے۔ ان شاء اللہ آپ کو جواب مل جائے گا۔

زندگی کی سب سے قیمتی متاع اچھی کتاب سے زیادہ کچھ اور نہیں

آیئے......! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریئے

مُطالعے کی میز پر

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا
اس میں کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں کا تذکرہ رہے گا

نوید اسلام صدیقی

ایک اچھی اور بڑی کتاب سے زیادہ سستی چیز کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اچھی اور بڑی کتاب ۲۰۰ روپے کی کیا ۲ ہزار، ۲ لاکھ یا ۲ کروڑ روپے کی ہو تو بھی سستی ہے کیونکہ وہ مٹی کو سونا، حیوان کو انسان اور قبیح کو جمیل بنا سکتی ہے۔

معاشرے میں مطالعے کا قحط

قحط پڑتا ہے تو لاکھوں لوگ بھوک سے مر جاتے ہیں اور قحط کی خبر ہر اعتبار سے عالمگیر ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قحط ایک انتہائی غیر معمولی صورتِ حال ہے اور بھوک سے لاکھوں افراد کا ہلاک ہو جانا دل دہلانے والا واقعہ ہے لیکن پوری دنیا بالخصوص پاکستان میں مطالعے کا قحط پڑ گیا ہے اور اس سے ہر سال لاکھوں افراد روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی موت کا شکار ہو رہے ہیں لیکن کسی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کی وجہ ہے۔ لوگ جسمانی غذا، اس کی قلت اور اس قلت کے مضمرات کو سمجھتے ہیں، مگر وہ اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام ہیں کہ انسان کو جس طرح جسمانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی غذا بھی درکار ہوتی ہے، اور مطالعہ اس غذا کی فراہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ معاشرے میں جن لوگوں کو حقیقتِ احوال کا تھوڑا بہت اندازہ ہے اُنھوں نے مطالعے سے گریز اور اس کو نظر انداز کرنے کے سلسلے میں طرح طرح کے عذر تراش لیے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عذر یہ ہے کہ کتابیں، رسالے اور اخبارات مہنگے ہو گئے ہیں اور یہ بات ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس کو آپ کیا کہیں گے کہ ۵ ہزار کا جوتا سستا ہے اور ۲۰۰ روپے کی کتاب مہنگی ہے۔

پاکستان کی آبادی ۱۸ کروڑ ہے اور ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات و رسائل کی مجموعی اشاعت بیس پچیس لاکھ سے زائد نہیں۔ اخبار کا مطالعہ، مطالعے کی سیڑھی کا پہلا پائیدان ہے، لیکن اس پائیدان کی حالت بھی خستہ ہے۔

مطالعے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان کو مرتب اور منظم انداز میں سوچنا اور اظہار کرنا سکھاتا اور انسان کی کند ذہنی اور گونگا پن دور کرتا ہے۔ مطالعہ کند ذہن شخص کو اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت عطا کر دیتا ہے، اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت کے حامل شخص کو ذہین اور مطالعہ ذہین شخص کو عبقری یا Genius بنا دیتا ہے۔ مطالعہ خود آگہی اور ماحول شناسی کا ذریعہ ہے اور ان دونوں چیزوں کے بغیر انسان اپنی زندگی کی معنویت کا تعین نہیں کر سکتا۔

(شاہنواز فاروقی کے مضمون "معاشرے میں مطالعے کا قحط" سے)

''سفر نامۂ ترکی''

''ڈاکٹر فرید احمد پراچہ کی یہ نئی تصنیف معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ پوری کتاب پہلے سے آخری صفحہ تک پڑھ کر ترکی کا ماضی، حال اور مستقبل سامنے آجاتا ہے۔ دوست ملک کی تاریخ کے روشن اور غمناک باب انسان کے سامنے وا ہوجاتے ہیں۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ ترکی کا جغرافیہ بھی آسانی سے دماغ میں بیٹھ جاتا ہے۔ ہم یہاں آپ کی دلچسپی کے لیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے کچھ اقتباسات دے رہے ہیں۔

ترکی ہمیشہ سے ہی میرے خوابوں کی سرزمین رہی ہے۔ خلافت عثمانیہ کا ذکر ہو یا مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا تذکرہ اور تحریک خلافت کی بات، ترکی ہمیشہ دلوں کی دنیا کو آباد کرتا رہا ہے۔ ہم نے تو اپنے بچپن میں ترکی ٹوپی کی بہار دیکھی ہے کہ آپ کو تقریبات اور کوچہ و بازار میں شرفا کی ایک بڑی تعداد ترکی ٹوپی بردار نظر آتی تھی۔ پھر یہ محدود ہوتے ہوتے صرف نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کی شخصیت کا جزو لاینفک بن گئی۔ حرمین شریفین میں جب بھی کوئی ترک ملتا، پاکستان کے نام پر اس کا چہرہ کھل اٹھتا اس کے بازو وا ہوجاتے۔ اس کے لہجے میں محبت و اپنائیت کا رس گھل جاتا۔ ترکی پاکستانی بھائی بھائی پاک ترک کردیش کہتے ہوئے وہ اپنے سینے سے چمٹا لیتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے صدیوں کے بچھڑے آپس میں مل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آدھی دنیا دیکھنے، عرب و عجم، شرق و غرب کی سیاحت کرنے کے باوجود ترکی دیکھنے کا شوق ایک حسرت بن چکا تھا۔''

استنبول کی پہلی جھلک

''اللہ نے خود ہی سبیل پیدا کردی۔ میرا سفر پچیس مئی کی سہ پہر لاہور سے شروع ہوا۔ کراچی سے ترکش ایئر لائنز کی پرواز رات ساڑھے بارہ روانہ ہوئی۔ ۲۶ مئی کی صبح استنبول کے ہوائی اڈے پر اترے تو خنک ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ ترکی میں ہوائی اڈے جدید سہولتوں سے مزین ہیں۔ صرف استنبول شہر میں کچھ عرصہ بعد ہوائی اڈوں کی تعداد ۳ ہوجائے گی۔ طیب اردگان سے پہلے پورے ترکی میں کل ۲۶ ہوائی اڈے تھے جن میں سے ۱۲ بند تھے۔ اب ہوائی اڈوں کی تعداد ۴۸ ہے اور ان میں سے اکثر جدید ترین ہیں۔ ہم طویل اور متحرک راستوں سے گزرتے ہوئے، ویزا سیکشن سے ہوتے ہوئے ہوائی اڈے سے باہر آئے۔

ہوٹل جانے کے لیے ایک گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی جب باہر مین روڈ پر آئی تو ہم نے دیکھا یہاں ٹریفک دائیں طرف چلتی ہے۔ صبح کا وقت تھا ہم رات بھر کے جاگے ہوئے بھی تھے، نیند ہماری پلکوں پر کھیل رہی تھی لیکن استنبول کا پہلا نظارہ ہی اتنا جانفزا، روح افزا، دلکش اور پرکشش تھا کہ ہماری تو نیند ہی اڑ گئی۔ استنبول عجیب شہر ہے شاید دنیا کا سب سے منفرد شہر کہ یہاں ایشیا اور یورپ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ یہاں دنیا کے سب سے خوبصورت قدرتی مناظر ہیں۔ ہماری گاڑی آبنائے باسفورس کے کنارے کنارے رواں دواں تھی۔ ایک

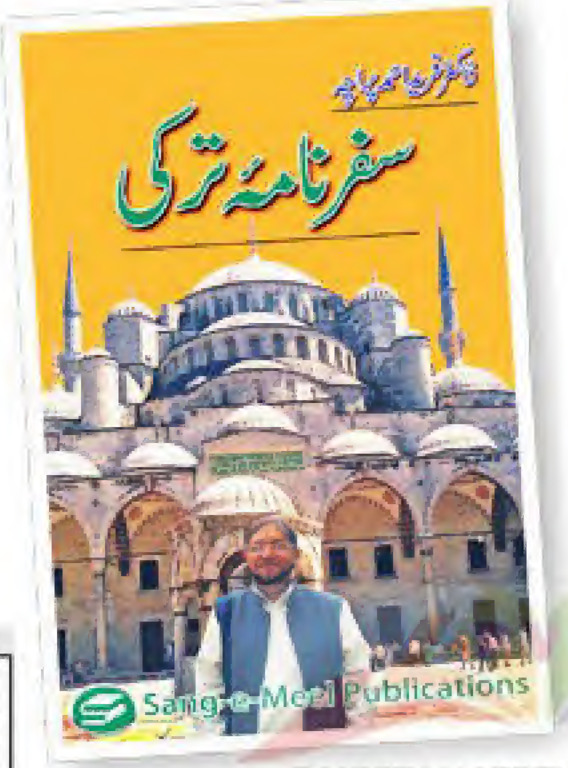

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

طرف آبنائے باسفورس میں کئی جہاز محوِ خرام تھے۔ چھوٹے بڑے، رنگ برنگے، سست و تیز رفتار۔ دوسری طرف مخصوص طرز کی مساجد کے گنبد و منار بلند ہو کر خدا کی کبریائی کا اعلان کر رہے تھے۔ دائیں طرف استنبول شہر کی عمارات قدامت و جدت کا حسین امتزاج پیش کر رہی تھیں۔ سرخ ڈھلوانی چھتوں کی روایتی عمارتیں بھی ہیں اور آسمانوں سے باتیں کرتے ہوئے کئی منزلہ کمرشل پلازے بھی، ایک ہی طرز اور ایک ہی رنگ کے فلیٹس بھی ہیں اور کھلے سرسبز لانوں والے خوبصورت ولاز بھی۔ سڑکیں کھلی، وسیع، دو رویہ، خوبصورت، مضبوط اور موٹر وے طرز کی ہیں۔ ہوٹل ہوائی اڈے سے اچھی خاصی دوری پر تھا۔ اس بہانے ہم پورا استنبول دیکھ چکے تھے۔ استنبول شہر پیچھے رہ چکا تھا، اب خوبصورت جھیلوں اور دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زاروں اور سرسبز و شاداب پہاڑی ڈھلوانوں کا راستہ شروع ہو گیا تھا۔ ڈرائیور اپنی دھن میں رواں دواں تھا۔ نہ وہ ہماری زبان سے واقف تھا نہ ہم اس کی زبان سے آشنا۔ آخر خدا خدا کر کے ہم ہوٹل پہنچے۔

اس ہوٹل کی چلمنوں سے دور تک پھیلے سبزہ زار پھر ان کے پیچھے بحرِ بے کنار یعنی بحرِ اسود کی لہروں کا جوش و خروش، پہاڑی ڈھلوانوں پر پھولوں کے تختے، تا حدِ نظر پھیلی ہوئی سبز و شاداب وسعتیں، ذرا دور سے نظر آتے ہوئے مساجد کے منار، بے روک ٹوک چلنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ اور نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں اڑتے ہوئے پنچھی اتنے خوبصورت لگنے لگے کہ دل یہ چاہتا تھا کہ ہم چلمن سے ہی لگے بیٹھے رہیں۔''

فصیل شہر کے اندر

''ایک گائیڈ کی رہنمائی میں فصیل شہر کے اندر جانے کا پروگرام بن گیا۔ ہماری گاڑی آبنائے باسفورس کے کناروں سے گزرتی ہوئی قدیم شہر میں داخل ہو رہی تھی، ہم نے دیکھا کہ فصیل شہر کے بڑے حصے باقی ہیں۔ کئی جگہ پر فصیل پر منجنیق سے برسائے گئے گولوں کے نشانات اور دراڑیں ہیں۔ یہ محل کے ارد گرد ۵ کلومیٹر لمبی فصیل تھی۔ پرانا شہر شروع ہوا تو چھوٹی اینٹوں کی عمارتیں بھی شروع ہو گئیں۔ ہماری گاڑی پارک ہوئی تو معلوم ہوا کہ پورا علاقہ ملکی و غیر ملکی سیاحوں سے بھرا ہوا ہے۔ ملکی سیاح زیادہ ہیں اور آج کا دن تو شاید اسکولوں کے بچوں کے لیے مختص ہے کہ رنگ برنگی یونیفارم میں پھول جیسے سرخ و سفید ترک بچے جوش و خروش سے سیاحتی دورے میں مصروف ہیں۔''

توپ کاپی محل

''استنبول کے توپ کاپی محل میں ہر کمرے سلاطین عثمانیہ کے تخت و تاج، ہیرے جواہرات، ہتھیاروں، ملنے والے تحائف، گھڑیوں، گھڑیالوں وغیرہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ شاہی لبادے ہیں کہ جن کی بافت ہی زربفت کی ہے جن میں سونے اور چاندی کے تار پروئے گئے ہیں جن پر ہیرے و جواہرات جڑے ہیں، شاہی لبادے تیار کرنے کی کھڈیاں بھی محل میں ہی لگائی گئی تھیں ان لبادوں کو شاہان وقت پہنتے تھے اور ان کا شاہی دبدبہ ایسے ہی لباس فاخرہ سے قائم ہوتا تھا۔ آج میں دیکھتا ہوں تو مجھے تو یہ لباس قطعاً متاثر نہیں کرتا۔ یہ لباس تو اچھے بھلے معقول انسان کو نامعقول بنا دیتے ہیں۔ باوقار فرد کو جوکر بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ ایسے زمانے میں کہ جب ایئر کنڈیشنر بھی نہیں تھے تو ایسے شاہی لبادے راحت سے زیادہ اذیت اور جزا سے زیادہ سزا معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے تو تاج شاہانہ بھی ایسے خول دکھائی دیے کہ جو قیدیوں کو بطور سزا پہنا دیتے تھے اتنا بھاری بھرکم تاج...... خالص سونے سے بنے ہوئے اس تاج پر کلمہ طیبہ بھی لکھا ہوا ہے جو اس بات کا اعلان ہے کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ رب العالمین کی ہے۔''

مسجد سلطان احمد

''قونیہ کا شہر مولانا روم کا حوالہ ہے اور آج میں مولانا روم کے ہی دیس میں موجود ہوں۔ توپ کاپی محل کے بعد اب ہمارا رخ مسجد سلطان احمد ہے۔

ہم مسجد سلطان احمد کے قریب پہنچے تو ۶ میناروں اور ایک دوسرے سے بلند ہوتے ہوئے گنبدوں کی اس مسجد نے دل و نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ اس مسجد کو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس کی نیلی ٹائلوں اور کھڑکیوں کے نیلے شیشوں کی وجہ سے نیلی مسجد کہا جاتا ہے۔ سلطان احمد نے ۱۶۰۹ء میں اس مسجد کا آغاز کیا جو ۱۶۱۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ مسجد دنیا کی خوبصورت ترین مسجد ہو اور اس کے سامنے بازنطینی عہد کی عمارت ایا صوفیہ ماند پڑ جائے۔

مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک خانے سے پلاسٹک شاپر لیے جا رہے ہیں۔ ہر زائر ہر نمازی اپنے جوتے پلاسٹک شاپر میں ڈال کر مسجد کے اندر لے جا رہا ہے۔ یہ اہتمام اس لیے کہ مسجد گرد و غبار اور آلودگی سے مکمل محفوظ رہے۔ باہر نکلنے والے اپنے استعمال شدہ شاپر اِدھر اُدھر پھینکنے کے بجائے ایک ڈبے میں ڈال رہے تھے۔ ترکوں کی یہ صفائی پسندی ہمیں ہر جگہ نظر آئی۔ مسجد میں داخل ہوئے تو ایک مبہوت کرنے والا منظر سامنے تھا۔ میرے اللہ! تیرا گھر اتنا خوبصورت، اتنا پرکشش، اتنا جمال۔ چمکتے دن کی روشنی رنگ برنگے شیشوں سے گزرتی ہوئی مسجد کو رنگوں اور روشنیوں کی بہار دے رہی ہے۔ میں کھڑکیاں گننے لگا تو بتایا گیا کہ ان کی تعداد ۲۶۰ ہے۔ گنبدوں کی بلندیوں نے مسجد کے ہال کو ایک ایسی تاحدِ نظر وسعت دی ہے کہ زبانیں بے ساختہ سبحان ربی الاعلیٰ پکار اٹھتی ہیں۔ نیلی ٹائلوں پر قرآن پاک کی خوبصورت خطاطی، خطیب کے لیے سفید ماربل کا بنا ہوا ایک بلند و بالا منبر۔ سنگ مرمر کے چار مضبوط ستونوں پر گنبدوں والی چھت۔ پورا ماحول تقدس بھرا۔ ۳ر اطراف میں گیلریاں اور بالکونیاں۔''

ایا صوفیہ

''ایا صوفیہ کی سیر کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بے تحاشا دولت خرچ کی گئی ہے۔ ایا صوفیہ ۹۱۶ سال تک عیسائیت کا مرکز رہا۔ مسیحی دنیا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ مرکز کبھی مسلمانوں کی مسجد میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس عمارت کا گنبد فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے اس کی تعمیر میں رومن ماہرین تعمیرات سے مدد لی گئی۔ بلندی پر کھڑکیاں ہیں۔ ۱۰۷ کالموں پر عمارت قائم ہے۔ دیواروں اور چھتوں پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصاویر کندہ ہیں۔

قسطنطنیہ پر سلطان محمد فاتح نے حملے سے پہلے بازنطینی حکمران کو پیغام بھیجا کہ صلح کر لو، شہر کی کنجیاں خود ہی دے دو، ہماری طرف سے تمام شہریوں کے جان و مال کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔ اس پیشکش سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اس اتمام حجت کے بعد بھی سلطان نے روایتی فاتحین کی طرح انسانی خون کی ندیاں نہیں بہائیں۔ پیشکش ٹھکرا کر اپنی عبادت گاہوں کے تحفظ کے حق سے انھوں نے خود ہی محروم کیا تھا۔ چنانچہ ایا صوفیہ کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۴۷۷ سال تک ایا صوفیہ کے میناروں سے اذانیں بلند ہوتیں اور اس کے وسیع ہال میں نمازیں ادا کی جاتی رہیں۔ عثمانیوں نے بت پرستی اور تصویر پرستی کے سارے نقوش ختم کر دیے۔ دیواروں پر اللہ اور رسولؐ کے اسماء گرامی اور قرآن پاک کی آیات جگمگانے لگیں۔ ایا صوفیہ کے میناروں میں اضافہ کیا گیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پھر ایک وقت آگیا کہ اذانوں کی آواز ختم کرنے، نماز با جماعت کے اہتمام کی صف لپیٹنے، دیواروں کو کھرچ کر پھر سے تصویروں کو نمودار اور نمایاں کرنے کا حکم جاری ہو گیا۔ یہ حکم جاری کرنے والے کوئی عیسائی فاتحین نہیں تھے، کوئی وحشی تاتار نہیں تھے، کوئی چنگیز خان و ہلاکو خان نہیں تھے۔ بظاہر مسلمانوں جیسا نام رکھنے والا ایک لیڈر مصطفیٰ کمال اتاترک تھا۔ ایا صوفیہ کو مسجد نہ رہنے دیا گیا اور ۱۵۰۰ر سال تک ۲ر آسمانی مذاہب عیسائیت اور اسلام (اصلاً ایک ہی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی دین اسلام ہی تھا) کی عبادت گاہ رہنے والی عمارت میوزیم میں تبدیل کر دی گئی۔ اب ٹکٹ لگتی ہے، سیاح آتے ہیں، تصویریں دیکھتے ہیں اور ''مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے۔'' اب جامع ایا صوفیہ سجدوں کو ترس رہی ہے جس کی خاک پر بڑے بڑے نامور اہل ایمان کے سجدے نقش ہیں وہاں انفرادی طور پر نماز ادا کرنے پر بھی پابندی رہی ہے تاہم اب بدلتے ہوئے ترکی میں اگر کوئی سیاح نماز پڑھ لے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔''

مناظر قدرت کی سیاحت

''کھانے کے بعد ہم ساحل سمندر پر پہنچ گئے۔ پہلے تاریخی مقامات کی سیاحت تھی، اب مناظر قدرت کی سیاحت ہے۔ گولڈن ہارن کے کنارے سیاحوں کی بھرمار تھی۔ ۲ر یا ۳ر منزلہ فیری سیاحوں سے بھرتے اور سمندر کی سیر پر روانہ ہوجاتے۔ ہم بھی ایک جہاز میں بیٹھے اور بالائی منزل پر نشستیں سنبھال لیں۔

کچھ دیر بعد سیٹی بجی اور آہستہ آہستہ فیری نے ساحل کو چھوڑ دیا۔ شہر کے ۲ر حصوں کو ملانے والے پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے فیری نے گولڈن ہارن کی تنگ پٹی کو چھوڑ کر آبنائے باسفورس کی راہ لی۔ آبنائے باسفورس میں کئی خوبصورت اور دلکش مناظر ہمارے منتظر تھے۔ شمالاً جنوباً بحر اسود اور بحیرۂ مرمرا کو ملانے والی یہ آبنائے باسفورس دنیا کی خوبصورت آبی گزرگاہوں میں شامل ہے۔ دونوں طرف سبزہ زار ہیں۔ پہاڑیوں کی بلندیوں تک پہنچتے خوبصورت مکانات ہیں جن کی بالکونیوں سے پھول لٹکتے ہیں۔ ساحل پر کئی ریستوران شاد و آباد ہیں۔ ہماری فیری کے پاس سے کئی جہاز گزرتے، چھوٹے بھی بڑے بھی۔ بعض تیز رفتار کشتیاں پانی کو چیرتے فراٹے بھرتی پاس سے گزر جاتیں۔''

ترکی اور ترقی

''۲ر براعظموں پر پھیلے ہوئے استنبول شہر میں ٹرانسپورٹ اور ٹریفک دونوں بڑے مسائل ہیں۔ آدھا شہر صبح اٹھ کر روزگار کے لیے ایشیا سے یورپ میں جاتا اور شام کو یورپ سے ایشیا میں پلٹتا ہے۔ اس لیے ان اوقات میں ہر سڑک پر ہزاروں گاڑیاں آہستہ آہستہ رینگتی ہیں۔ ایسے میں طیب اردگان نے ٹرانسپورٹ اور ٹریفک کے مسئلہ کو اولیت دی اور اب یہ معاملہ قریباً ۸۰ فیصد حل ہو چکا ہے۔ اردگان سے پہلے ۷۹ر سالوں میں کل ۹۱۱ر کلومیٹر دو رویہ سڑکیں تھیں اس نے صرف ۸ر برسوں میں ۱۳۸۰ر کلومیٹر دو رویہ سڑکیں تعمیر کر کے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ سڑکوں، پلوں، اوور ہیڈ کراسنگ، ایک دوسرے کو اوپر نیچے کاٹتے راستوں کے لحاظ سے استنبول اور انقرہ یورپ کے کئی ممالک سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ٹرانسپورٹ میں ان ۸ر برسوں میں ہائی سپیڈ ٹرینوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ٹرینیں شہروں کے اندر بھی رواں دواں ہیں اور انقرہ سے قونیہ کو بھی آپس میں ملاتی ہیں۔ میٹرو بسیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہر سٹاپ پر آگے پیچھے ہر ۲ر منٹ بعد بس پہنچتی ہے۔ یہ بسیں ایک دوسرے سے جوڑ کر ڈبل بلکہ ٹرپل بنائی گئی ہیں۔ دو رویہ سڑکوں کے درمیان میں ایک ڈبل ٹریک صرف بسوں کے چلنے کے لیے بنایا گیا ہے اس لیے وہ راستہ جو اپنی کار میں آپ ایک گھنٹہ میں طے کریں گے وہ میٹرو بس کے ذریعے صرف ۲۰ر منٹ میں طے ہوجائے گا۔ زیر زمین ریلوے کا اضافہ بھی اسی دور میں ہوا ہے اور اس کے ذریعے بھی عوام کو ٹرانسپورٹ کی بے پناہ سہولت ملی ہے۔ اب حکومت آبنائے باسفورس کے نیچے نقل بنا کر مشرق و مغرب یعنی ایشیا و یورپ کو تیز رفتاری سے ملانے کا بندوبست کر رہی ہے۔

ترکی کی معیشت نے اچانک کئی جمپ لگائے ہیں۔ یہ ہم سے بھی زیادہ تباہ حال معیشت تھی۔ کبھی ترکی میں افراط زر کی شرح ۱۴۰ر فیصد تک پہنچ گئی تھی آج یہ شرح ۶ر سے ۷ر فیصد تک ہے۔ کبھی سود کی شرح ۶۰ر فیصد تھی، آج یہ چار پانچ فیصد ہے۔ ترکی نے آئی ایم ایف سے جان چھڑا لی ہے اور اس طرح اب وہ معیشت کے لحاظ سے دنیا میں ۱۵ر ویں مضبوط معیشت کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔''

نام کتاب: سفرنامہ ترکی
مصنف: ڈاکٹر فرید احمد پراچہ
صفحات: ۱۹۰
قیمت: ۴۰۰ر روپے
ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز
۲۵ شاہراہ پاکستان (لوئر مال) لاہور
فون: 042-37220100

وٹامنز سے بھرا پپیتا اپنے گھروں میں اُگائیے

وزن کم کرنے میں پپیتا بڑے کام کی چیز ہے

اس کا پھل اور پتے ڈینگی سے بچاؤ میں بے حد مددگار ہیں

نوشین ناز

امید ہے کہ آپ نے رمضان کریم کی برکتوں کو خوب سمیٹا اور اپنی صحت کا خیال بھی رکھا ہوگا۔ رمضان میں روزے کا مطلب اپنے نفس اور بھوک پر کنٹرول کرنا ہے لیکن آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا اور میں نے تو بارہا افطار پارٹیوں میں لوگوں کو ایسے کھاتے دیکھا ہے جیسے اُن کی زندگی کی آخری افطار پارٹی ہو۔ بعد میں چاہے سانس نہ آئے۔ کھانے سے ہاتھ نہیں رکتا۔ یہ تماشا بھی صرف ہمارے ملک میں ہوا کہ ۲ر سیاسی پارٹیوں کے افطار میں گھنٹہ بھر پہلے ہی لوگ سب کچھ کھا گئے۔ اپنے روزے کے ساتھ تو جو سلوک انھوں نے کیا، سو کیا مگر نفس پر قابو اور اندر کے لالچ اور بھوک کے ہاتھوں یوں خوار ہونا کہ دنیا میں تماشا بن جائیں، کسی طور پر اچھا مظاہرہ نہیں ہے۔ بعض لوگ اسے جیالا کلچر کہہ کر اس کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر خود سوچیے، ماہِ رمضان کا رتی برابر بھی احترام دل میں ہوتا تو یہ مناظر تو نہ دیکھنے کو ملتے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

آپؐ نے کھانے کا جو سلیقہ بتایا اس کے مطابق ایک حصہ کھانے کا، ایک حصہ پانی اور ایک حصہ ہوا کا رہنا چاہیے۔ کم کھانا، بھوک رکھ کر کھانا یہ وہ سائنس ہے جو آپؐ نے ہمیں ۱۴۰۰ سال پہلے بتا دی تھی اور یہ وزن ہی کنٹرول میں نہیں رکھتی بلکہ پورے جسم کو متوازن، چست اور متحرک بھی رکھتی ہے۔ ہم بھی خوب ہیں، ہر اچھی بات، ہدایت بھلائے جاتے ہیں اور پھر اس کی ایسی قیمت بھی ادا کرتے ہیں جو ہمیشہ بھاری پڑتی ہے۔

اس ماہ کی انفارمیشن

۱۰۰ گرام پپیتے میں شامل غذائی اجزا

کاربوہائیڈریٹ	۹٫۸۱ گرام
فائبر	۱٫۸ گرام
کیلشیم	۲۴ ملی گرام
میگنیشیم	۱۰ ملی گرام
فاسفورس	۵ ملی گرام
پوٹاشیم	۲۵۷ ملی گرام
سوڈیم	۳ ملی گرام
آئرن	۰٫۱۰ ملی گرام
پروٹین	۰٫۶۱ گرام
فولیٹ	۳۸ ملی گرام
زنک	۰٫۰۷ ملی گرام
وٹامن اے	۱۰۹۴۱ یو
وٹامن سی	۶۱٫۸ ملی گرام
وٹامن ای	۰٫۷۳ ملی گرام
وٹامن کے	۲٫۶ ملی گرام
وٹامن بی ۲	۰٫۰۵ ملی گرام
وٹامن بی ۶	۰٫۱ ملی گرام
بیٹا کیروٹین	۲۷۶ ملی گرام

ایک ہی پھل میں اللہ جی نے اس قدر وٹامنز فراہم کر دیے ہیں کہ کیا ہی کوئی ملٹی وٹامن گولی ہمیں دے گی۔ اب یہ ہماری چوائس ہے کہ ہم خود کو کیسی غذا دیتے ہیں۔

پپیتے میں بیٹا کیروٹین کا اہم غذائی جزو شامل ہے۔ اس کے علاوہ اینٹی آکسیڈینٹس اور پوٹاشیم ہمیں کینسر سے محفوظ رکھتا ہے۔ قوت مدافعت کے لیے یہ بہترین پھل ہے۔

اپنی زندگی میں قدرتی چیزوں کے استعمال کی جگہ بڑھائیں۔ پھل، سبزیاں، دودھ، اناج جیسی غذائیں ہمیں صحت مند رکھتی ہیں، ہمارے اندر بیماریاں ختم کرتی اور بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت پیدا کرتی ہیں۔ پپیتا آسانی سے اپنے گھر کے لان میں اُگایا جا سکتا ہے۔ اس کا پھل اور پتے ڈینگی کے علاج میں معاون ہونے کے باعث پچھلے سال بہت مہنگے داموں بکتے رہے۔ اب آئیے اس ماہ کے سوالات اور مسائل کی طرف۔

کیا قد میں اضافہ ممکن ہے؟

میری عمر پندرہ سال ہے وزن ۳۹ کلوگرام اور قد پانچ فٹ ایک انچ ہے۔ مہربانی کر کے مجھے سادہ سی گھریلو ورزشیں بتائیں، جن سے قد بڑھ جائے۔

(صوبیہ۔ کوٹ ادو)

جواب: اگر آپ کا Menstrual Cycle (ماہواری) شروع ہو چکا ہے تو آپ کے قد میں زیادہ اضافہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو اپنا لائف سٹائل اور کھانے کی عادات بدلنا ہوں گی۔ اپنی غذا میں دودھ پر مشتمل اشیا کا استعمال بڑھا دیں اور لٹکنے والی ورزشیں (Hanging Exercises) کریں۔ آج کل گرمی ہے۔ آپ کی رہائش کسی بڑے شہر میں ہوتی تو لڑکیوں کے لیے مخصوص سوئمنگ پولز (Swimming Pools) میں ہونے والی کلاسوں میں بھی داخلہ لے لیتیں۔ باقاعدگی سے تیراکی کرنے سے قد میں ۳ سے ۴ انچ تک اضافہ ممکن ہے۔ اچھی نیند آپ کے گروتھ ہارمونز کے لیے بہت اچھی ہے۔ جنک فوڈ کھانا مکمل طور پر بند کر دیں۔ اپنی غذا میں سلاد اور فروٹ کا استعمال بڑھا دیں۔ ان شاء اللہ اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نماز کی سائنس آپ کی مدد کرے گی

سوال: نوشین باجی! میری عمر ۱۵ رسال ہے اور میرا پرابلم یہ ہے کہ میں جب بھی پڑھنے بیٹھتا ہوں تو پڑھائی میں دل نہیں لگتا اور دماغ پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ میرا وزن ۴۰ رکلوگرام اور قد ۴ رفٹ ہے۔ میں آٹھویں کلاس کا طالب علم ہوں۔ پلیز میرے سوال کا جواب ضرور دیں تاکہ میں اپنی پڑھائی سکون سے کرسکوں۔

نبیل احمد۔ کراچی

جواب: نبیل بیٹا! آپ کو اپنا لائف سٹائل بدلنے کی ضرورت ہے۔ اول تو آپ اپنی نیند پوری کریں۔ اس کے علاوہ کوئی گیم روز کیا کریں۔ دودھ کا ایک گلاس صبح ناشتے میں اور ایک گلاس تین بادام کے ساتھ رات کو لیں۔ نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ نماز کے پاسچرز (یعنی، قیام، رکوع اور سجدہ) اپنے اندر پوری سائنس رکھتے ہیں کہ صحت کا بڑے سے بڑا مسئلہ اس سے حل ہوسکتا ہے۔ بہرحال آپ رکوع اور سجدہ بہت طویل کریں۔ آپ کے دماغ تک خون کا بہاؤ اور گردش آپ کا مسئلہ حل کروا دے گی۔ وضو کے دوران مسح جو گردن کے پیچھے کیا جاتا ہے وہ اللہ جی کی طرف سے ہر طرح کی ذہنی بیماریوں کے ساتھ ساتھ دماغ پر بوجھ کے لیے بھی بہترین تھراپی ہے۔

اس کے علاوہ جنک فوڈز اور Fizzy ڈرنکس کے قریب بھی نہ جائیں۔ سادہ پانی اور دودھ کا استعمال آپ کو بہترین نتائج سے ہمکنار کرے گا۔

کھانے کے خراب اوقات

سوال: میرا وزن ۹۵ رکلوگرام ہے اور قد ۵ رفٹ ۱۰ رانچ ہے۔ عمر ۲۷ رسال ہے۔ ناشتے میں ایک کپ چائے کا، ایک پراٹھا، دوپہر میں دو روٹی سالن کے ساتھ، پھر گھنٹہ بھر آرام۔ ۳ ربجے دفتر، رات ۱۱ ربجے واپس آکر دو روٹی سالن کے ساتھ۔ وزن کیسے کم کیا جاسکتا ہے؟

منور راجپوت۔ میرپور خاص

جواب: آپ کے کھانے کے اوقات بہت خراب ہیں۔ آپ ڈنر ۸، ۹ بجے ہرصورت کرلیا کریں ورنہ وزن بالکل کنٹرول سے باہر ہوجائے گا۔ صبح ۲ رگلاس پانی اور ایک سے دو جوئے دیسی لہسن کے پھانک لیا کریں۔ ۸ ربجے ناشتا جَو کے دلیے اور شہد کے ساتھ کریں۔

۱۰ ربجے انار لیں۔ ۱۲ ربجے ایک چپاتی گھر کا بنا سالن ۴ رچمچ اور گرین ٹی لیں۔

۳ ربجے ایک کپ چائے کا لے لیں۔ ۵ ربجے ایک پیالی دہی لے لیں۔ ۷ ربجے دو سیب یا تین آڑو لیں۔ آدھی پلیٹ سالن اور گرین ٹی لیں۔ ۱۰ ربجے چھوٹی پیالی دودھ اسپغول کے چھلکے کے ساتھ لیں۔ صبح شام ایک ایک گھنٹہ واک کریں۔ پانی کے ۱۰ ر سے ۱۲ ر تک گلاس روزانہ استعمال کریں۔

آپ کا مسئلہ وزن نہیں کچھ اور ہے

سوال: میری عمر ۱۷ رسال، وزن ۷۵ رکلوگرام اور قد ۵ رفٹ ۴ رانچ ہے۔ میں بہت مایوس رہتی ہوں۔ میرے وزن کے لحاظ سے مجھے متوازن غذا بتائیں۔ میری مدد کریں ورنہ میں مایوسی میں کچھ کر نہ بیٹھوں اور مجھے رنگ گورا کرنے کا ٹوٹکا بھی بتائیں اگر میرے سوال کا جواب نہ دیا تو مجھے کچھ ہوجائے گا۔ (سائرہ۔ فیصل آباد)

جواب: بہت دُکھ کی بات ہے سائرہ ایک مسلمان ہو کر اس قدر مایوسی؟ آپ کی زندگی میں جو پرابلم ہے وہ وزن یا رنگت نہیں بلکہ مایوسی ہے۔ اسے تو سب سے پہلے ختم کریں۔ کوئی بھی کام کرنا ہو تو خود پر بھروسا کرتے ہیں۔ وزن کم کرنے کے لیے ترغیب (Motivation) نہ ہو تو آپ کچھ نہیں کرسکتے۔ مایوسی میں ڈوبے رہنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔

آپ کا وزن کم از کم ۲۰ رکلوگرام کم ہونا چاہیے۔ پہلے ماہ ہر ہفتے ایک کلو وزن گرائیں۔ سبزیاں اور فروٹ اپنی غذا میں شامل کریں۔ ایک ماہ کے لیے سفید چاول، وائیٹ بریڈ اور روٹی چھوڑ دیں۔ ارادے کی پختگی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ایک گزارش

میرا فون نمبر (0301-4585405) اس لیے دیا جاتا ہے تاکہ آپ کے SMS دیکھ کر میں باری کے حساب سے کالم میں جواب دے دوں۔ آپ اپنے مسائل بذریعہ خط بھی بھجوا سکتے ہیں۔ جواب بہرحال باری آنے پر ملے گا۔

گزارش ہے کہ رات کو فون بالکل نہ کریں۔ بات کرنی ہو تو پہلے SMS کر کے وقت لے لیں۔ باری آنے پر ان شاء اللہ سب کے جواب ملیں گے۔ خوش رہیں، شکر ادا کرتے رہیں، اپنے رب کی نعمتوں پر، دوسروں کو آسانی دیں، اللہ آپ کو آسانی دے گا۔ مجھے اور میرے اہل خانہ کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

Determination اور لگن سے آپ اپنا مقصد حاصل کر سکتی ہیں۔

ناشتے میں Skim دودھ کے ساتھ جو کا دلیا لیں۔ لنچ میں گرل چکن اور سلاد کا استعمال کریں۔ رات کے کھانے میں Steam سبزیوں کا سوپ لیں، ساتھ ایک پیالی دہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ورزش کو روز کا معمول بنا لیں۔ آپ ملٹی وٹامن استعمال کریں۔ اس میں آئرن، کیلشیم، وٹامن ڈی، وٹامن بی ۱۲ ضرور شامل ہوں۔

آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے

سوال: میری عمر ۲۳ سال، وزن ۵۰ کلوگرام اور قد ۵ فٹ ایک انچ ہے۔ میرا آئیڈیل وزن کتنا ہونا چاہیے؟

(تابش۔ ساہیوال)

جواب: آپ کا وزن آپ کے قد کے لحاظ سے بالکل موزوں (Perfect) ہے، آپ بس اسے قائم رکھیں۔ متوازن غذا لیں اور ورزش ضرور کریں۔ اپنی غذا میں سبزیاں، دالیں، سفید گوشت اور دودھ کا استعمال رکھیں۔ جنک فوڈ سے مکمل پرہیز کریں۔ روز کی آدھا گھنٹہ واک اپنی طرز زندگی میں مستقل رکھیں۔ نماز باقاعدگی اور توجہ سے ادا کریں۔ آپ کو ہمیشہ بہترین نتائج ملیں گے۔

مجھے موٹا ہونے کے طعنوں سے بچا لیں

سوال: آپی جان! میری پلیز مدد کریں۔ سب مجھے موٹا ہونے کے طعنے دیتے اور مذاق اڑاتے ہیں۔ میں سمارٹ ہونا چاہتی ہوں۔

(سدرہ تبسم۔ گجرات)

جواب: سدرہ! آپ کی عمر، قد، وزن اور کھانے کی روٹین جانے بغیر میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔

مہک۔ فیصل آباد

آپ کو مبارک ہو آپ نے ڈیڑھ ماہ میں ۹ کلوگرام وزن کم کیا ہے۔

جواد۔ ملتان

۳ کلوگرام وزن کم کیا ہے، یہ وزن بھی اچھا ہے۔ اپنے ٹارگٹ کی جانب مسلسل اور آہستگی سے بڑھیں۔

سمیرا۔ ملتان

۲ ماہ میں ۹ کلو کم کیا ہے۔ مبارک ہو۔ آپ کا وزن جو ہمیشہ بھوکے رہنے سے بھی آدھا کلو بھی کم نہیں ہوا تھا بالآخر کم ہونے لگا ہے۔

اسد۔ کھاریاں

آپ ایک ماہ میں ۹۵ کلوگرام سے ۸۸ کلوگرام پر آئے ہیں، یہ خوشی کی بات ہے۔ پانی کا استعمال اور ورزش جاری رکھیں۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اپنی مرضی کا وزن پانے کے لیے آپ اپنے پورے دن کی کیلوریز کو 1000 سے 1500 تک محدود رکھنا سیکھیں

دال یا سبزی ایک پلیٹ	200 کیلوریز	کریم والا بسکٹ	500 کیلوریز
پلیٹ دال یا سبزی ایک بوٹی گوشت (50 گرام)	300 کیلوریز	ایک پیسٹری (80 گرام)	300 کیلوریز
ایک پلیٹ اُبلے ہوئے چاول (50 گرام)	150 کیلوریز	ایک سموسہ درمیانہ	300 کیلوریز
ایک پلیٹ گھی والے چاول	250 کیلوریز	آدھی پلیٹ پکوڑے (100 گرام)	400 کیلوریز
ایک چکن پیس (100 گرام)	200 کیلوریز	فنگر چپس چھوٹی پلیٹ (50 گرام)	200 کیلوریز
ایک شامی (50 گرام)	200 کیلوریز	چکن برگر بڑا	500 کیلوریز
ایک پلیٹ بریانی	300 کیلوریز	بیف برگر بڑا	600 کیلوریز
ایک کباب (بیف)	100 کیلوریز	پیزا چھوٹا (100 گرام)	500 کیلوریز
ایک پلیٹ نہاری چھوٹی	700 کیلوریز	ملک شیک (کیلا)	210 کیلوریز
ایک پیالہ پائے	600 کیلوریز	ملک شیک (سیب)	180 کیلوریز
ایک پیالہ مرغ چنے	400 کیلوریز	ملک شیک (آم)	200 کیلوریز
گھر کی چپاتی (60 گرام)	200 کیلوریز	دودھ ایک گلاس بالائی کے ساتھ	200 کیلوریز
سادہ روٹی تندور (90 گرام)	300 کیلوریز	دودھ کا گلاس بغیر بالائی	150 کیلوریز
خمیری روٹی تندوری (100 گرام)	340 کیلوریز	تازہ پھلوں کا جوس	120 کیلوریز
کلچہ (80 گرام)	250 کیلوریز	بوتل (پیپسی کولا)	110 کیلوریز
پراٹھا (100 گرام)	450 کیلوریز	بوتل (جوس)	130 کیلوریز
ایک سلائس	60 کیلوریز	شربت (روح افزا)	130 کیلوریز
ایک سلائس تلا ہوا	90 کیلوریز	یخنی (ایک گلاس)	200 کیلوریز
ایک انڈا اُبلا ہوا	80 کیلوریز	لسی ایک گلاس (آدھا دودھ آدھی دہی)	250 کیلوریز
فرائی انڈا	125 کیلوریز	نمکین لسی (ایک گلاس)	40 کیلوریز
آملیٹ	150 کیلوریز	چائے بغیر چینی	30 کیلوریز
ایک سادہ بسکٹ	30 کیلوریز	چائے (چینی کے ساتھ)	60 کیلوریز

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

انعامی
مقابلہ

دلچسپی، معلومات
اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اس
کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے

قصہ کوئز

انچارج کوئز:
حافظ فراز محمود

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے دو سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے اگر دو سے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے ۶ شماروں کی اعزازی ترسیل کے علاوہ وصی شاہ کی شاعری کی دو خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جوابات بھیجنے کا پتہ: مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہِ اگست میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱۔ (الف) نہر سویز (ب) ۳۰ ہزار۔ قصہ کوئز ۲۔ (الف) ٹیلی ویژن (ب) جان لوگی بیرڈ
قصہ کوئز ۳۔ (الف) پنسل (ب) برطانیہ

درست جوابات دینے والوں کے نام

عمر وحید (فیصل آباد)، صادق احسان (اسلام آباد)، سید زاہد علی (کراچی)، معین الدین (رحیم یار خان)
محمد سعید بشیر (لاہور)، الفت حسین (شیخوپورہ)، محمد عرفان (لاہور)، طٰہٰ یٰسین (حیدرآباد)، فرحال بیگ (حیدرآباد)
ریحانہ ظریف (کراچی)، محمد ظریف خان (کراچی)، علی رضوی (کراچی)، اقبال احمد خان (کراچی)
ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، پروفیسر محمد طاہر (سرگودھا)، محمد جمشید علی (کراچی)، فضل رحیم (پشاور)
محمود منور خان (سرگودھا)، سلطان محمود (کھاریاں)، ریحانہ راجپوت، امجد جاوید (راولپنڈی کینٹ)
محمد خلیل چودھری (دینہ)، شعیب شاہد (لاہور)، فضل رحیم اعوان، شعیب افضل، احسان الٰہی مغل (میرپور خاص)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ الفت حسین، محلہ خان پارک نزد پرانی چونگی نمبر ۹، شرقپور روڈ، شیخوپورہ
۲۔ معین الدین، 12-B، بزنس مین کالونی رحیم یار خان

آپ کو ۶ ماہ تک اردو ڈائجسٹ کے شمارے اور وصی شاہ کی کتب بطور تحفہ ملیں گی

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھی بھجوا سکتے ہیں

قصہ کوئز/۱

۱۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہاراوا ہیروشی اپنی ننھی بہن اور اپنے امی ابو کے ساتھ ہیروشیما اسٹیشن پر کھڑا ۸ر بجے والی ریل کا انتظار کر رہا تھا۔ آج یہ سب لوگ ہیروشیما چھوڑ کر کہیں دور منتقل ہونے کے لیے اسٹیشن آئے تھے۔ یہ ایک سہانی صبح تھی۔ ہاراوا افسردہ تھا کہ اسے یہ شہر چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ ''ریل ابھی تک نہیں آئی'' اس نے امی سے سوال کیا اور اسٹیشن پر لگے ہوئے بڑے سے گھنٹے کو دیکھا جس پر ٹھیک ۸:۱۵ بجے تھے۔ بس عین اس لمحے ایک روشنی سے سب کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور دھماکے سے زمین ہل گئی۔ تھوڑی دیر بعد امی ابو اور ہزاروں انسان موت کی آغوش میں جا چکے تھے البتہ موت اور زیست میں تڑپتا ہوا ہاراوا بچ گیا۔

(الف) بتائیے اس روز کہاں اور کون سا تاریخی سانحہ رونما ہوا؟

(ب) اس سانحے کا اور ہزاروں لوگوں کے قتل کا کون سا ملک ذمہ دار تھا؟

قصہ کوئز/۲

۱۹ ستمبر ۱۹۲۸ء کو امریکا کے مین ہٹن کالونی تھیٹر میں پہلی بار ایک عجیب وغریب کردار لوگوں نے دیکھا۔ بظاہر چوہے اور انسان کی آمیزش مگر اتنا دلچسپ کہ دیکھتے ہی ہنسی آجائے۔ اس کی حرکات اور اس کے ڈائیلاگ نے وہاں موجود لوگوں کے دل موہ لیے۔ یہ کردار لوگوں کو ایسا پسند آیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر میں اس کی دھوم مچ گئی۔ بچے تو اس کے دیوانے ہوگئے۔ ۱۹۶۸ء میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق ۴۰ رسال کی عمر تک اس کردار پر ۱۴۰ رفلمیں بن چکی تھیں۔ ۵ر ہزار سے زیادہ مصنوعات پر اس کی تصویریں اور نام شائع ہو چکے تھے۔ ۳۰ ر کروڑ کتابیں اس کے نام کی فروخت ہو چکی تھیں۔ اس کی کامکس ۵۰ ر ہزار سے زائد لوگ پڑھ چکے تھے۔ اتنی شہرت تو ناموری کے لیے جدوجہد کرنے والے انسانوں کے حصے میں بھی نہیں آئی۔

(الف) کیا آپ اس عالمی شہرت پانے والے کردار کا نام بتا سکتے ہیں؟

(ب) کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کردار کو کس نے تخلیق کیا؟

قصہ کوئز/۳

ایک شام حضرت یعقوب علیہ السّلام اپنی والدہ کے حکم پر سفر کے لیے نکلے۔ چنانچہ آپ رات کے وقت کنعان کی سرزمین سے نکلے اور حران کی طرف محوِ سفر ہو گئے۔ دورانِ سفر انھیں رات نے آلیا۔ سفر کی تھکن سے نیند غالب آنے لگی تو ایک پتھر سر کے نیچے رکھ کر سوگئے۔ اسی نیند میں بڑا خوبصورت خواب دیکھا کہ زمین سے آسمان تک سیڑھی لگی ہے۔ سیڑھی بھی نہایت شاندار ہے۔ ملائکہ اس سے زمین پر اتر رہے اور واپس جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ حضرت یعقوبؑ سے گفتگو فرما رہا اور کہہ رہا ہے، میں تجھے بابرکت بنادوں گا اور تیری اولاد کو بڑھا دوں گا اور یہ زمین میں تجھے اور تیرے بعد تیری نسل کو دوں گا۔ جب حضرت یعقوبؑ خواب سے بیدار ہوئے تو چہرے پر مسرت غالب آرہی تھی۔ ذہن پر وہی خواب گردش کر رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے خوشی میں نذر مانی کہ اگر یہ خواب پورا ہوگیا تو میں اس جگہ پر عبادت گاہ تعمیر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے اس پتھر کو وہاں محفوظ کیا اور پر تیل مل دیا تاکہ پہچاننے میں آسانی رہے۔ آخرکار سفر کی سختیاں برداشت کرتے کرتے حضرت یعقوبؑ اپنے ماموں کے پاس حران جا پہنچے اور پھر وہیں سکونت اختیار کرلی۔

(الف) اس جگہ کا نام بتائیے جہاں یہ عبادت گاہ تعمیر ہوئی؟ یہ کس ملک میں واقع ہے؟

(ج) اسی رات حضرت یعقوبؑ کو ایک لقب بھی ملا۔ وہ لقب کیا تھا؟

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

حسنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

نوجوانوں کی کامیابی کا بہترین ذریعہ

میں جنوری ۲۰۱۱ء سے اُردو ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ تب سے عادت سی ہوگئی ہے۔ ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ چار نہیں آٹھ چاند لگ گئے ہیں۔ اللہ آپ کا اقبال بلند فرمائے۔ میں ایک معلم ہوں اور اپنے طلبا کو یہ رسالہ پڑھنے کی تاکید کرتا ہوں۔ اس میں نوجوان نسل کی اصلاح کا بہت سا مواد مل جاتا ہے۔ خصوصاً کامیاب شخصیات کے انٹرویوز نوجوانوں کو کامیابی کی راہ پر لانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ''نقوش صحابہؓ'' سلسلہ بے حد متاثر کن ہے۔ پڑھ کر ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔ ''گوشۂ ست رنگ'' نظر نہیں آرہا۔ اسے جاری رکھیں۔ معلوماتی سلسلہ تھا۔ ''قصہ کوز'' علم کی تڑپ اور طلب پیدا کرنے والا سلسلہ ہے۔ مجھ میں بھی یہ سلسلہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ کرنے کا شوق پیدا ہوا ہے اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا ہے۔

(طلعت حسین۔ شرقپور شریف)

ملکی حالات لمحہ فکریہ!

اردو ڈائجسٹ کا شمارہ ملتے ہی میں مستقل کالم ''در دل پر دستک'' پڑھتا ہوں۔ سادہ اور صاف الفاظ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے ایک بڑی بات کہہ دیتے ہیں۔ آپ کی تحریروں کو وہی سمجھ سکتا ہے جو انسانی جذبوں کو محسوس کرے اور دستک سن سکے۔ خیالات کے دھارے بہتے رہتے ہیں لیکن ان کو تحریر میں بدلنا ہر کسی کا کام نہیں۔

۲ ر تجاویز ہیں جن پر آپ غور کر سکتے ہیں۔ ملکی حالات تیزی کے ساتھ تنزلی کا شکار ہیں جو لمحہ فکریہ ہے۔ اپنے ڈائجسٹ اور تحریروں میں اس موضوع کو جگہ دیں جو ملکی حالات کی نشان دہی کریں اور نوجوان نسل کو سوچنے پر مجبور کریں۔ جناب الطاف حسن اپنی تحریروں میں مدت سے اپنے ڈائجسٹ میں نشان دہی کر رہے ہیں لیکن ان کی ایک آدھ تحریر ہوتی ہے۔

ہم دشمنوں کے طعنے سن کر اذیت میں مبتلا ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے انگلینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک بچی

محفل میں ایک ہندوستانی سے ملنے کا موقع ملا۔ پاکستان کے حالات پر دوران گفتگو وہ کہنے لگا کہ کرنل صاحب! آپ لوگوں نے ملک کی تقسیم دو قومی نظریہ اور فلاحی ریاست کے لیے مانگی تھی۔ لیکن آپ کے حالات اس کا نقشہ پیش نہیں کر رہے۔ آپ کے ملک میں غربت، بے روزگاری، دہشت گردی اور بے حیائی کا دور دورہ ہے۔ کہاں ہے اسلامی فلاحی ریاست؟ اس کی باتوں میں کتنا سچ ہے! ایک طعنہ ضرور ہے۔ جہاں تک غربت، بے روزگاری اور جرائم کا تعلق ہے وہ ہندوستان بلکہ تیسری دنیا کے ممالک میں بھی ہیں۔ دکھ تو کرپشن، بے حیائی اور اَن کیٹ واکس سے ہے جو ہمارا ورثہ نہیں۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ آپ اپنے مستقل کالم ''دل پہ دستک'' کو کتابی شکل میں شائع کریں۔ عید مبارک۔

(لیفٹیننٹ کرنل مبشر احمد۔ دوابل تحصیل پنڈ دادن شاہ)

ملک کے پہلے وزیر تعلیم

میں یہ خط جناب پروفیسر محمد ظریف خان صاحب کے مضمون ''قرض'' کے حوالے سے لکھ رہا ہوں (شمارہ اگست ۲۰۱۲ء)۔ اس میں انھوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر محمود حسن پاکستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ پہلے وزیر تعلیم جناب فضل الرحمن تھے۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت وزیر تعلیم بنے جب خواجہ ناظم الدین کے دور میں طلبا کی ہڑتال کے باعث فضل الرحمن کو ہٹا کر ڈاکٹر صاحب کو جو کہ اس وقت وزیر امور کشمیر اور ریاستی امور تھے، وزارت تعلیم کا قلمدان سپرد کیا گیا۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں کیونکہ میں اُس وقت سندھ مدرسۃ السلام میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔

(ملک محمد اکرام اللہ۔ رحیم یار خان)

اردو ٹانک

۱۹۷۴ء سے قاری ہوں۔ اس ڈائجسٹ نے مجھے سیاسی سوجھ بوجھ ہی عنایت نہیں کی بلکہ اردو زبان کی کمزوری میں ایک ٹانک کا کردار ادا کیا۔ میں ریگولر قاری ہوں۔ آپ خریداری لسٹ میں نام دیکھ سکتے ہیں۔ رسالے کا نیا گیٹ اپ بے حد پسند آیا۔ اب یہ انگریزی ریڈرز ڈائجسٹ کے مقابلہ پر آ گیا ہے۔ پہلے میں ریڈرز ڈائجسٹ بھی منگواتا تھا مگر نئے انداز نے مجھے ریڈرز ڈائجسٹ کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا ہے۔

البتہ بہتری کی گنجائش ہر وقت رہتی ہے۔ میں کتابوں کا بے حد شوقین ہوں۔ اردو ڈائجسٹ کے تبصرے پڑھ کر کتاب منگواتا ہوں۔ آپ سے اتنا عرض ہے کہ کتاب کے ناشر کا نام اور فون نمبر اور ایڈریس ضرور لکھیں تاکہ فون کر کے کتاب منگوالوں۔ پچھلے شمارہ میں ''Alchemist'' کا ذکر آیا تھا۔ خوش قسمتی سے بازار سے مل گئی۔ (اس کا ترجمہ)' البتہ یہ کتاب اگر Original Language میں ہوتو کیا کہنے۔) حکیم محمد سعید کی کتاب شاہراہ زندگی کا بھی ذکر آیا تھا لیکن تلاش بسیار کے باوجود لوکل مارکیٹ میں نہیں ملی۔ ویسے یہ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ خدا کے لیے اسے بند نہ کیجیے گا۔ بلکہ ان تمام کتابوں پر ہلکا تبصرہ بھی لکھیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی، چاہے وہ کتابیں اردو میں ہوں یا انگریزی میں۔

(فدا حسین۔ گاؤں بوزوتس، ضلع گلگت)

بے حیائی کے کینسر کا ایک علاج

میں بہت چھوٹی عمر سے اردو ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ اس وقت ۴۸ برس کا ہوں۔ خاموش قاری تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کون ہوتا ہے۔ چلیے میں بھی بتا دوں! جس کو جو کچھ بھی پڑھنے کو دیا جائے وہ اُف کیے بغیر پڑھے اور زبان سے کچھ نہ کہے لیکن اب معاملہ آپ کی زیر ادارت مختلف ہوگیا ہے۔ آخر جوان خون کا کچھ تو اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اب میں اردو ڈائجسٹ پڑھنے کا آغاز ہی آخری صفحات سے کرتا ہوں۔ شکاریات پر مضمون دوبارہ شروع کرنے کا شکریہ۔ ''کتاب گھر'' میں کبھی کوئی مفت ملنے والی کتابوں کا تعارف بھی شائع کرا دیا کریں۔ ویسے یہ تو بتائیں کہ لاہور سے چلنے والا ''سونامی'' ہمارے

PAKISTANVIRTUALLIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Letter of the Month

کراچی ہوائی اڈے پر جب بُک کارنر پر اردو ڈائجسٹ دیکھا تو حیرت سے دیکھتا رہا۔ پہلے دکاندار سے پوچھا اردو ڈائجسٹ ہی ہے نا؟ پھر خود اٹھا کر دیکھا کہ اپنا لوکل اُردو ڈائجسٹ ہی ہے نا کہ چائنہ (مزاحاً) کی طرف سے کوئی اردو ڈائجسٹ کی کاپی نکلی ہے۔ خیر، جلدی سے پیسے دے کر ڈائجسٹ بیگ میں ڈال کر جہاز میں بیٹھنے کا انتظار کیا اور جہاز میں بیٹھتے ہی ڈائجسٹ نکالا۔ پہلے تو ورق گردانی کو اپنا اولین حق سمجھ کر اُسے پڑھتے رہے، پھر سب کو ۱۰۰۰ کے نوٹ کی گڈی کی طرح چیک کیا کہ کیا کیا موجود ہے۔ پھر پہلے علی سفیان آفاقی کا انٹرویو پڑھا، مزہ آ گیا۔ اے حمید مرحوم کے بعد آفاقی صاحب ہی ہیں جن کے افسانے وغیرہ بہت پڑھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرگزشت پڑھنے کی وجہ بھی یہی ہیں۔ پھر بھوک مٹانے والی ۵ رغذائیں دیکھ کر دعا مانگی کہ یہاں بھی ایسے پلانٹ لگیں مگر ظالم لوگوں کے بجائے رحمدل اور حساس لوگوں کے پاس ان کے بیچنے کے اختیارات ہوں، ورنہ چینی اور سبزیوں وغیرہ کا حال سب کے سامنے ہے۔ وسی شاہ کی تحریر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔

سلمان خان کی اکیڈیمی واقعی ایک اعلیٰ ویب سائٹ ہے جس کا میں باقاعدگی سے وزٹ کرتا ہوں۔ مینجمنٹ گرو کی حسب معمول بہترین تحریر تھی کیونکہ آج کل میں مینجمنٹ پر تحریریں زیادہ پڑھتا ہوں۔

باقی افسانے ہمیشہ کی طرح تھے۔ انھیں انجوائے کیا، خاص طور پر ''نظر'' واہ کیا خوب افسانہ تھا۔ جہاز میں آدھا شمارہ پڑھ کر پشاور ہوائی اڈے پر اُترا۔ شاید آپ یقین نہ کریں، میں نے تقریباً ۱۰ رسال بعد کسی رسالے میں لکھا ہے، ورنہ مجھے یاد ہے پھول اور تعلیم و تربیت میں خط وغیرہ بھیجتا تھا، یعنی ۱۰ رسال پہلے۔ میرا ہاتھ باقاعدہ اردو لکھنا ہی بھول گیا تھا۔

(شیر نواز گل۔ پشاور)

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پاس کب تک آئے گا اور آئے گا بھی یا نہیں کیونکہ آپ ماشاءاللہ باخبر لوگ ہیں۔ ''مستقل کالم'' میں جس مرض کا آپ نے ذکر کیا ہے یہ تو اب کینسر بن کر قوم کی رگوں میں اُتر چکا ہے۔ اگر مجھے دقیانوسی نہ سمجھیں تو اس بے حیائی کے کینسر کا علاج میں بھی بتا دوں۔ اپنے گھروں میں ٹیلی ویژن ہی نہ رکھیں۔ معلومات کے لیے پرنٹ میڈیا کافی ہے۔ خود میں اس ٹیلی ویژن نامی ڈبے کو عرصہ ۷ رسال سے اپنے گھر سے نکال چکا ہوں۔ وجہ بے حیائی اور بے شرمی کے مرض سے اپنے گھر کو محفوظ رکھنا ہے۔ اب نہ بچے مجھے دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں اور نہ میں انھیں دیکھ کر آنکھیں چُراتا ہوں۔

کرامت راؤ۔ ضلع تھرپارکر (سندھ)

اِس ماہ کا انعامی خط

آپ کی جانب سے رسالے میں قارئین کی شرکت کی حوصلہ افزائی، ایک ایسا وصف ہے جو معاصر رسالوں میں کم ہی نظر آتا ہے۔ جبکہ اس سے رسالے اور قاری میں اپنائیت کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ میری دانست میں یہ اردو ڈائجسٹ کے قارئین کا کنبہ (Reader's Club) بجا طور پر ہے۔ اسی سے متاثر ہو کر چند گزارشات پیش کر رہی ہوں۔

(۱) پاکستان ۱۰۰ میں سے منتخب کردہ کمپنیوں کے سربراہان کے انٹرویو اس لحاظ سے بہت اچھے اور Inspirational لگے کہ آپ نے پاکستان کے کامیاب اور قابل جوہر کو متعارف کرایا، جن کی اکثریت متوسط طبقے سے اپنی صلاحیت کے بل پر ترقی کر کے Top 100 میں شامل ہوتی ہے۔ اس مرتبہ آپ نے نبی ﷺ سے منسوب معاش کے ۹ رحصے تجارت اور ایک ملازمت میں رکھے جانے کی روایت بھی رسالے کی زینت بنائی ہے۔ اس

کے باوجود تمام قوم تجارت پیشہ ہو سکتی ہے نہ ہی تجارتی اقدار رکھتی ہے۔ میں خود تعلیم و تحقیق کے میدان سے متعلق ہوں اور میرے جیسے بہت سے قارئین اور بھی ہیں۔ بہت دل چاہتا ہے کہ سال میں ۲ یا ۳ مرتبہ ہی سہی کسی اور شعبۂ زندگی سے وابستہ سرکردہ افراد سے ملاقات بھی شائع کی جائے مثلاً کسی فرض شناس استاد (کمرشل نہیں)، بے لوث سماجی کارکن، محقق صحافی، دیانتدار ملازم/ سربراہ ادارہ، تعلیمی و تحقیقی ادارے (بزنس کرنے والے بلکہ پالیسی ساز جنھیں Think Tanks کہا جاتا ہے)، سائنسدان، خدمتِ خلق کرنے والے ادارے کے سربراہ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ بہت سی غیر سرکاری رفاہی تنظیمیں بھی آپ کی توجہ اور قارئین کی دلچسپی کا باعث بن سکتی ہیں۔

اسی طرح بدنظمی اور بدعنوانی کے اس دور میں اگر کوئی سرکاری ادارہ یا افراد حقیقی معنوں میں اپنا کام کر رہے ہیں تو ان کی مثال بھی امید افزا ہو سکتی ہے مثلاً Rescue 1122 اور HEC کی اپنے میدان میں خدمات۔

(۲) جولائی کے شمارے میں آپ نے ڈیفنس ولاز راولپنڈی میں عریاں مجسموں کے بارے میں مسٹر فاروق صاحب کا خط شائع کیا ہے۔ گویا میرے دل کی بات کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بحریہ ٹاؤن میں رہائش کا عالمی معیار متعارف کرایا اور برقرار رکھا گیا ہے۔ وہاں سکونت اختیار کر کے انسان بھول جاتا ہے کہ پاکستانی عوام بنیادی ضرورتوں کے کس بحران میں مبتلا ہیں لیکن یہاں کثرت سے مجسموں کا نصب کرنا بہت کھٹکتا ہے۔ فحش مجسمے اپنی جگہ قبیح ہیں اور بذاتِ خود مجسمے اور بت اللہ کی رحمت کو دور کرنے کا باعث ہیں۔

رہائشی سکیموں میں اس بت سازی کا سرخیل ڈی ایچ اے کو کہا جا سکتا ہے جو خصوصاً گھوڑے اور گھڑسوار کا مجسمہ اپنی داخلی شارع یا اہم چوراہوں پر نصب کرتے ہیں۔ مگر بحریہ ٹاؤن (خصوصاً راولپنڈی فیز ۸ اور ۹ میں) ان کی اکثریت کی میں خود شاہد ہوں۔ شاید فنِ لطیفہ کی خدمت یا ٹاؤن کو Cosmopolitan ظاہر کرنے کے لیے کم وبیش ہر پارک، دفتر، اہم شارع، چوراہے، گول چکر وغیرہ پر ہندی، یونانی، مصری، رومی غرض بت پرست (عذاب یافتہ!!) اقوام کے دیو مالائی کردار، دیوی، دیوتا ایستادہ ہیں۔ جانوروں کے بت اس کے علاوہ ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ کبھی اس موضوع کو بھی کسی فیچر کا حصہ بنائیے۔ شاید آپ کی دستک کسی دروں کو وا کر دے۔

(ستمیر صبیح۔ راولپنڈی)

نوک پلک سنوار دیجیے

میں نے ستمبر کے حوالے سے اپنی ایک تحریر ارسال کی ہے۔ پلیز اسی ستمبر میں شائع کر دیجیے گا۔ اگلے ستمبر کے لیے نہ اٹھا رکھیے گا۔ ادارے کی طرف سے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ لکھیں۔ نوک پلک ہم سنوار لیں گے تو لیجیے یہ تحریر حاضر ہے۔ (زرنگار)

(یہ تحریر ملی تب ہے جب باقی شمارہ چھپ چکا تھا اور یہ آخری کاپی تیار ہو رہی تھی۔ آئندہ ذرا پہلے لکھ لیا کریں۔ اب تو اگلے ستمبر پر بات جا پڑی)

صحافت کے بازیگروں کی خبر

رسالہ اتنی جلدی میری میز پر ہوگا اس کی توقع نہیں تھی۔ یقین جانیے ۲۰ اگست کو ڈائجسٹ کو اپنی میز پر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ ماضی کے بینکوں کی صورت احوال کے بارے میں اعجاز شیخ نے جو خوبصورت نقشہ کھینچا ہے وہ واقعی ایک بہترین موازنہ ہے۔ موجودہ بینکوں کی حسین و جمیل عمارتوں کو دیکھ کر اب یہ احساس ہوتا ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈرز کی رقوم وہاں کس بری طرح برباد کی جا رہی ہیں۔ منافع کی شرح حیرت انگیز طور پر کم سے کم کی جا رہی ہے جبکہ بینکوں کی عیاشیاں عروج پر پہنچا دی گئی ہیں۔ ایسا ہی ایک اور عمدہ مضمون آج کل کی کاروباری صحافت اور ٹی وی چینلز پر جناب عبدالسلام عارف کا بھی ہے، ان بازیگروں کی بھی انھوں نے خوب خبر لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی صحافت پروفیشنل صحافیوں کے بجائے مسخروں کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ (رضی الدین سید۔ کراچی)

مستقل کالم

بے نیازی اور بے خبری میں لُٹنے کا درد

بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اور میرے پورے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

بات کہنے والی وسطی پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے کی معصوم صورت چھوٹی موٹی سی لڑکی تھی جو اعلیٰ تعلیم کے لیے پنجاب کی بہترین یونیورسٹی میں پڑھنے آئی تھی۔ اس کے والد، بھائی، ۲ر بہنیں اور والدہ ہی نہیں، کتنے ہی قریبی عزیز تھے جو اس کے لاہور آنے، ہاسٹل میں رہنے اور پوری توجہ سے پڑھنے، باقاعدگی سے گھر فون پر رابطہ رکھنے اور اپنی تعلیمی کارکردگی بتاتے رہنے سے خوش تھے۔ سوشیالوجی میں ماسٹر کرنا کوئی عام سی بات تھوڑی تھی۔ یونیورسٹی آ کر وہ سوشل بھی ہوگئی تھی جبھی تو وہ ایک دو بار اپنے دوستوں اور کلاس فیلوز کے مختصر گروپ کو لے کر گاؤں بھی گئی جہاں ان سب کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا گیا۔ خدمت خاطر میں کوئی کسر اس لیے نہ اٹھا رکھی گئی کہ وہ نزہت کے کلاس فیلوز تھے۔

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

جن دنوں ہم ضلع بہاولنگر میں واقع ۹/۱۳۲ آر کے ہائی سکول میں پڑھتے تھے تو ہماری بڑی بہن قریب کے گرلز سکول میں پڑھنے جاتی تھی۔ بے جی کو اس کے آنے جانے کی فکر سے زیادہ اس کی نئی بننے والی سہیلیوں کا دھیان ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار انھوں نے باجی سے کہا ''بیٹی تو ہمارا ہیرا ہے، قیمتی ہے پر شیشے کی طرح نازک، اللہ نے مجھے تیری ماں ہی نہیں، محافظ بھی بنایا ہے۔ تیری تربیت میرے ذمہ لگائی ہے۔ میری تو بخشش بھی تیری تربیت اور میاں کی خدمت میں رکھ دی ہے۔ بس تُو اتنی مہربانی کرنا کہ جس لڑکی کو سہیلی بنانا ہو اس سے مجھے ملوا ضرور دینا۔ تیری ماں ہوں، تیرا بھلا ہی سوچوں گی، تجھ سے بڑی ہوں تجھ سے بہتر سوچوں گی۔ اللہ خیر کرے تیری پوری زندگی پڑی ہے۔ بڑی ہو کر، اپنے گھر جا کر اپنے فیصلے خود کرنا، ابھی نہیں، ابھی ان فیصلوں کا تمھیں پورا اختیار دینا تمھارے لیے مفید نہیں ہوگا۔'' بنگلہ یتیم والا میں نہر کے پار اوورسیر محکمۂ انہار کے گھر جا کر جب تک ان کی بیوی بچوں سے مل نہیں لیا بہن کو ان کی بیٹی سے دوستی کا گرین سگنل نہیں دیا۔ تھوڑے بڑے ہوئے تو بھی انھوں نے کسی کی بیاہ شادی پر بھی بہن کو اکیلے یا کسی کے ساتھ نہیں بھیجا۔ مرغی کی طرح دل و جان سے عزیز اور سنبھال کر یوں رکھا کہ ہر لمحہ ان کی نظریں محافظ رہتیں۔

ابو جی ہیڈ ماسٹر منتخب ہو کر چشتیاں تعینات ہوئے تو ہم چھوٹے تھے۔ اللہ جانے سکول میں کہاں سے میرے ہاتھ ایک رسالہ آ گیا۔ جس میں کافی نامناسب تصویریں تھیں۔ سوچا تھا گھر جا کر سکون سے دیکھوں گا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی بے جی نے کروشیے سے بنا ہوا رنگین بستہ لے لیا، اسماعیل ہمارا ملازم تھا جو سائیکل پر بٹھا کر سکول سے لاتا تھا، اس کو الگ سے ڈانٹ پڑی۔ کھانا کھلانے سے پہلے پہلے وہ کتابوں اور اس رسالے کا ایکسرے کر چکی تھیں۔ اس میں آدھے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

صفحات پھاڑ کر چھت پر بنی روٹیاں پکانے والی ''توی'' کے نیچے جلتی آگ کی نذر کرتے ہوئے انھوں نے صرف اتنا کہا ''ہر گندی مندی چیز نہ دیکھنے کی ہوتی ہے نہ پڑھنے سننے کی۔ بیٹے اس سے آنکھیں اور دل، دونوں خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی چیز دے تو میرا بچہ! انکار کرنا سیکھتے ہیں۔ بُری لگے تو ماں کو آ کر بتاتے ہیں، ماں حفاظت کے لیے پہرے پر جو بیٹھی ہوتی ہے تاکہ چیل کوؤں سے اپنے بچوں کو بچا سکے۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے اس واقعے کے بعد بے جی نے ہمارے ساتھ ساتھ پڑھنا اور لکھنا سیکھا اور لائبریری سے آنے والی ہر کتاب اور گھر آنے والا ہر اخبار رسالہ پہلے ان کی نظر سے گزرتا۔ میرے کچھ کلاس فیلوز اپنے گھر والوں اور کچھ محلے میں اپنی دوستیوں کی وجہ سے دوستی کے درجے پر فائز ہونے کی اجازت نہ پا سکے اور چند برسوں کے اندر ہی جب ان کی بدنامی کے قصے نکلنے لگے تو میں بھاگ کر بے جی کے گلے جا لگا تھا۔ وہ ایک خوبصورت، سخت گیر اور شیر کی آنکھ رکھنے والی ماں تھیں، جنھیں اپنے بچے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھے۔

نزہت اپنی بات مکمل کر چکی، تو میں نے سوچا کاش اس کی ماں بھی میری ماں جیسی ہوتی۔ اب مشورے کے لیے اس کی منتظر نگاہیں مجھ پر لگی تھیں۔ پچھلے ۱۰ر برسوں سے پرسنل اور فیملی کاؤنسلنگ کو پروفیشن سے زیادہ نیکی سمجھ کر کرنے کے باعث ایسی ایسی باتوں، واقعات، افراد تک رسائی میسر آئی ہے کہ کوئی دوسرا تصور نہیں کر سکتا مگر اکثر جب دکھی کر دینے والے واقعات اور حادثات سامنے آتے ہیں تو اندر تک لرز جاتا ہوں۔

یہ ٹی وی سکرین نہیں تھی جہاں چند روز ہوئے ایک ماڈل لینا کپور، پوری طرح سج دھج کر دائیں بائیں دو تصویریں سجا کر بیٹھی (جس میں وہ اپنے پاکستانی محبوب اسد رؤف...... کرکٹ امپائر کو کہیں چوم رہی تھی۔ کہیں گال سے گال ملا رہی تھی اور کہیں پوری مضبوطی سے اسے کمر سے تھامے ہوئے تھی) وہ تفصیلات بتا رہی ہو جو شاید تنہائی میں بتاتے ہوئے بھی کوئی عزت دار گھبرائے۔ ''میرے ان سے ۶ر ماہ سے تعلقات تھے۔ میں ان سے ملنے چنائے بھی گئی۔ دہلی میں بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہمارا مانسک اور شریرک سمبندھ تھا۔ اب مجھے استعمال کر کے کہتے ہیں ''ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔'' معاملات کا ایسا نامطلوب اور شرمناک انکشاف اب روزمرہ زندگی کا حصہ سمجھ کر آسانی سے بھلا دیتے اور ساتھ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس سے قوم، ملک اور لوگوں پر کوئی منفی اثر بھی نہیں پڑتا۔

''تمھیں کسی نے نہیں روکا؟'' میں نے دہلا دینے والی کہانی سن کر نزہت سے پوچھا۔

''روکنا کس نے تھا! پھر میں نے کون سا غلط کام کیا تھا۔ کلاس فیلو سے محبت ہو جاتی ہے۔ میرے پورے گروپ کو پتا تھا۔ ہم ۳ر لڑکیاں اور ۳ر لڑکے۔ ہمارا ۶ رکنی گروپ پورے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھا۔ یونیورسٹی آئی تو بالکل نئی دنیا تھی۔ میں تو گھبرائی ہرنی کی طرح پھرتی تھی۔ نہ ٹھیک سے اوڑھنا آتا تھا نہ ڈھنگ سے بولنا۔ مجھے متین نہ ملتا تو میں پینڈو کی پینڈو ہی رہ جاتی۔ اس نے میری ذات کو اس قدر توجہ دی، میری شخصیت کو اتنا اعتماد دیا کہ میں تو اس کے بنا یونیورسٹی جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی وہ کلاس میں نہیں آتا تھا تو راستے سے پلٹ آتی تھی، کوئی وجود کا اتنا لازم حصہ ایسے ہی تو نہیں بنتا۔''

''کبھی خیال نہیں آیا کہ یہ کسی نشے کی طرح۔ سارا Planned ہے یا غلط ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے لمحے بھر کو سوچا۔ ''ایک بار شاہینہ سے پوچھا تھا ''مجھے متین کی عادت سی کیوں ہو گئی ہے؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا ''پھر کیا ہوا وہ تو مجھے بھی ہے اور میں نے اس کا حل بھی نکال لیا ہے۔''

نزہت کو وہ حل پسند آ گیا اور اگلے ہی ہفتے پیکو روڈ پر درمیانے سے درجے کے ایک ہوٹل میں یہ گروپ کھانے کے لیے جمع ہوا اور کھانے سے پہلے شاہینہ نے ایک راز کی طرح سب پر یہ منکشف کیا کہ چونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ سماج ابھی اس رشتے کو سمجھنے اور ماننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس لیے ہم نے فیصلہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کیا ہے کہ یہ کھانا اصل میں تقریبِ نکاح کا کھانا ہے۔ شاہینہ کے پارٹنر مسعود گل نے سر جھکا کر دھیمے سروں میں دونوں کو میاں بیوی ڈکلیئر کر دیا، کھانا کھایا۔ نزہت نے بل دیا اور چند لمحے پہلے بنے اپنے شوہر کے ساتھ اس کے ایک دوست کے فلیٹ پر رات گزارنے کے لیے ہنسی خوشی روانہ ہو گئی۔ اسے یونیورسٹی بک شاپ پر پڑی کتاب ''جھوٹے روپ کے درشن'' بڑی پسند تھی مگر وہ اپنی کہانی کا انجام اس سے بہتر چاہتی تھی، اس لیے اپنی طرف سے بہت عمدہ اور محفوظ قدم اٹھا چکی تھی۔

۲ر سال..... جی ہاں ۲ر مکمل سال وہ اس رشتے کو اوڑھے رہے۔ میں نے پوچھا:

''کوئی بے بی!'' جواب ملا، ''ہم محتاط تھے کہ ڈگری مکمل کرنے سے پہلے نہیں، پھر متین نے وعدہ لیا تھا کہ ہم اس رشتے کا ابھی اعلان کریں گے نہ اظہار۔ لوگوں سے ہماری خوشی دیکھی نہیں جائے گی۔ یہ ''بورژوا کلاس'' مَین اور مترتا کے رشتوں کی قدر نہیں کر سکتی، ہم ہی اس رشتے کے قدر دان رہیں گے اور محافظ بھی.....'' میں اس کے گھر بھی جانا چاہتی تھی۔ بڑی حسرت تھی کہ وہ اپنی بہنوں سے ملوائے، ماں اور باپ سے تعارف کرائے مگر ۲ر سال میں مجھے یہی خبر نہیں ہو سکی کہ اصل میں وہ رہتا کہاں ہے۔ جب اس نے آنا ہوتا تھا، اچانک چہکتا ہوا آ جاتا اور ہم فلیٹ پر چلے جاتے تھے۔ میرے سارے سوال ہاسٹل میں ہی رہ جاتے۔

''ہاسٹل میں کبھی کسی نے نہیں پوچھا کہاں جاتی ہو؟ کسی وارڈن نے روکا ہوتا، کسی دوست نے سمجھایا ہوتا!'' میں نے اپنی حیرت کو سوال بنایا تھا۔

''جی نہیں ۲ر سال تو کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ تو متین اس قدر پوزیسیو (Possesive) نہ ہوتا، اب آ کر مجھ سے لڑائی جھگڑا نہ کرتا تو مجھے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔'' وہ اب بھی یکسو تھی۔ ''وہ کسی سے بات ہی نہیں کرنے دیتا۔''

''لڑکیاں ماں کی انگلی کی پوروں میں ہوتی ہیں۔ میری بے جی کہا کرتی تھیں'' ان کی چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے یا بولنے میں ذرا سا فرق آئے تو ماں کے دل پر لگے انٹینے پر فوراً سگنل آ جاتا ہے۔ نزہت کے گھر کوئی سگنل نہیں، ایک رشتہ آیا تھا اور نزہت اس رشتے سے پہلے پرانے بوجھ سے آزاد ہونے کی خواہاں تھی۔ وہ پوچھنے آئی تھی ''ہم کئی ماہ سے الگ رہ رہے ہیں۔ ایک قسم کی علیحدگی تو ہو گئی ہے۔ مزاج کا بھی بہت فرق ہے۔ اب ہم اکٹھے نہیں رہ سکیں گے۔'' اس کا ایک ایک جملہ مکمل، سوچا ہوا اور پورا مفہوم لیے ہوئے تھا۔ ''مجھے متین سے طلاق چاہیے'' لیکن ایک مسئلہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ''۲ر سال کی جو زندگی میں نے گزاری ہے، میری جسمانی بناوٹ سے کیا میرے نئے شوہر کو شک تو نہیں ہو جائے گا۔ وہ لمحہ بھر کو جھجکی، شاید گاؤں کی دوشیزگی کا کوئی پل اندر زندہ تھا جو جسمانی استعمال کا لفظ نہیں بول سکی۔

خدا بُرے وقت سے بچائے اور اولاد کا دکھ تو کسی ماں باپ کو نہ دکھائے۔ اس کی کہانی مکمل ہو گئی تھی مگر میرے سوال جگہ جگہ بکھرے اس کا منہ دیکھ رہے تھے، ان میں سے ایک نے سر اٹھایا۔

''تمھاری والدہ کو پتا چل جائے کہ تم ۲ر سال کسی لڑکے کے ساتھ رہتی رہی ہو تو اسے کیسا لگے گا۔ وہ تو سماج نہیں ہے۔ اسے تو پتا ہی ہونا چاہیے تھا تاکہ اس رشتے کو نام بھی مل جاتا اور عمر بھر چلتا۔''

اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور خاموشی سے سر جھکا دیا ''سر! بڑی دور سے آئی ہوں۔ میرے دونوں مسئلے حل کر دیں۔ میں بار بار اب لاہور نہیں آ سکتی۔ میرا تو سارا گروپ ہی بکھر گیا ہے۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اب اس سارے گروپ کی کہانیاں ایسے ہی ادھوری رہ گئی تھیں، اور اس ادھورے پن میں رسوائی اور بے عزتی کا خوف پورے پھن کے ساتھ کنڈلی مارے آ بیٹھا تھا۔ نامعلوم یہ اتنی تاخیر سے کیوں آیا تھا۔

''یہ رشتہ کیسے ختم ہوگا؟'' اس نے پھر دستِ سوال بڑھایا تھا۔ ''جیسے بنا تھا ویسے ہی ختم ہو چکا ہے۔'' میرا جواب واضح تھا۔ ''جو رشتہ کبھی تھا ہی نہیں، اس کا ختم ہونے کا کیا سوال؟ جس کو تم نکاح کہتی ہو کیا وہ لکھا گیا تھا۔ دستخط ہوئے،

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کہیں اندراج ہوا، تمھارا کوئی حق مہر مقرر ہوا، تمھیں کوئی تحائف ملے، کوئی بَری ملی، کبھی کسی سے اس رشتے کا تعارف کرایا۔ کلاس میں، شعبے میں، دوستوں کے بڑے حلقے میں، گھر میں۔ جس بات کو راز کہہ کر چھپایا گیا، وہ راز نہیں ایک دھوکا اور گناہ تھا اور گناہوں کو اسی طرح چھپایا جاتا ہے۔''

''متین چاہتا ہے کہ میں شادی سے انکار کردوں اور ہمارا تعلق ایسے ہی چلتا رہے۔ کبھی کبھی دھمکیاں بھی دیتا ہے کہ میں نے کسی کو بتایا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے میرے ماں باپ بڑے عزت دار لوگ ہیں۔ ایسے بات سیکنڈلائز ہوکر اچھلے گی تو ان کو کتنا بُرا لگے گا۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا گاؤں میں تیرے ماں باپ کی بھی تھوڑی بہت تو عزت رہی ہوگی۔ جو تو نے اپنے تئیں تو خاک میں ملا ڈالی ہے۔

لینا کپور اور اسد روف کے افیئر کے مسائل اور وجہ بے شک کوئی اور رہی ہوگی۔ کہیں شہرت، کہیں پیسا اور کہیں آگے بڑھنے کی سیڑھی بنتا کوئی شارٹ کٹ آج کی دنیا میں خاندانی وقار، ویلیوز اور اخلاق بیچارے موم کی ناک بنے سر جھکائے بیٹھے رہ جاتے ہیں۔

کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے میں نے ٹھنڈا سانس لیا ہے۔ میں بھی ان انسانوں میں سے ہوں جو اپنی بیٹیوں سے بہت محبت کرتے، اُن کا بھلا سوچتے، ان پر اعتبار اور اعتماد کرتے ہیں مگر جب نزہت کہے کہ ہاسٹل میں تو اکثر لڑکیوں کے فرینڈز اور افیئرز ہوتے ہیں تو سوچ کر کانپ جاتا ہوں۔ میں کل کیوں اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی ادارے میں بھیجنے لگا۔ انھوں نے پڑھنا ہوا تو اپنے گھر جا کر شوق سے پڑھ لیں۔ کسی لڑکیوں کے ادارے میں، کسی محفوظ درس گاہ میں جہاں ان کی عزت و آبرو محفوظ رہے۔ نزہت کہتی ہے ''وہاں دو دو سال گھر سے کوئی پوچھنے نہیں آتا کہ ان کی لاڈو کہاں، کن حالوں میں رہتی ہے۔ ان کے گھروں میں آنے اور رہنے والے دوست کون ہیں۔ کن خاندانوں اور کن عادتوں کے مالک ہیں'' اگلے ہی لمحے ایک اور خیال دامن گیر ہوا ہے کہ یوں ہوٹلوں میں سر جھکا کر نکاح کے نام پر گناہ کے لیے دو زندگیوں کو باہم باندھنے اور جوڑنے والے اور ایسی نامطلوب زندگی گزارنے کا باعث بننے اور راستہ دکھانے والے بھی تو کسی ماں ہی کے بیٹے ہوں گے۔ کسی بہن کے بھائی ہوں گے۔ کیا ان کے خاندانوں کی عورتیں لوہے کے جنگلوں میں محفوظ ہیں جو وہ یوں دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے اور لوٹنے کے ایسے محفوظ راستے بناتے ہیں۔

کاش بے خبری، کم علمی ہوتی، کم وسیلہ ہوتی، یوں کم نظری نہ ہوتی کہ اپنی اولاد اور ان کی عزت کا جو ہر دو دو سال تک لٹتا رہے اور گھر میں کسی کو نظر بھی نہ آئے۔ بے نیازی اور بے خبری دونوں میں لٹنے کا درد اور دکھ ایک جیسا ہوتا ہے جو اکثر برداشت نہیں ہوتا۔ برسوں پہلے جب پہلی بار نیٹ کیفوں میں لڑکیوں کی خفیہ تصویریں بنیں اور پورے ملک میں بکی تھیں تو کتنے ہی اعلیٰ مرتبت اور دولت مندوں کو رسوائی سمیٹ کر اپنے ہاتھوں اپنے سروں میں گولیاں اُتار کر تہ خاک جانا پڑا تھا۔ جرم اور گناہ کی کیفیت اور لذت نہیں بدلتی، صرف بدلتے عہد میں طریق بدل جاتا ہے۔ کاش یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری کیس ہوتا، مگر کیا کروں مجھے تو آئے دن ایسی ہی اذیت سے گزرنا ہوتا ہے۔

نزہت جیسی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم اور ڈگریوں کے لیے یونیورسٹیوں، کالجوں میں بھجواتے ہوئے بستر، کپڑے اور خرچ کے پیسے دیتے ہوئے جن والدین کے پاس کھل کر انھیں جسمانی حدود، اقدار اور عزت و عصمت کی حفاظت کا احساس دلانے اور وعدہ لینے کا وقت اور محبت سے کہنے کو وہ چند جملے نہیں ہوتے جو آنے والے ۴،۲ سال اُن سے اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت خوش دلی سے کرائیں، اپنے حصار میں رکھیں۔ وہاں والدین سے نزہت جیسی چھوٹی موٹی سی لڑکیوں کے ہاتھوں سرزد ہوئے گناہ کا بوجھ اور نقصان مل کر بھی اٹھایا نہیں جاتا۔ یہ والدین کی بے خبری میں ہو یا اولاد کی بے نیازی سے، درد اور دکھ برسوں ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اکثر تو سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔ پھر کانٹوں کی طرح چبھے جاتا ہے، چبھے جاتا ہے۔ ■

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اسلامک کوئز

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

۲۰۰۰ روپے کی کتب کے انعامات

بوجھیں تو جانیں

مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) مبشر احمد (دوالمیال، چکوال)

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ برس سے ۲۸ برس سال کے درمیان ہی ہے)

ماہِ اگست میں چھپنے والے اسلامی کوئز کے درست جوابات

کوئز نمبر ۱: (الف) وادی ذی سلب، (ب) مسجد جمعہ

کوئز نمبر ۲: (الف) مسجد سبق، (ب) شاہ فیصل

درست جوابات دینے والوں کے نام

عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، ثمرہ سلیم (کراچی)، طٰہٰ یٰسین (حیدرآباد)، مرزا فرحان بیگ (حیدرآباد)
حمید شکیل مرشد قادری (ملتان)، حسنہ شکیل (ملتان)، حافظ عبدالغنی (ملتان)، محمد یونس جاوید (قصور)
محمد شکیل عباس (ہمکوال)، امجد جاوید (راولپنڈی)، مدثرہ خلیل (دینہ)، محمد عمر (شیخوپورہ)، رزاق احمد (شیخوپورہ)
زاہد اعوان (شیخوپورہ)، رضوان احمد (حافظ آباد)، ہمایوں شریف (لاہور)، محمد اشفاق (چھندراں)
ندیم صابر (لاہور)، شایان اسلام (لاہور)، فضل رحیم اعوان (پشاور)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

۱۔ عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)، ۲۔ ثمرہ سلیم (کراچی)، ۳۔ مدثرہ خلیل (دینہ)، ۴۔ فضل رحیم اعوان (پشاور)

اسلامی کوئز ۱

رحمتوں کا مرکز، محبتوں کا محور، تجلیات کا معدن، مسجد نبویؐ جس کی بنیاد سیدالانبیاء ﷺ نے اپنے دست مبارک سے رکھی اس کی تعمیر میں آپ صحابہ کے ساتھ بہ نفسِ نفیس شریک رہے۔ اس میں موجود منبر رسولؐ اور درمیانی حصہ میں ایک نماز ادا کرنے کا اجر دوسری مساجد (بجز ایک مسجد) کی ۵۰ ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ گنبدِ خضرا تلے آپ کا روضۂ مبارک ہے۔

(الف) منبر رسولؐ اور حجرہ کے درمیانی حصے کا کیا نام ہے؟

(ب) اس مقام کے علاوہ دوسرا کون سا مقام ہے جہاں ایک نماز کا اجر ۵۰ ہزار نمازوں کے برابر ہے؟

اسلامی کوئز ۲

اس غزوہ کو دیگر غزوات میں جو امتیاز حاصل ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے انعامات اور احسانات ایک سورہ میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

(الف) اس غزوہ کا نام کیا ہے؟

(ب) قرآن حکیم کی کون سی سورہ میں ان انعامات اور احسانات کا ذکر ہوا ہے؟

انعامات کے لیے تعاون
خوبصورت اور معیاری کتب
منشورات
ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ تاریخ تک مل جانے چاہئیں

مدیر اُردو ڈائجسٹ
325۔ جی III، جوہر ٹاؤن لاہور

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
خوشبو کی دُنیا کے 5 شگفتہ احساس
Pleasure
Cherish
Joy
Season
Passion
میڈورا پرفیومڈ ٹالک کی تازگی جگاتی خوشبوؤں سے ملے آپ کو
مہکتا، فریش احساس جو رہے دن بھر آپ کے ساتھ۔
MEDORA OF LONDON

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk